دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
اپریل 2015
سالگرہ نمبر
اسلم راہی کی تاریخی کہانی
ظہیرالدین بابر
دو سلسلے وار تحریریں
لاوارث - چمگادڑ
معاشرتی ناول
زندہ تصور
www.pakistanipoint.com

بانی: محمود ریاض
مُدیرِ اعلیٰ: عامر محمود
مُنتظم: محمد شفیع

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

MEMBER APNS	ممبر آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
CPNE	کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

وقت کا انتقام
162
ظاہر شاہ
اس عورت کی کہانی جس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا
لیکن [illegible] سال بعد مقتول شوہر انتقام لینے واپس آ گیا

انوکھی ایجاد
172
زبیر احمد
ایک نوایجاد ٹائم مشین نے اسے بہت بڑے نقصان
سے بچالیا۔ مگر جب اس پر کامیابی کا عقدہ کھلا تو

داستان حوصلے کی
183
عنبرین ناز
وہ بھی دشت حالات میں ملے آسماں تلے آ گئی تھی اور اس نے
آندھیوں میں بھی سفر کر کے دکھادیا کہ ہمت مرداں تو مدد خدا۔

راز
195
انیس الرحمٰن
اس شمارے کی ایک دل چسپ جاسوسی کہانی

شاطر صحافی
214
شاہین اقبال
اس صحافی کا قصہ جسے ایک لاش سے قاتل تک بڑا ہی
[illegible]

زندہ تصور
230
سیدہ عطیہ زاہرہ
ایک حسین شخص کی کہانی جو خوب صورت بھی تھا۔۔۔ ذہین بھی تھا اور دھوکے باز بھی۔
اس کا منصوبہ انتہائی چالاکی سے بنایا گیا تھا لیکن ایک چھوٹی سی غلطی اسے لے ڈوبی

کرنیں

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی

ظہیرالدین بابر
8 ایم اے راحت
مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

گیت مرگ
36 ایم الیاس
ایسی متاثر کن کہانی جو آپ کے دل ودماغ پر نقش ہو جائے گی

چمگادڑ
98 ایم اے راحت
زندگی کے نشیب وفراز اور عروج وزوال کی ایک انوکھی داستان جو لمحہ بہ لمحہ آپ کو تجسس کے سحر میں جکڑلے گی

لاوارث
122 غزالہ نبیل راؤ
ایک ایسے نوجوان کا قصہ، جس کے باپ کا پتا نہیں تھا.... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا

موتیوں کی لڑی
146 بیلا مریم
ایک حسینہ دلنواز کا قصہ جس کی زندگی دولت سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوئی

ڈیڑھ ہوشیار
150 عبدالکریم ساگر
جاسوسی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ کہانی

سراغ رساں
157 محمد علی
اُس کو اپنی ذہانت پر ناز تھا کہ اُس نے اپنی ذہانت سے غربت کی زندگی کا خاتمہ کر کے دولت کا انبار لگایا ہے لیکن اس کی اسی "ذہانت" نے اسے پریشانی اور مصائب کا شکار کر دیا

سالگرہ نمبر

وقت کا انتقام
162
ظاہر شاہ
اس عورت کی کہانی جس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا
لیکن سات سال بعد مقتول شوہر انتقام لینے واپس آ گیا

انوکھی ایجاد
172
زبیر احمد
ایک نو ایجاد ٹائم مشین نے اسے بہت بڑے نقصان
سے بچالیا۔ مگر جب اس پر کامیابی کا عقدہ کھلا تو

داستان حوصلے کی
183
عنبرین ناز
وہ بھی دہشت حالات میں [illegible]
آندھیوں میں بھی سفر کرکے دکھا دیا [illegible]

راز
195
انیس الرحمٰن
اس شمارے کی ایک دل چسپ جاسوسی کہانی

شاطر صحافی
214
شاہین اقبال
اس صحافی کا قصہ جسے ایک لاش سے قاتل تک بڑا ہی
خوف ناک سفر کرنا پڑا [illegible] صحافی تھا لیکن انتہائی شاطر

زندہ تصور
230
سیدہ عطیہ زاہرہ
ایک خلفشص کی کہانی جو خوب صورت بھی تھا۔۔۔ ذہین بھی تھا اور دھوکے باز بھی۔
اس کا منصوبہ انتہائی چالاکی سے بنایا گیا تھا لیکن ایک چھوٹی سی غلطی اسے لے ڈوبی

کرنیں

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار، کراچی

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

ظہیر الدین بابر

دوسری قسط

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں‘ اس کا اہم سبب جہاں اختیارات‘ اقتدار اور دولت رہی ہے‘ وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم‘ ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی سلطنتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگجو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں اپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا‘ وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے......شیطان صفت لوگوں نے کس کس انداز سے مسلمانوں کو کمزور کیا اور اس کے دور رس نتائج کیا برآمد ہوئے......یہ تاریخی حقائق ہیں‘ جنہیں آپ کے لیے زیب داستان کیا ہے معروف قلم کار اسلم راہی نے......

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان

ابراھیم لودھی کے مقربین اور انتہائی نامور سالاروں میں میں ایک میاں بہوہ تھا۔ بہوہ ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی کے امرائے کبار اور صاحب اعتبار لوگوں میں شمار ہوتا تھا اور اٹھائیس سال تک وہ ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی کی سلطنت میں با اختیار وزیر رہ چکا تھا۔ اسے ابراہیم لودھی نے گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا۔

چنانچہ ابراہیم لودھی کے حکم پر اعظم کا کڑ میاں بہوہ کو زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا اور اسے ابراہیم لودھی کے سامنے پیش کیا۔ اس ابراہیم لودھی نے بعض حاسدوں کے کہنے سے میاں بہوہ اور اس جیسے دوسرے امراء اور سالاروں کے لیے ایک ایوان اور اس کے نیچے ایک تہہ خانہ تیار کروایا تھا۔

دو مہینوں کے بعد جب یہ تہہ خانہ تیار ہو کر خشک ہو گیا تو اسے پوشیدہ طور پر بارود کی تھیلیوں سے بھروا دیا گیا مگر پھر میاں بہوہ اور چند امراء کو جن کو ٹھکانے لگانے کے لیے ابراہیم لودھی تدبیر کر رہا تھا قید سے رہا کر دیا اور انہیں نہ جانے کس بنا پر خلعت عطا کر کے ان کی دلجوئی کی انعامات سے خوش کر دیا تا کہ ان کے دل سے خوف دور ہو جائے۔

ایسا کرنے کے بعد ابراہیم لودھی نے پھر ایک دن ان سارے سالاروں کو طلب کیا انہیں مخاطب کر کے ابراہیم لودھی کہنے لگا۔ ایک سالار نام جس کا اسلام خان ہے جسے میرے باپ نے خاک سے اٹھایا اور پروان چڑھایا خوف زدہ ہو کر بغاوت اور منافقت کی راہ اختیار کر چکا ہے۔ اس عمارت میں جسے میں نے ابھی بنوایا ہے تشریف رکھیے اور مشورہ دیجیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ مجھے آپ کی قیمتی رائے کا پورا اعتبار ہے۔ یقین ہے کہ جو کچھ آپ کے دل میں آئے گا اسی میں میری بہتری اور بھلائی ہو گی۔

چنانچہ وہ سارے سالار بغیر کسی بدگمانی کے اس عمارت میں داخل ہوئے اور بات چیت میں مشغول ہو گئے کہ ایک آتشی شعلہ بلند ہوا چنانچہ بڑا سالار جو ابراہیم لودھی کے باپ کے ہاں وزیر کے عہدے تک رہا تھا وہ اور جو لوگ وہاں تھے درختوں کے پتوں کی طرح فضاء میں اڑا کر منتشر ہو گئے۔

دوسری طرف ابراہیم لودھی کا باغی سالار اسلام خان ان دنوں کڑہ کے مقام پر قیام کیے ہوئے تھا بغاوت کرنے کے بعد اس نے بھی لشکر جمع کرنا شروع کر دیا جب اسے اس حادثے کی خبر ہوئی تو وہ بڑا غضب ناک ہوا دوسری طرف ابراہیم لودھی کو جب خبر ہوئی کہ اسلام خان نے تو کافی بڑا لشکر تیار کرنا شروع کر دیا ہے تو اس نے چاہا کہ ایک لشکر روانہ کرے لیکن اچانک بڑے امراء میں سے کچھ دہلی سے فرار ہو کر اسلام خان کے پاس جا پہنچے اس اثر نے ابراہیم لودھی کے خلاف ایک عظیم فتنہ برپا ہو گیا۔

ان حالات میں بھی ابراہیم لودھی نہ سنبھلا اپنے کچھ سالاروں اور امراء کو نامزد کیا تا کہ اسلام خان سے نبٹا جا سکے۔ ابراہیم لودھی کا یہ لشکر جب لکھنو کے نواح میں پہنچا تو ابراہیم لودھی کا ایک اور سالار نام جس کا اقبال خان تھا جو ابراہیم کے رشتہ دار اعظم ہمایوں کے ساتھ کام کرتا رہا تھا اس کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ اچانک ایک طرف سے وہ پانچ ہزار سواروں کے ساتھ نمودار ہوا۔ ابراہیم لودھی کے لشکر پر اس نے حملہ کر دیا ابراہیم لودھی کے سالاروں اور لشکریوں میں سے اکثر کو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور ابراہیم لودھی کا وہ لشکر شکست کھا کر دہلی کی طرف بھاگ گیا۔

ابراہیم لودھی کو جب یہ خبر ہوئی تو اس نے دوسرا لشکر روانہ کیا اور حکم دیا کہ پہلے باغیوں کا خاتمہ کرے اس کے بعد اقبال خان کا سدباب کیا جائے گا۔ دوسری طرف اسلام خان چالیس ہزار سواروں اور پانچ سو جنگی ہاتھیوں کا ایک لشکر تیار کر چکا تھا دونوں لشکر جب ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے قریب پہنچے تو مورخین لکھتے ہیں کہ جس وقت صف آرائی ہونے لگی تو ایک سالار نام جس کا شیخ راجو تھا اس نے

باغیوں کو نصیحت کی کہ وہ ابراہیم لودھی کے خلاف بغاوت ترک کر دیں لیکن اسلام خان اور اس کے ساتھی ابراہیم لودھی کے سالار اور اس کے رشتہ دار اعظم ہمایوں کو پسند کرتے تھے۔ اعظم ہمایوں کی طرف سے بھی ابراہیم لودھی مشکوک ہو چکا تھا اسے ایک طرح سے اس نے نظر بند کر رکھا تھا۔

چنانچہ جب شیخ راجو نے باغیوں کو سمجھایا کہ وہ بغاوت ترک کر دیں تو انہوں نے اس سے کہا کہ اگر ابراہیم لودھی اعظم ہمایوں کو آزاد کر دے تو پہلے کی طرح ہم اس کی اطاعت کرتے رہیں گے۔

ابراہیم لودھی نے یہ بات نہ مانی اور باغیوں کے خلاف بعض دوسرے امراء کو نامزد کر دیا ایک اور لشکر دے کر روانہ کیا تاکہ باغیوں کو اپنے سامنے زیر کیا جائے۔

چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے آئے تو ایسی جنگ ہوئی کہ اس وقت تک مورخین کہتے ہیں کہ زمانے کی آنکھ نے ایسی خوفناک جنگ نہ دیکھی ہوگی۔ دونوں طرف سے تین چار ہزار تجربہ کار سوار میدان میں ڈھیر ہو گئے خون کی ندی بہہ نکلی اچانک ایک ضرب اس جنگی ہاتھی کی آنکھ میں لگی جس پر اسلام خان سوار تھا چنانچہ وہ پلٹا اور اپنے ہی لشکر پر حملہ آور ہو گیا۔ یوں اسلام خان کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ ابراہیم لودھی کے لشکر نے یہ دیکھا تو پوری طاقت اور قوت کے ساتھ دھاوا بول دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام خان اور اس کا نائب سعید خان دونوں گرفتار ہو گئے۔

ان دونوں کے گرفتار ہونے پر ابراہیم لودھی نے خوشی میں ایک طرح سے جشن برپا کر کے رکھ دیا تھا چنانچہ جب اسے ان دونوں کی گرفتاری کا علم ہوا تو مورخین لکھتے ہیں کہ وہ بہت خوش ہوا جن امراء نے بہادری اور دل سوزی سے کام لیا اور ان دونوں کو گرفتار کیا انہیں ابراہیم لودھی نے خوب نوازا اور اپنی خوشنودی کا بھی اظہار کیا۔

اب ابراہیم لودھی کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔

چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ رانا سانگا پر ضرب لگائی جائے اور مارواڑ کے راجہ کو ہیچ کر کے ایک طرح سے پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر دی جائے۔

اس مقصد کے لیے ابراہیم لودھی نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور اس لشکر کا سالار اعلا اس نے میاں ماکھن کو مقرر کیا لیکن اس موقع پر ابراہیم لودھی نے ایک بہت بڑی غلطی کی۔

ابراہیم لودھی کے لشکر میں دو بڑے سالار تھے ایک کا نام میاں حسین تھا دوسرے کا نام میاں معروف خان تھا۔ یہ دونوں سلطان ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی کے لشکر میں بڑے سالار رہ چکے تھے اور ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی نے ان دونوں کو منصب اور توقیر کے لحاظ سے سارے امراء اور سالاروں سے ممتاز کر دیا تھا۔ یہ دونوں شجاع اور جنگ کا بہترین تجربہ رکھتے تھے چنانچہ ناانصافی سے کام لیتے ہوئے ابراہیم لودھی نے رانا سانگا پر حملہ آور ہونے کے لیے جو لشکر تیار کیا اس کا سالار اعلا میاں ماکھن کو بنایا حالانکہ اس سے پہلے میاں ماکھن میاں حسین خان اور معروف خان کے تحت کام کرتا رہا تھا لیکن ابراہیم لودھی جہاں دوسرے بڑے سالاروں سے نفرت کا اظہار کرنے لگا تھا وہاں ابراہیم اب میاں حسین خان اور میاں معروف خان کے درپے بھی ہوا اور چاہتا تھا کہ ان کا بھی خاتمہ کر کے اپنے اردگرد جو خطرات ہیں ان کو ختم کر دے۔

چنانچہ میاں ماکھن لشکر لے کر روانہ ہوا اور لشکر میں اس کے ماتحت میاں حسین خان اور میاں معروف خان تھے جب یہ لشکر رانا سانگا کی سرزمینوں میں داخل ہوا تب پیچھے سے ابراہیم لودھی کا ایک قاصد ابراہیم لودھی کا ایک فرمان لے کر آیا اس فرمان میں ابراہیم لودھی نے میاں ماکھن کو یہ حکم دیا تھا کہ حسین خان اور معروف خان کو جیسے بھی ممکن ہو پکڑ لو اور قید کر کے یہاں بھیج دو۔

اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے میاں ماکھن نے ایک بہانہ کیا دراصل اس وقت لشکر تین

حصوں میں تقسیم تھا ایک حصہ براہ راست میاں ماکھن کی ماتحتی میں دوسرا میاں حسین خان کے پاس اور تیسرا میاں معروف خان کے پاس ماکھن نے یہ کام کیا کہ معروف خان سے ملنے کے لیے گیا اور بہانہ یہ کیا کہ وہ اس کے بیٹے کی تعزیت کے لیے آیا ہے حالانکہ معروف خان کے بیٹے کو فوت ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔

چنانچہ ماکھن میاں معروف کے پاس پہنچا دوسری طرف میاں حسین خان کو خبر ہوئی تو وہ بھی تیزی سے وہاں پہنچ گیا اور کہنے لگا۔

میاں ماکھن اس خیال کو اپنے دل سے نکال دے کہ میاں معروف کو پکڑ کر تو قید میں ڈال دے گا مجھے سارے حالات کی خبر ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں ابراہیم لودھی کے دماغ میں فتور آ گیا ہے اگر تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔

اس دھمکی کے جواب میں میاں ماکھن نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور جو صورت حال تھی قاصد کے ذریعے ابراہیم لودھی کو بھجوا دی۔

چند دن بعد ابراہیم لودھی کی طرف سے میاں ماکھن کے نام پیغام آیا۔

تم ان لوگوں کے حصے کے لشکر میں کیوں جاتے ہو ایک بہت بڑا خیمہ نصب کراؤ اور انہیں خبر دو کہ دہلی سے شاہی فرمان آیا ہے آؤ اور پڑھ لو جب وہ دونوں آ جائیں تو دونوں کو پکڑ کر گرفتار کر لینا اور زنجیروں میں جکڑ کر ہمارے پاس روانہ کر دینا۔

ابراہیم لودھی کے اس حکم کے جواب میں میاں ماکھن نے ایسا ہی کیا اور ایک بہت بڑا خیمہ نصب کرایا اس کے پہلو میں اس جیسا ایک دوسرا خیمہ بھی نصب کرا دیا اور دو سو انتہائی جنگجو اور منتخب لشکریوں کو جو پوری طرح مسلح تھے وہاں گھات میں بٹھا دیا اور انہیں یہ بتا دیا کہ جب حسین خان اور معروف خان دونوں آئیں تو ان پر حملہ کر کے انہیں گرفتار کر لو۔

یہ کارروائی مکمل کرنے کے بعد میاں ماکھن نے حسین خان اور معروف خان دونوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ دہلی سے شاہی فرمان آیا ہے آ کر پڑھ لو۔

پہلے معروف خان میاں ماکھن کے پاس پہنچا دوسری طرف میاں حسین کو سارے معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی لہٰذا وہ تین سو مسلح لشکریوں کو لے کر میاں ماکھن کے پاس پہنچا اور میاں ماکھن نے جس خیمے کے اندر دو سو لشکریوں کو گھات میں بٹھا رکھا تھا حسین خان نے بقول مورخین خیمے کی طنابوں کو کاٹ دیا یہاں تک کہ خیمہ ان لشکریوں پر گر گیا جو وہاں گھات لگائے ہوئے بیٹھے تھے اس کے بعد حسین خان میاں ماکھن کے خیمے میں داخل ہوا کہنے لگا۔

میاں ماکھن اب تو نے ہمیں یہ کہہ کر بلایا ہے کہ تیرے پاس شاہی فرمان آیا ہے اب ہمارے سامنے شاہی فرمان پڑھ۔

میاں ماکھن نے کہا اس طرح فرمان پڑھنے کا حکم نہیں ہے حسین خان نے کہا ہمیں معلوم ہے فرمان اور لشکر کا آنا اس کے لیے ہے کہ ہماری جان لے لی جائے۔

ہم ایسی ذلت اور رسوائی سے جان نہیں دیں گے اس کے بعد حسین خان معروف خان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے باہر لے گیا اس طرح وہ دونوں میاں ماکھن کے پاس سے چلے گئے۔

چنانچہ حسین خان اور معروف خان دونوں اپنے اپنے حصے کے لشکر میں پہنچ گئے وہاں پہنچنے کے بعد حسین خان نے ایک قدم اٹھایا اس نے دیکھا کہ سلطان ابراہیم لودھی کی نیت اس کے خلاف ٹھیک نہیں ہے لہٰذا اس نے یہ سوچا کہ اپنے لشکریوں کے ساتھ وہ رانا سانگا کے پاس چلا جائے چنانچہ اس نے اپنا ایک قاصد رانا سانگا کی طرف بھیجا اور اس کے پاس آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

مورخین کہتے ہیں رانا سانگا پہلے تو اس صورت حال سے بڑا خوف زدہ اور پریشان ہوا کہ آخر حسین خان کیوں اس کے پاس آنا چاہتا ہے کیونکہ حسین

خان کی شجاعت اس کی دلیری اور جنگی تجربہ پورے ہندوستان میں مشہور تھا اس بنا پر رانا سانگا ڈر گیا کہ شاید کسی حیلے بہانے سے آئے اور اس کا قصہ ہی پاک کر کے رکھ دے۔

اس کے بعد جب قول اقرار ہو گئے تو حسین خان اپنے چار ہزار سواروں کے ساتھ رانا سانگا کے پاس چلا گیا۔

رانا سانگا نے اپنے بھتیجے کو استقبال کے لیے بھیجا۔ اس طرح رانا سانگا نے حسین خان کا بہترین انداز میں استقبال کیا اور اپنے پاس ٹھہرالیا۔

دوسری طرف میاں ماکھن کے پاس اس وقت تیس ہزار کا ایک لشکر تھا اور لشکر میں تین سو دیو پیکر ہاتھی تھے چنانچہ حسین خان کے اس طرح چلے جانے کے بعد میاں ماکھن کسی طرح دشمن کی طرف سے خوف محسوس کرنے لگا تھا مگر پھر حوصلہ رکھا پھر دوسرے دن آخر کار میاں ماکھن نے لشکر کو تیاری کا حکم دیا اور رانا کے خلاف جنگ کے لیے میدان میں اترا۔

دوسری جانب رانا نے بھی لشکر کے ہمراہ جنگ کے لیے صف آرائی کی میاں حسین اس کے ساتھ تھا اس موقع پر میاں ماکھن نے ایک اور بہت بڑا قدم اٹھایا اس نے معروف خان کو جو اس وقت اس کے لشکر میں شامل تھا کہا تم مینہ کے سردار ہو تمہارے اور حسین خان کے درمیان تو اتفاق تھا مگر وہ تو نمک حرامی کر کے چلا گیا اور ابراہیم لودھی کے مخالفوں سے جاملا ایسی صورت میں اب تمہارے کیا ارادے ہیں۔

معروف خان نے میاں ماکھن کے اس پیغام کو بڑا محسوس کیا اور میاں ماکھن سے کہا میں اور حسین خان دونوں ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی کے سب سے بڑے سالار مانے جاتے تھے اور تم ہمارے ماتحت تھے سلطان سکندر لودھی کے زمانے ہی میں ہم نے نگر کوٹ کو فتح کیا بہت قدیم بت جس کا وہاں ہندو احترام کرتے تھے اسے نیست و نابود کیا ہم نے اس ناقابل تسخیر قلعے کو فتح کر کے وہاں جو بت تھے انہیں اپنے پاؤں تلے روندا ہی نہیں کیا بلکہ ہم نے وہاں سے سات من سونا نکال کر ابراہیم لودھی کے باپ سکندر لودھی کی خدمت میں پیش کیا۔

سکندر لودھی ہم پر اعتبار کرتا تھا اس کے دور میں ہم سب سے بڑے سالار مانے جاتے تھے لیکن اب جبکہ ابراہیم لودھی کا زمانہ ہے تو اس ابراہیم نے نوخیزوں اور نو دولتیوں کو آگے رکھا ہے اور ہمیں ایک طرح سے اس نے نمک حراموں میں داخل کر دیا ہے اب جو کچھ ہم فقیروں سے بن پڑے گا اس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کریں گے اس گفتگو کے بعد مورخین لکھتے ہیں کہ معروف خان اپنے حصے کے لشکر کو لے کر سلطان ابراہیم کے لشکر اور میاں ماکھن سے علیحدہ ہو گیا تھا۔

میاں ماکھن کے پاس کافی بڑا لشکر تھا لیکن حسین خان اور معروف خان کے الگ ہو جانے کے بعد اسے ایک جھٹکا ضرور لگا تھا دوسری طرف رانا سانگا بڑی تیزی سے پیش قدمی کرتا ہوا میاں ماکھن کے لشکر کے سامنے آ گیا چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے صفیں درست کرنے لگے تھے مورخین کہتے ہیں کہ میاں ماکھن نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ایک حصہ اپنے پاس رکھا دوسرا حصہ ابراہیم لودھی کے نامور سالار سعید خان کو دیا اور چوتھا حصہ ایک تیسرے سالار حاجی خان کی کمانداری میں رکھا گیا تھا۔

حسین خان اگرچہ میاں ماکھن سے ناراض ہو کر رانا سانگا کے پاس چلا گیا تھا لیکن میاں ماکھن کے خلاف اس نے جنگ نہیں کی اور رانا سانگا کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا۔

چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں میاں ماکھن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ رانا سانگا کامیاب رہا اور شکست اٹھا کر میاں ماکھن اپنے لشکر کو لے کر پیچھے ہٹا اور اپنے پڑاؤ کے اندر ایک طرح سے محصور ہو گیا تھا۔

اس شکست کی خبر جب حسین خان کو ہوئی تو

جس روز جنگ ہوئی تھی آنے والی شب ہی کو حسین خان نے میاں ماکھن کو پیغام بھیجا۔

اب تمہیں ہم جیسے مخلص لوگوں کی کمی محسوس ہو گی۔ افسوس صد افسوس کہ تیس ہزار سوار رکھنے کے باوجود تم رانا سانگا کے ہاتھوں شکست کھا گئے اب اس نمک حلال کو جو بندگان خدا کی سرشت میں رکھی گئی ہے اسے بھی دیکھنا۔

پھر معروف خان کو حسین خان نے درپردہ پیغام بھیجا۔

آدھی رات گزر جائے تو اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار رکھنا اور پھر مجھ سے آن ملنا تم نے میاں ماکھن کی سرداری کو دیکھ لیا اب ہم پر واجب ہے کہ سلطان کا حق نمک ادا کریں۔

اس نے یہ بھی پیغام بھیجا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابراہیم لودھی کے ہاں اپنے باپ کے زمانے کے خیر اندیش بندوں کی قدر نہیں لیکن ہم دونوں نے مل کر حق نمک ادا کرنا ہے تاکہ لوگ مجھے اور تمہیں طعنہ نہ دیں کہ تیس سال تک ابراہیم لودھی کے باپ سلطان سکندر کا نمک کھایا اور اس کے بڑے امراء اور بڑے سالاروں میں شمار ہوتا رہا اس کے باوجود اس کے بیٹے ابراہیم لودھی سے نمک حرامی کرتے ہوئے مخالفوں سے جا ملے۔

چنانچہ معروف خان نے حسین خان کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور رات کے وقت اپنے حصے کے لشکر کو لے کر وہ حسین خان سے آن ملا۔

دوسری طرف رانا سانگا کا لشکر میاں ماکھن کو شکست دینے کے بعد عیش، عشرت میں ڈوبا ہوا تھا شراب کے دور چل رہے تھے اسی وقت حسین خان اور معروف خان آندھی اور طوفان کی طرح نمودار ہوئے اور رانا سانگا کے لشکر پر حملہ کر دیا رانا سانگا کے لشکر کے ایک بڑے حصے کو انہوں نے کاٹ کر رکھ دیا جنگ میں بقول مورخین رانا سانگا بھی زخمی ہوا اور اپنی جان بچا کر بھاگ گیا۔

یہ خبر جب میاں ماکھن کو پہنچی کہ حسین خان اور معروف خان دونوں نے مل کر رانا سانگا کو شکست دی ہے تو وہ بہت شرمندہ ہوا اس دوران میاں ماکھن کے لشکر کا خزانچی نام جس کا بایزید تھا وہ حسین خان اور معروف خان کی اس کارگزاری سے ایسا خوش ہوا کہ ان دونوں کی رانا سانگا کو شکست دینے اور فتح مندی کی تفصیل اس نے تیز رفتار قاصدوں کے ذریعے ابراہیم لودھی کو بھجوا دی۔

اس کے ساتھ ہی حسین خان اور معروف خان نے رانا سانگا کے ہاں سے جو مال ملا تھا اس میں سے بہترین پندرہ ہاتھی تین سو چار عمدہ گھوڑے دوسرا بہت سا سامان مال غنیمت کی صورت میں دہلی بھیجا۔

ابراہیم لودھی اس فتح کی خبر سن کر بے حد خوش ہوا اور اپنے عاملوں کو حکم دیا کہ زور و زور سے شادیانے بجائے جائیں اور جشن برپا کیا جائے ساتھ ہی تیز رفتار قاصد تیار کیے اور ان قاصدوں کے ہاتھ حسین خان اور معروف خان کے لیے دو خاص خلعتیں دو خنجر دو نامور مشہور ہاتھی اور چار گھوڑے روانہ کیے۔

لیکن ابراہیم لودھی بڑا کینہ پرور اور بدمزاج تھا کسی پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتا تھا کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنے قریبی رشتہ دار اعظم ہمایوں کو زندان میں ڈال دیا تھا اب ایک دم نجانے اس کے ذہن میں کیا سمائی کہ اعظم ہمایوں کو زندان سے نکالا اور اسے اس کے بیٹوں کے ہمراہ گوالیار کے قلعہ پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک لشکر مہیا کیا گوالیار کا راجہ ابراہیم لودھی کا باج گزار تھا اور کبھی کبھی خراج میں نشہ کرتا تھا چنانچہ ابراہیم لودھی کا حکم پا کر ایک لشکر لے کر اعظم ہمایوں گوالیار کی طرف بڑھا۔

اعظم ہمایوں نے خوب تگ و دو جاں فشانی سے کام لیتے ہوئے گوالیار کے راجہ کا ناک میں دم کر دیا عنقریب قلعہ فتح ہونے والا تھا کہ راجہ نے اطاعت قبول کر لی باقاعدگی سے خراج دینے کا وعدہ کیا ساتھ ہی راجہ نے سات من سونا ایک بڑا نایاب ہاتھی جس کا نام شام سندر تھا اور اپنی بیٹی سلطان کے حرم میں داخلے کے لیے بھیجی چنانچہ یہ ساری چیزیں اعظم

ہمایوں نے سلطان کی طرف روانہ کردیں۔

اس کے چند ہی دن بعد اچانک دہلی سے ایک فرمان آیا اور اس میں لکھا تھا کہ اعظم ہمایوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً دہلی کا رخ کرے۔ ابراہیم لودھی کا یہ حکم پاکر اعظم ہمایوں اس کے حکم کے مطابق دہلی کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس موقع پر اس کے بیٹوں اور عزیزوں نے کہا۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ابراہیم لودھی تمہاری جان لینا چاہتا ہے وہ دوسرے امراء کی طرح تمہیں بھی ہلاک کردے گا۔

اس کے علاوہ اعظم ہمایوں کے کچھ سالاروں اور وہ امراء جو اس کے ساتھ تھے اور اس کے ہمدرد تھے وہ بھی کہنے لگے۔

تیرا دربار میں حاضر ہونا خلاف مصلحت ہے اس لیے کہ ابراہیم لودھی اپنے سالاروں اور امراء میں سے جس کے بھی خلاف ہوتا ہے اسے بخشتا نہیں ہے۔

ان ساری باتوں کے جواب میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے اعظم ہمایوں کہنے لگا۔

چالیس سال سے حکمران خاندان کا نمک کھا رہا ہوں میرا شمار اس خاندان کے خیر خواہوں میں ہوتا ہے اب اس سے منہ پھیر لوں اور نمک حراموں کے زمرے میں شامل ہوجاؤں مجھ سے ایسا نہیں ہوگا۔

اس موقع پر محمد خان لودھی اور داؤد خان جو اعظم ہمایوں کے بڑے سالاروں میں سے تھے اعظم ہمایوں کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگے۔

''ابراہیم لودھی کا دماغ خراب ہوچکا ہے اور وہ نمک حلالی اور نمک حرامی میں فرق نہیں کرتا اس وقت اعظم ہمایوں تمہارے پاس کافی بڑا لشکر ہے لہٰذا ابراہیم لودھی کی بات ماننے سے انکار کردو اس سے پہلے جس بڑے سالار کا اس طرح بلوایا آیا وہ ابراہیم لودھی کے انتقام سے بچ نہیں پایا انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ تم ایک بار اس کا کہا ماننے سے انکار کردو پھر ہم دیکھ لیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔

لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ شاید اعظم ہمایوں کو اجل اور موت پکار رہی تھی اس نے اپنے بیٹوں کے علاوہ اپنے امراء اور عزیزوں کا کہا ماننے سے انکار کر دیا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ ابھی اس نے آدھا ہی راستہ طے کیا تھا کہ اسے خبر ملی کہ بڑے سالاروں میں سے محمود اور حسام خان شاہو خیل کو جو ابراہیم لودھی کے کسی دور میں بڑے ہردل عزیز تھے انہیں ابراہیم لودھی نے مروادیا ہے۔

اعظم ہمایوں کو یہ خبر ملی تو اس کے لشکر میں بڑے سالاروں میں سے احمد خان اور اللہ داد خان تھے انہوں نے پھر اعظم ہمایوں سے کہا۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا یہیں سے بچ کر جون پور میں اپنے بیٹے فتح خان کے پاس چلے جاؤ۔'' ان کی اس گفتگو کے جواب میں اعظم ہمایوں کہنے لگا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو سلطان کے افعال کچھ ایسے ہی ہیں لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوگا کہ بغاوت اور سرکشی کروں۔''

کیونکہ اعظم ہمایوں کی اجل آ پہنچی تھی لہٰذا اس نے ان مخلص اور خیر اندیشوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کوچ در کوچ کرتا دہلی روانہ ہوگیا۔

جب دہلی کے قریب پہنچا تب سلطان کا حکم اسے ملا کہ پہلے اپنے ہاتھی اور گھوڑے سلطان کی خدمت میں بھیج دو اعظم ہمایوں نے ایسا ہی کیا۔

اس کے ایسا کرنے سے اس کے سارے لشکری اس کا ساتھ چھوڑ کر اس سے علیحدہ ہوگئے اور اس کے بیٹے فتح خان سے جا ملے جو اس وقت جون پور کے مقام پر ایک لشکر کے ساتھ قیام کیے ہوئے تھا۔

چنانچہ اعظم ہمایوں شہر کے دو کوس کے فاصلے پر بقول مورخین بھاپور نام کے گاؤں کے پاس پہنچا تو پھر ابراہیم لودھی کی طرف سے قاصد آئے کہ تمام لشکر خزانہ اور جو کچھ اس کے پاس ہے یہ سلطان کے آنے والے قاصدوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اعظم

ہمایوں نے ایسا ہی کیا پھر ابراہیم لودھی کے حکم پر اسے ایک گھٹیا قسم کے گھوڑے پر سوار کر کے دہلی لایا گیا ابراہیم لودھی نے اسے زندان میں ڈال دیا اس طرح ابراہیم لودھی نے اپنے اس نہایت مخلص اور جانثار سالار کو بھی زندان میں ڈالنے کے بعد مروا دیا۔

ابراہیم لودھی کی سلطنت کی خرابی کی پہلی وجہ یہی تھی کہ اس نے اعظم ہمایوں کو قتل کروا دیا۔ جس کا بیٹا فتح خان دس ہزار سواروں کا مالک تھا اور اعظم ہمایوں کے مارے جانے کے بعد صوبہ بہار کا والی دریا خان اور اس کا بیٹا شہباز خان بھی اپنے لشکر کے ساتھ اعظم ہمایوں کے بیٹے فتح خان کے ساتھ مل گئے اس طرح انہوں نے مل کر بقول مورخین لگ بھگ ستر ہزار سواروں پر مشتمل ایک لشکر تیار کر لیا تھا۔

اپنے لشکریوں اور سالاروں کے کہنے پر اعظم ہمایوں کے بیٹے محمد خان نے سلطان کا لقب اختیار کیا اس طرح صوبہ بہار ابراہیم لودھی کے قبضے سے نکل گیا۔ ان ساری کارروائیوں کو دیکھنے کے بعد بھی ابراہیم لودھی کی آنکھیں نہ کھلیں دراصل اسے بھی موت اور اجل آوازیں دے رہی تھی اس موقع پر اس نے ایک اور برا فعل کیا اور وہ یہ کہ اس نے اپنے ایک عزیز اور رشتہ دار دولت خان لودھی جو گزشتہ بیس برس سے پنجاب کا والی مقرر تھا طلب کیا۔

دولت خان کیونکہ ابراہیم لودھی کا رشتہ دار تھا لہٰذا ابراہیم لودھی کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا اور جب ابراہیم لودھی کی طرف سے سختی شروع کی گئی تب لاہور کے حاکم دولت خان نے خود ابراہیم لودھی کے پاس دہلی جانے کے بجائے اپنے بیٹے دلاور خان کو بھیج دیا تاکہ یہ جاننے کے لیے اس کے لیے ابراہیم لودھی کا کیا حکم ہے۔

یہ دلاور خان بقول مورخین جب دہلی پہنچا تو ابراہیم لودھی نے پوچھا۔

''تمہارا باپ کیوں نہیں آیا؟''

دلاور خان نے عرض کیا وہ بیمار ہے اس لیے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا اور آپ کا حکم سننے کے لیے مجھے بھیج دیا ہے۔

ابراہیم لودھی جواب میں کہنے لگا۔

اگر مستقل قریب میں تمہارا باپ نہیں آئے گا تو دوسرے امراء کی طرح مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔

اس کے بعد ابراہیم لودھی نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ اسے قید خانے میں لے جا کر وہ جگہ دکھاؤ جہاں اس سے پہلے بڑے بڑے امراء اور سالاروں کو دیوار میں چن کر ان کا خاتمہ کیا گیا تھا تاکہ یہ واپس جا کر اپنے باپ کو بتائے کہ ہم نافرمانوں کا کیا حال کرتے ہیں۔ جب ابراہیم لودھی کے کارندے دلاور خان کو وہاں لے گئے تو مورخین کا کہنا ہے کہ دلاور خان وہاں کا حال دیکھ کر لرز اٹھا اور اس کے دماغ سے دھواں اٹھنے لگا۔

اس کے بعد پھر اسے ابراہیم لودھی کے سامنے پیش کیا گیا ابراہیم لودھی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

جن لوگوں نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی ان کا حال تم نے دیکھ لیا ہے۔ کہتے ہیں اس موقع پر دولت خان کے بیٹے دلاور خان پر ایسا خوف اور وحشت طاری ہوئی کہ اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر ابراہیم لودھی کے قدموں پر رکھ دیا۔

اس موقع پر ابراہیم لودھی نے یہ فیصلہ کیا کہ دلاور خان کو اپنے پاس روکے اور کسی حیلے بہانے سے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اس کی بینائی کا خاتمہ کر دے لیکن اپنے جاننے والوں کے ساتھ ساز باز کر کے دلاور خان کسی نہ کسی طرح دہلی سے بھاگ کر لاہور کی طرف چلا گیا۔

دلاور خان نے واپس جا کر سارے حالات اپنے باپ دولت خان سے کہہ دیے۔ یہ حالات سن کر دولت خان عجیب سی حالت میں مبتلا ہو گیا تھا اس موقع پر اس نے اپنے خیر خواہوں سے مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اگر بغاوت کرتا ہوں تو نمک حرامی کی تہمت لگتی ہے اور اگر سلطان کے حکم کا اتباع کرتے

ہوئے لاہور سے دہلی جاتا ہوں تو ابراہیم لودھی کے ستم کا شکار ہوں گا اور اس طرح جان نہیں بچے گی آخر سب سے مل کر یہ طے کیا گیا کہ ابراہیم لودھی کی طرف جانے کے بجائے بابر کو، جس نے اس وقت افغانستان میں قیام کیا ہوا تھا اسے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی جائے چنانچہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد جس طرح رانا سانگا نے ابراہیم لودھی پر حملہ [illegible] کے لیے بابر کو دعوت دی تھی اسی طرح [illegible] خان نے بھی اپنے تیز رفتار قاصد افغانستان میں ظہیر الدین بابر کی طرف بھجوائے اور [illegible] ہندوستان پر ابراہیم لودھی کے خلاف [illegible] تو وہ پوری طرح اس کا ساتھ دیں گے۔ اس طرح قہر آلود حالات کی آندھی ایک طرف سے ابراہیم لودھی کے خلاف چلنے لگی تھی۔ ان سارے بدلتے حالات کو دیکھتے ہوئے بھی ابراہیم لودھی اپنی فطرت سے باز نہ آیا۔ اور [illegible] تبدیل ہوتے حالات کو دیکھتے ہوئے بھی نہ سنبھلا اور ظلم کی چکی برابر چلاتا رہا۔ شاید موت اس کے خلاف گھات لگا چکی تھی۔

ظہیر الدین بابر ایک روز کابل میں اپنے سالاروں میں سے مہدی خواجہ جو اس کا برادر نسبتی بھی تھا علی قلی، رستم بہادر نادر خان نوحانی معروف خان اور جنید خان کے علاوہ کچھ دوسرے سالاروں اور امرا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے مخبروں نے اسے ابراہیم لودھی کے لشکر کے خلاف جہانگیر قلی بیگ کی شاندار فتح کی خبر دی اور اسے یہ بھی بتایا کہ جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ دونوں نے ابراہیم لودھی کے لشکر کو شکست دینے کے بعد بھیرہ پر قبضہ کر لیا تفصیل کے ساتھ ظہیر الدین بابر کو یہ بھی بتا دیا کہ اس جنگ میں ابراہیم لودھی اور گوالیار کے راجہ بکرماجیت کا متحدہ لشکر تھا۔ گوالیار کے راجہ کے لشکر کا راجہ مارا گیا جبکہ ابراہیم لودھی کا سالار اپنے بچے لشکریوں کو لے کر دہلی کی طرف بھاگ گیا ہے۔

یہ خبر سن کر ظہیر الدین بابر نے خوشی کا اظہار کیا کچھ دیر سوچتا رہا پھر اپنے برادر نسبتی مہدی خواجہ کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

مہدی خواجہ دو تیز رفتار قاصد جہانگیر قلی کی طرف روانہ کرو میری طرف سے ایک تحریر آج ہی تمہیں مل جائے گی وہ تحریر لے کر قاصد جہانگیر قلی کے پاس جائیں جہانگیر قلی کو یہ بھی بتائیں کہ وہ چھ یا سات آدمیوں کا ایک وفد لے کر دہلی کا رخ کرے ابراہیم لودھی کے پاس جائے اور اس سے یہ مطالبہ کرے کہ اس سے پہلے جو علاقے ہمارے جد امجد تیمور لنگ نے ہندوستان میں داخل ہو کر فتح کیے تھے اور شرافت کے ساتھ سارے علاقے ہمارے حوالے کر دے ورنہ جنگ کی نوبت آئے گی اور وہ علاقے ہم واپس لیں گے۔

سارے سالاروں نے ظہیر الدین بابر کی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا پھر بابر کے کہنے پر وہ سب وہاں سے اٹھ گئے چنانچہ بابر کے ہاں سے نکل کر مہدی خواجہ چند قدم ہی دور گیا تھا کہ سامنے کی طرف سے بابر کی بہن خانزادہ سے اس کی ملاقات ہو گئی مہدی خواجہ کو دیکھتے ہی خانزادہ بڑے جستجو بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”بھائی کیا کوئی خاص بات ہے جو آپ مسکراتے ہوئے نکل رہے ہیں؟“

اس پر خانزادہ کی طرف دیکھتے ہوئے مہدی خواجہ کہنے لگا۔ آپ کا کہنا درست ہے آپ جانتی ہیں آغا نے جہانگیر قلی اور نورنگ بیگ کو ہندوستان کے شہر بھیرہ کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا تھا جہانگیر قلی کا ٹکراؤ ابراہیم لودھی اور گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے متحدہ لشکر سے ہوا اس ٹکراؤ میں جہانگیر قلی نے شاندار فتح حاصل کی دونوں قوتوں کے متحدہ لشکر کو اس نے بدترین شکست دی اور اب وہ بھیرہ ہی میں قیام کیے ہوئے ہے اب مجھے آغا نے حکم دیا ہے کہ دو تیز رفتار قاصد جہانگیر قلی کی طرف روانہ کروں اور اسے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ چھ سات مسلح جوانوں کا وفد لے کر ابراہیم لودھی کی طرف جائے اور اس سے مطالبہ

کرے کہ تیمور لنگ نے اپنے دور میں جو علاقے ہندوستان کے فتح کیے تھے وہ ابراہیم لودھی ہمارے حوالے کردے اب میں قاصدوں کو ہی جہانگیر قلی کی طرف روانہ کرنے کے لیے جارہا ہوں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد مہدی خواجہ رکا ایک گہری نگاہ خانزادہ بیگم پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

''میری بہن آپ نے جہانگیر قلی کو اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے کیا یہ خبر آپ کی خوشی کا باعث نہیں ہے؟''

خانزادہ مسکرادی کہنے لگی۔

''مجھ سے بڑھ کر جہانگیر قلی کی اس فتح کی خوشی کسے ہوسکتی ہے اس کا باپ میرا بھائی بنا ہوا تھا اور ہر موقع پر میرے کام آتا رہا اگر میرے سگے بیٹے بھی اس وقت میرے پاس ہوتے تو میں انہیں جہانگیر قلی سے زیادہ محبت نہ دیتی لیکن یہ زیادتی ہے کہ جہانگیر قلی کو ایک وفد کا سربراہ بنا کر ابراہیم لودھی کی طرف روانہ کیا جارہا ہے وفد تو یہاں کابل سے روانہ کیا جانا تھا بہرحال میری دعائیں جہانگیر قلی کے ساتھ ہیں اور خداوند قدوس نے چاہا تو وہ ہر میدان اور ہر رن میں کامیاب اور فتح مند رہے گا۔''

اس کے ساتھ ہی خانزادہ ایک طرف چل دی جبکہ مہدی خواجہ آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

ظہیرالدین بابر کے قاصد جہانگیر قلی کے پاس بھیرہ کے نواح میں پہنچے جہاں جہانگیر قلی نے اپنے لشکر کے ساتھ قیام کر رکھا تھا۔ جس وقت دونوں قاصد پڑاؤ میں داخل ہوئے اس وقت جہانگیر قلی اور نورنگ بیگ دونوں ایک جگہ بیٹھے باہم گفتگو کررہے تھے کہ انہیں ظہیرالدین بابر کی طرف سے آنے والے قاصدوں کی خبر دی گئی چنانچہ ان دونوں نے قاصدوں کو وہیں بلالیا تھا۔

چنانچہ جب دونوں قاصد ان کے پاس آئے تب ایک قاصد نے جہانگیر قلی کی طرف غور سے دیکھا پھر کہنے لگا۔

''امیر! ہمیں آغا نے بھیجا ہے ہمارے پاس اس کی طرف سے ایک خط ہے۔'' ساتھ ہی اپنے لباس کے اندر سے کاغذ نکال کر اس نے جہانگیر قلی کو تھمادیا تھا جہانگیر قلی نے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھ کر نورنگ کی طرف بڑھادی تھی جب نورنگ بھی وہ تحریر پڑھ چکا تب قاصد بولا اور کہنے لگا۔

''بادشاہ کی طرف سے ہمیں یہ تاکید کی گئی ہے کہ آپ چند مسلح جوانوں کو اپنے ساتھ لے کر ایک سفارت کی صورت میں دہلی ابراہیم لودھی کے پاس جائیں اور اس سے یہ کہیں کہ بابر کے جد امجد تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ آور ہو کر ہندوستان کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا وہ علاقے بابر کے حوالے کر دیے جائیں اور جو جواب ابراہیم لودھی دے واپس آ کر اسے ظہیرالدین بابر تک پہنچایا جائے یہاں تک کہنے کے بعد وہ قاصد رکا کچھ سوچا دوبارہ وہ بول اٹھا۔

جبکہ آپ کے لشکر کے لیے ہمیں حکم یہ ملا ہے کہ لشکر آپ کا یہیں قیام کرے گا آپ کی غیر موجودگی میں لشکر کی دیکھ بھال اور سپہ سالاری نورنگ بیگ کے پاس ہوگی اور جب دہلی میں ابراہیم کو بابر کا پیغام پہنچا کر واپس آئیں گے تو پھر آپ اور نورنگ بیگ اپنے لشکر کو لے کر باہر کی طرف چلے جانا بادشاہ کی طرف سے ہمیں یہی حکم ملا ہے۔

یہ حکم ملنے کے بعد جہانگیر قلی نے قاصدوں کو تو آرام کرنے کے لیے اپنے کچھ سالاروں کے ساتھ بھیج دیا ان کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی یہاں تک کہ جہانگیر قلی نورنگ بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''نورنگ بیگ میرے بھائی! میں کل اپنے سات مسلح ساتھیوں کے ساتھ دہلی کا رخ کروں گا اور جو پیغام بابر نے مجھے پہنچایا ہے وہ ابراہیم تک پہنچاؤں گا پھر دیکھتا ہوں وہ کیا جواب دیتا ہے۔''

جہانگیر قلی جب خاموش ہوا تب کسی قدر افسوس اور دکھ بھرے انداز میں نورنگ بیگ بول اٹھا۔

''جہانگیر قلی میرے بھائی! میں سمجھتا ہوں آپ

کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا آپ نے بھیرہ کو فتح کیا ہے حالانکہ جس وقت ہم بھیرہ پر حملہ آور ہونے کے لیے آئے تھے بابر بھی ہمارے ساتھ آیا تھا لیکن ایک مقام پر پہنچنے کے بعد وہ واپس چلا گیا اب جبکہ ہم نے بھیرہ کو فتح کر لیا ہے تو بابر کو چاہیے تھا کہ آپ کو سفارت دے کر دہلی نہ بھجواتا بلکہ ہمیں اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ رہنے دیتا ایک سفارت وہ کابل سے براہ راست دہلی کی طرف روانہ کرتا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد نورنگ بیگ جب خاموش ہوا تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی میں جہانگیر قلی کہنے لگا۔

''نورنگ بیگ! تمہاری حیثیت میرے بڑے بھائی کی سی ہے میرے عزیز تو جانتا ہے بچپن سے لے کر جوانی کی حدود میں داخل ہونے تک میں غلام رہا میرے خاندان میں کوئی غلام نہیں تھا میرا قصور یہ تھا کہ میں ایک ایسے ترک سردار کا بیٹا ہوں جو بابر کے دشمن شیبانی خان کا حامی تھا اور اس کے لشکر کے بڑے سالاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ بس بابر کے خلاف ہونے والی جنگ کے دوران میرا باپ اور اہل خانہ مارے گئے مجھے گرفتار کر لیا گیا اور مجھے غلام بنا لیا گیا چونکہ میں بابر کے دشمن سردار کا بیٹا ہوں لہٰذا بابر شروع سے ہی مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن خصوصیت کے ساتھ بڑے سالاروں میں سے قاسم بیگ اور مہدی خواجہ نے میری سفارش کی اس بنا پر مجھے دس سال کی غلامی کا طوق ڈالا گیا دس سال بعد غلامی کا طوق تو اتر گیا لیکن بادشاہ بابر نے جہاں اپنی زبان سے مجھے غلام بنایا تھا وہاں آج تک اس نے اپنی زبان سے مجھے غلامی سے آزاد کرنے کے الفاظ ادا نہیں کیے اس کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نگاہوں میں میں ابھی تک غلام ہوں لہٰذا اپنے غلام سے کوئی بادشاہ جو چاہے کام لے سکتا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ جہانگیر قلی بیگ رکا سوچا دوبارہ نورنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''نورنگ بیگ میرے عزیز بھائی پریشان نہ ہونا لشکر کے ساتھ یہیں قیام کرو کل صبح سویرے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کروں گا اب آؤ اپنے خیمے میں جا کر آرام کریں۔'' اس کے ساتھ ہی دونوں اٹھ کر اپنے اپنے خیمے کی طرف ہو لیے تھے اگلے روز سات مسلح جوانوں کے ساتھ جہانگیر قلی بیگ نے دہلی کا رخ کیا تھا۔

☆☆☆

گوالیار کا راجہ بکرماجیت ایک روز اپنے راج محل کے ایک کمرے میں اپنی رانی بھروجہ راجکماری رادیکا اپنے بیٹے رام نارائن کے ساتھ بیٹھا اپنے کسی گھریلو موضوع پر گفتگو کر رہا تھا کہ اس کمرے کے دروازے پر بکرماجیت کے لشکریوں کا سالار باسی دیو نمودار ہوا اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

چنانچہ بکرماجیت نے جب اسے اندر آنے کی اجازت دی تب باس دیو آگے بڑھا اور بکرماجیت کے کہنے پر اس کے قریب ہی جو خالی نشست تھی اس پر ہو بیٹھا۔

کچھ دیر خاموشی کی بعد آخر بکرماجیت نے اس کی طرف دیکھا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''باس دیو! تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ تم کسی اہم موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے آئے ہو۔''

اس پر باس دیو مسکرایا اور کہنے لگا۔

''مہاراج! آپ کا اندازہ درست ہے آپ جانتے ہیں بھیرہ کے نواح میں لڑی جانے والی جنگ کے دوران مسلمانوں کے سالار کے ہاتھوں میرا بیٹا رائے کرن مارا گیا تھا اور مسلمانوں کے جس سالار نے اسے قتل کیا تھا نام اس کا جہانگیر قلی بیگ ہے۔ اب میں نے جو بھیرہ کی طرف پہلے سے اپنے مخبر پھیلا رکھے تھے انہوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ بھیرہ کو فتح کرنے والا یہی جہانگیر قلی بیگ ہمارے دام میں پھنس رہا ہے۔ جہانگیر قلی کو ظہیر الدین بابر نے اپنے چھ ساتھیوں کے ساتھ ایک سفیر کے طور پر دہلی میں ابراہیم لودھی کی طرف بھجوایا ہے اور یہ سفارت بابر کی طرف سے ابراہیم لودھی سے یہ مطالبہ

کرے گی کہ ماضی میں تیمور لنگ جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا تو جو علاقے اس نے فتح کیے وہ علاقے ابراہیم لودھی بابر کے حوالے کر دے اس لیے کہ تیمور لنگ بابر کا جدامجد تھا۔

مہاراج! میں چاہتا ہوں مسلمانوں کا سالار جو میرے بیٹے کا قاتل ہے جس نے ہمارے لشکر کو شکست دی اور جس نے ہمارے بہت سے لشکریوں کو موت کے گھاٹ اتارا جب اپنی سفارت مکمل کر کے اور ابراہیم لودھی سے ملنے کے بعد دہلی سے روانہ ہو تو کسی خاص مقام پر اس پر حملہ کیا جائے اور اس کا کام تمام کر دیا جائے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد باس دیو جب خاموش ہوا تب بکرماجیت کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتا رہا پھر باس دیو کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''باس دیو! تمہارا کہنا درست ہے اور یہ ایک اچھی تجویز ہے لیکن اس میں خطرات بھی پنہاں ہیں یاد رکھنا جتنے جوان ظہیرالدین بابر کے اس سالار پر حملہ آور ہونے کے لیے بھیجو وہ کسی بھی صورت یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ ان کا تعلق گوالیار سے ہے اگر یہ معاملہ ظاہر ہو گیا تو یاد رکھنا ظہیرالدین بابر ابراہیم لودھی کو بھول جائے گا اور سیدھا گوالیار کو اپنا ہدف بنانے کی کوشش کرے گا اور اگر ایسا ہوا تو یاد رکھنا ہندوستان میں کوئی بھی ایسی قوت نہیں جو ظہیرالدین بابر کے مقابلے میں ہماری مدد کرے۔''

بکرماجیت جب خاموش ہوا تب چھاتی تانتے ہوئے باس دیو کہنے لگا۔

''مہاراج! آپ فکر ہی نہ کریں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ ظہیرالدین بابر کے اس سالار اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کس نے کیا۔''

باس دیو جب خاموش ہوا تب بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بکرماجیت نے پوچھ لیا۔

''باس دیو یہ ظہیرالدین بابر کے سالار کا خاتمہ کرنے کے لیے تم کسے بھیجو گے؟''

اس پر باس دیو بولا اور کہنے لگا

''مہاراج! میرا ایک ہی بیٹا تھا جو مارا جا چکا ہے اب میں اپنے ایک بھتیجے کو اس کام پر مقرر کروں گا جس کا نام رائے سنگھ ہے یہ تلوار کا بڑا دھنی اور جنگ کا وسیع تجربہ رکھتا ہے ہمارے لشکر میں بھی شامل ہے اور یہ کام وہ بڑی آسانی سے کر گزرے گا اور معاملے کو راز میں بھی رکھے گا۔'' راجہ بکرماجیت نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

چنانچہ اس نے باس دیو کو اجازت دے دی تھی کہ وہ ظہیرالدین بابر کے اس سالار پر حملہ آور ہو کر اس کا خاتمہ کر دے پھر کچھ سوچتے ہوئے بکرماجیت نے ایک بار پھر باس دیو کو مخاطب کیا۔

''باس دیو! اس کام کے لیے کتنے مسلح جوان روانہ کرو گے؟''

جواب میں باس دیو نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

''مہاراج مسلمانوں کے سالار جہانگیر قلی کے ساتھ چھ سات مسلح جوان ہوں گے میں چاہتا ہوں احتیاط کے طور پر دس مسلح جوانوں کو بھیجوں۔''

بکرماجیت نے فوراً نفی میں گردن ہلائی اور غور سے باس دیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ایسی غلطی کبھی نہ کرنا کم از کم پندرہ مسلح جوانوں کو بھیجو تب میرے خیال میں وہ سالار قابو آئے گا اور تم نے دس جوانوں کو بھیجا تو میرا اندیشہ ہے کہ وہ دس کا خاتمہ کر کے آگے نکل جائے گا۔''

باس دیو نے اس تجویز پر عمل کرنے کا عہد کیا اور جب وہ اپنی جگہ سے اٹھا تب راجکماری رادیکا باس دیو کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''محترم باس دیو! اپنے بھتیجے رائے سنگھ کو مسلمانوں کے سالار پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کرنے سے پہلے رتن دیوی کو میری طرف بھیجنا میں اس سے ایک انتہائی اہم موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں اور مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد جب رتن دیوی واپس تم لوگوں کے پاس جائے تب رائے سنگھ کو اپنی مہم پر بھیجنا۔''

باس دیو نے اس سے اتفاق کیا تھا اس کے بعد

وہ بکرماجیت سے اجازت لے کر راج محل کے اس کمرے سے نکل گیا تھا۔

باس دیو کے جانے کے بعد رانی بھروجہ کچھ دیر تک بڑے غور سے اپنی راجکماری رادیکا کی طرف دیکھتی رہی پھر دھیمے لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''بیٹی! یہ تم رتن دیوی سے کس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتی ہو اور اس گفتگو کا تعلق باس دیو کے بھتیجے رائے سنگھ کی روانگی سے کیسے ہو سکتی ہے؟''

اس موقع پر راجکماری رادیکا نے بات کو ٹالنا چاہا پر بیچ میں راجہ بکرماجیت بھی بول پڑا اور کہنے لگا۔

''دیکھ بیٹی! ہم سے کوئی چیز چھپانا مت۔ کہو کیا معاملہ ہے تم جانتی ہو ہم تمہاری ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔''

اس موقع پر راجکماری رادیکا نے کچھ سوچا باری باری ایک گہری نگاہ پہلے اس نے اپنے پتا بکرماجیت اور ماتا رانی بھروجہ پر ڈالی پھر ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

''دراصل رتن دیوی کے ذریعے میں رائے سنگھ کو ایک پیغام دینا چاہتی ہوں اور یہ پیغام گوہر کماری کے لیے ہے۔''

گوہر کماری کا نام سن کر رانی بھروجہ چونکی تھی۔ تیز نگاہوں سے اس نے راجکماری رادیکا کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

''میری بچی گوہر کماری سے متعلق تم کیا گفتگو کرنا چاہتی ہو میں جانتی ہوں تیری اس سے رقابت ہے اور یہ رقابت خوب صورتی کی وجہ سے ہے اس لیے کہ گوالیار کی سرزمینوں میں لوگوں کا کہنا ہے کہ ان علاقوں میں خوب صورتی میں سب سے آگے صرف دو ہی لڑکیاں ہیں ایک راجکماری رادیکا اور دوسری گوہر کماری۔''

یہاں تک کہنے کے بعد رانی بھروجہ کو رک جانا پڑا اس لیے کہ فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے بکرماجیت بول اٹھا۔

''رادیکا میری بچی میں جانتا ہوں خوب صورتی ہی کی وجہ سے تو گوہر کماری سے رقابت رکھتی ہے۔ پر دیکھ میری بیٹی کبھی اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا اس سے حالات بگڑ سکتے ہیں گوہر کماری کا باپ وسیع علاقوں کا جاگیردار ہے ان علاقوں میں اس کی بڑی گرفت ہے اور اس کی یہ جاگیر اور اس کی یہ برگز داری ہمارے دادا پردادا کے دور سے بھی پہلے کی چلی آ رہی ہے لہٰذا سبھی لوگ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں اور پھر تو جانتی ہے گوہر کماری ایک ایسی لڑکی ہے جو صرف اپنی عادات، اپنے اخلاق و سرور ہی نہیں بلکہ اس کی خوب صورتی اور حسن کے چرچے گوالیار کے علاوہ دہلی تک بھی پھیلے ہوئے ہیں اسی لیے کہ دہلی میں اس کے باپ کے کچھ جاننے والے مسلمان ہیں اور ان دونوں خاندانوں میں پرانے تعلقات رہے ہیں لہٰذا گوہر کماری اپنے باپ اور بھائی جگن ناتھ کے ساتھ دہلی جاتی رہی ہے اور وہاں قیام کے دوران بھی اس کی خوب صورتی کے بڑے چرچے ہوئے تھے دیکھ بیٹی خوب صورتی کو اس رقابت میں گوہر کماری کو کوئی نقصان نہ پہنچانا اگر ایسا ہوا تو ہمارے لیے بڑے مسائل اٹھیں گے۔''

بکرماجیت جب خاموش ہوا تب مسکراتے ہوئے رادیکا کہنے لگی۔

پتا جی میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی میں چاہتی ہوں گوہر کماری کچھ عرصے یہاں آ کر میرے پاس رہے چونکہ ان علاقوں اور آس پاس کے لوگ مجھے اور گوہر کماری کو سب سے خوب صورت لڑکیاں سمجھتے ہیں لہٰذا میں چاہتی ہوں کہ گوہر کماری کو اپنی بہن کی حیثیت سے یہاں رکھوں تاکہ اسے یہ احساس ہو کہ اس کی خوب صورتی اس کا حسن اس کے لیے ایک سرمایہ ہے اور اسی خوب صورتی کی وجہ سے میں نے اسے بلا کر یہاں راجکماری کی طرح راج محل میں رہنے کے لیے بلایا ہے پتا جی یہاں اس کی حالت بہن کی سی ہو گی۔''

رادیکا کے ان الفاظ سے بکرماجیت اور اس کی

رائی بھر وجہ دونوں خوش ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی راجکماری رادیکا اس کمرے سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی تھی۔

کوئی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ راجکماری رادیکا کی اس خواب گاہ میں گوالیار کے سپہ سالار باس دیو کی بیٹی رتن دیوی داخل ہوئی اس کی آمد پر رادیکا نے خوشی کا اظہار کیا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اپنے پاس بٹھایا بیٹھتے ساتھ ہی رتن دیوی نے رادیکا کو مخاطب کیا۔

''رادیکا میری بہن اس موقع پر مجھے بلایا ہے اور ساتھ یہ بھی پابندی رکھی ہے کہ جب تک میری تمہاری گفتگو نہ ہو جائے میرا چچازاد بھائی رائے سنگھ اپنی مہم پر روانہ نہیں ہو سکتا یہاں جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل میرے باپ نے مجھے بتا دی ہے کہو معاملہ کیا ہے؟''

رتن دیوی کے ان الفاظ کے جواب میں راجکماری رادیکا پہلے اٹھی اپنی خواب گاہ کے کمرے میں گئی دائیں بائیں دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا دوبارہ وہ رتن دیوی کے پہلو میں بیٹھ گئی پھر بڑی راز داری میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''رتن دیوی میں تم سے گوہر کماری سے متعلق گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''

گوہر کماری کا نام سن کر رتن دیوی بھی چونکی تھی پھر ہلکی سی مسکراہٹ میں وہ رادیکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''کیا گوہر کماری کا تم حلیہ بگاڑنے پر تو نہیں تل گئی ہو دیکھو گوہر کماری کی ان علاقوں میں بڑی قدر و قیمت ہے اس کی شخصیت اس کا دراز قد اور اس کی خوب صورتی ایسی ہے کہ لوگ اس کی جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں پر اس کے ساتھ کچھ خطرات بھی لاحق ہیں رادیکا اس کا باپ جے چند جاگیردار ہے اور جاگیردار بھی چھوٹا نہیں بہت بڑا جاگیردار ہے اور ---''

رادیکا نے فوراً مسکراتے ہوئے رتن دیوی کی بات کاٹ دی کہنے لگی۔

''رتن ایسی کوئی بات نہیں پہلے میری پوری گفتگو سن لو انہی خدشات کا اور خطرات کا اظہار میرے پتا جی اور ماتا نے بھی کیا تھا لیکن میں نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں گوہر کماری کو راج محل میں ایک بہن کی حیثیت سے رکھنا چاہتی ہوں تاکہ اسے یہ احساس ہو کہ اس کی خوب صورتی اس کی شخصیت اور حسن اس قابل ہے کہ وہ راج محل میں رہے۔''

''لیکن حقیقت ایسی نہیں ہوگی۔''

''دیکھ رتن! تو بھی میری بہن بنی ہوئی ہے۔ لوگ جب خوب صورتی کا ذکر کرتے ہیں تو میری خوب صورتی کے ساتھ ساتھ گوہر کماری کی خوب صورتی کا بھی ذکر ہوتا ہے جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔

رتن میری بہن! میں گوہر کماری کو نقصان نہیں پہنچاؤں گی میں جانتی ہوں اگر ایسا ہوا تو میرے پتا جی کے لیے بھی کچھ خدشات اور خطرات اٹھیں گے اور میں ہرگز ایسا نہیں کروں گی میں تمہارے ذریعے رائے سنگھ کو یہ پیغام دینا چاہتی ہوں جب وہ اپنی مہم سے واپس آئے تو آتے ہوئے گوہر کماری کو بڑی حفاظت اور عزت کے ساتھ یہاں راج محل میں لے کر آئے اور اس سے کہے کہ میرے پتا جی اور ماتا کی خواہش ہے کہ گوہر کماری کچھ عرصہ راج محل میں رہ کر راج کماریوں کے سے رہنے اور ان جیسے آداب سیکھے تاکہ اس کی ہر دل عزیزی میں مزید اضافہ ہو۔

رتن میری بہن! جب گوہر کماری یہاں آئے گی تو شروع میں تو میں اس کی عزت کروں گی اسے محبت اور احترام بھی دوں گی لیکن بعد میں سیاسی چال چلوں گی اور اسے اپنے سے کم تر سمجھتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے ایک طرح کے احساس کمتری میں مبتلا کر دوں گی اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دوں گی کہ نہ وہ حسن اور خوب صورتی میں رادیکا سے بڑھ کر ہے اور نہ ہی ہر دل عزیزی میں بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرنا چاہتی جس روز ایسا ہو جائے گا یوں جاننا

اس روز میرے من کو وہ سکون ملے گا جس کا اظہار میں الفاظ میں نہیں کر سکتی اب بول تو کیا کہتی ہے؟

یہاں سے جانے کے بعد رائے سنگھ سے کہنا کہ ہم سے فارغ ہونے کے بعد گوہر کماری کو اپنے ساتھ لیتا آئے تاکہ وہ راج محل میں رہے میرے خیال میں تم یہ کام کر گزرو گی اس لیے کہ رائے سنگھ تمہارا منسوب بھی ہے تم سے محبت کرتا ہے تم بھی اسے چاہتی ہو لہٰذا تمہاری بات وہ ٹالے گا نہیں۔''

رادیکا کی یہ ساری گفتگو سن کر رتن دیوی خوش ہو گئی تھی بڑے پیارے انداز میں اس نے رادیکا کا خوب صورت اور سرخ گال تھپتھپایا اور کہنے لگی۔

''رادیکا تم بے فکر رہو جیسا تم چاہ رہی ہو ایسا ہی ہوگا اپنی مہم سے فارغ ہونے کے بعد رائے سنگھ گوہر کماری کو اپنے ساتھ لیتا آئے گا بلکہ میں رائے سنگھ سے یہ بھی کہوں گی کہ جاتی دفعہ گوہر کماری کے باپ جے چند اور بھائی جگن ناتھ سے مل کر جائے اور ان سے کہے کہ وہ ایک مہم کے سلسلے میں دہلی کے مغربی علاقوں کی طرف جا رہا ہے لہٰذا اس کی واپسی تک گوہر کماری کو تیار رکھیں وہ اسے اپنے ساتھ گوالیار لے کر جائے گا اور یہ راجہ بکرماجیت اس کی رانی بھروجہ اور راجکماری رادیکا کی خواہش ہے کیونکہ رادیکا گوہر کماری کو اپنی بہن کی طرح خیال کرتی ہے۔

کیا رائے سنگھ اپنے مسلح جوانوں کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے کنارے دہلی کا رخ کرے گا اگر ایسا ہے تو پر گوہر کماری کے باپ اور بھائی سے ملنے کے لیے اسے کچھ بائیں جانب چکر کاٹنا پڑے گا۔''

اس موقع پر کچھ سوچتے ہوئے رتن دیوی بولی اور کہنے لگی۔

''رادیکا! ایسا نہیں ہوگا چونکہ رائے سنگھ نے مسلمانوں کے سالار اور اس کے ساتھیوں کو روک کر انہیں قتل کرنا ہے اور یہ کام دہلی کے مغربی سمت ہو سکتا ہے میرے پتاجی کے مخبروں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کا وہ وفد جس کی کمانداری بابر کا سپہ سالار جہانگیر قلی کر

عمران ڈائجسٹ

کے آخری صفحات کی

خوبصورت کہانیوں کی تخلیق کار

''سیدہ عطیہ زاہرہ''

اب آپ کے لئے پیش کرتی ہیں

اسرار و رموز میں ڈوبا،

حسن و عشق کی سرزمین سے گزرتا

سلسلے وار ناول

''خوابوں کے ساحل''

ایک منفرد تحریر

پراسرار اسلوب نگارش میں ایک گراں قدر اضافہ،

ایک ایک لفظ سحر میں ڈوبا ہوا

بہت جلد

عمران ڈائجسٹ کے صفحات میں

رہا ہے وہ اس شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے دہلی کا رخ کریں گے جو حصار اور بھوانی سے ہوتی ہوئی دہلی کی طرف آتی ہے لہٰذا رائے سنگھ دریائے جمنا کے کنارے کنارے دہلی کا رخ نہیں کرے گا بلکہ بائیں طرف سے ہو کر بھوانی کا رخ کرے گا اس طرح گوہر دیوی کی رہائش بھی اس کے راستے میں آئے گی اور وہ اس کے باپ اور بھائی سے کہتا جائے گا کہ اس کی واپسی تک گوہر کماری کو تیار رکھیں۔''

رتن دیوی کے ان الفاظ پر راجکماری رادیکا خوش ہوگئی تھی پھر رتن کماری اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی اس کی طرف دیکھتے ہوئے راجکماری رادیکا بھی اٹھ کھڑی ہوئی پھر رتن دیوی بولی اور کہنے لگی۔

''رادیکا! میں اب جاتی ہوں بالکل بے فکر رہو تمہارا کام ہو کر رہے گا۔'' رادیکا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی رتن دیوی رادیکا کی خواب گاہ اور راج محل سے نکل گئی تھی اس روز رائے سنگھ اپنے پندرہ مسلح ساتھیوں کے ساتھ جہانگیر قلی کا خاتمہ کرنے کے لیے بھلوانی کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

ابراہیم لودھی ایک روز دہلی کے قصر میں اپنے سالاروں میں سے ہیبت خان، آدم کاکڑ، قطب خان احمد خان اور تاتار خان کے علاوہ کچھ دوسرے سالاروں کے ساتھ سلطنت کے کسی اہم موضوع پر گفتگو کر رہا تھا کہ اس موقع پر اس کا چوبیدار قصر کے اس دروازے پر نمودار ہوا اور پھر ابراہیم لودھی کو مخاطب کر کے دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

سلطان محترم کابل کے حکمران ظہیر الدین بابر کی طرف سے سات افراد پر مشتمل ایک وفد آیا ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ظہیر الدین بابر کا کوئی پیغام دینا چاہتا ہے۔ میں نے ان کے ساتھ تفصیل کے ساتھ بات کی ہے ان کا سربراہ ظہیر الدین کا ایک سالار ہے نام اس کا جہانگیر قلی ہے اور یہ جہانگیر قلی وہی ہے جس نے بھیرہ کے نواح میں ہمارے سالار قطب خان اور گوالیار کے لشکر کو شکست دی اس سے بھی میں نے طویل گفتگو کی ہے جن دنوں بابر سمرقند کی طرف شیبانی خان کے ساتھ برسرپیکار تھا تو اس جہانگیر قلی کا باپ بابر کے خلاف شیبانی خان کا ساتھ دے رہا تھا۔ ایک جنگ میں اس کا باپ اور اہل خانہ جب مارے گئے تو اسے غلام بنا لیا گیا۔ دس سال یہ غلام رہا اور اس کے پاؤں میں غلامی کے کڑے ڈال کر رکھے گئے اب غلامی کے کڑے تو اتار دیے گئے ہیں اور مجھے اس کی زبان سے یہ پتا چلا ہے کہ چونکہ اس کا باپ ظہیر الدین بابر کے خلاف کام کرتا رہا تھا لہٰذا ظہیر الدین بابر نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ یہ جہانگیر قلی کبھی بھی اپنا چہرہ لے کر اس کے سامنے نہ آئے اب میں جہانگیر قلی ظہیر الدین بابر کے وفد کا سربراہ بن کر آیا ہے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔''

جب تک چوبدار بولتا رہا ابراہیم لودھی خاموشی سے سنتا رہا جب چوبدار خاموش ہوا تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ان سب کو میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں جانوں کہ وہ میرے لیے کیا پیغام رکھتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی چوبدار وہاں سے نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد اس نے جہانگیر قلی اور اس کے چھ ساتھیوں کو لا کر ابراہیم لودھی کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

ابراہیم لودھی کچھ دیر تک ان سب کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے انہیں مخاطب کیا۔

''تم میں جہانگیر قلی کون ہے؟''

جہانگیر قلی نے اپنا ہاتھ اوپر کیا اور کہنے لگا۔

''سلطان محترم! میں جہانگیر قلی بیگ ہوں۔''

ابراہیم لودھی نے اس کے انداز مخاطب کو پسند کیا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نمودار ہوئی پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہمارے سالار قطب خان اور گوالیار کے لشکریوں کے سپہ سالار کے بیٹے کے مقابلے میں تم نے فتح حاصل کی اور بھیرہ فتح

کیا۔ کیا یہ درست ہے؟‘‘

جہانگیر قلی نے اثبات میں گردن ہلائی پھر بڑی انکساری میں کہنے لگا۔

’’سلطان محترم! آپ نے صحیح سنا ہے جو لشکر آپ اور گوالیار کے راجہ کے متحدہ لشکر سے ٹکرایا اس کا سالار میں ہی تھا۔‘‘

ابراہیم لودھی ایک بدمزاج انسان تھا اچانک اس کا چہرہ بدل گیا اور جہانگیر قلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

’’اگر یہ معاملہ ہے اور تم نے ہمارا شہر بھیرہ فتح کیا۔ ہمارے سالار کو شکست دی۔ گوالیاں کے سپہ سالار کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارا ان حالات میں تم نے یہ نہ سوچا کہ تمہیں ہمارے پاس دہلی میں سفارت کے سربراہ کی حیثیت سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس طرح یہاں آ کر تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔‘‘ اس موقع پر جہانگیر قلی نے غور سے ابراہیم لودھی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

’’سلطان محترم! جس کا نمک کھایا جائے جب وہ حکم دے تو پھر اپنی جان کے خطرے کو نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے ظہیرالدین بابر نے حکم دیا سو میں اس کے حکم کا اتباع کرتے ہوئے یہ وفد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ظہیرالدین بابر نے جو پیغام مجھے دیا ہے وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں آگے اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے میں ایک سفیر ہوں پیغام پہنچانا میرا کام ہے۔‘‘

یہاں تک کہنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ رکا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری دوبارہ وہ ابراہیم لودھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

’’سلطان محترم! مجھے آپ کے نام ظہیرالدین بابر نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ ماضی میں اس کی جداعلا تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد جن علاقوں کو فتح کیا تھا وہ علاقے ظہیرالدین بابر کے حوالے کر دیے جائیں بس یہی وہ پیغام ہے جو ظہیرالدین بابر نے مجھے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کہا ہے اور اس کا پیغام میں نے آپ تک پہنچا دیا ہے اس پیغام کے جواب میں جو کچھ آپ کہیں گے میں ظہیرالدین بابر تک پہنچا دوں گا۔‘‘

جہانگیر قلی بیگ کی زبان سے یہ پیغام سن کر ابراہیم لودھی کی حالت گرم ہواؤں کی تلخی، سفاک ہجر کے سیاروں جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ ماتھے پر ناپسندیدگی کے بل پڑ گئے تھے اس کے بعد وہ آگ کی لپٹوں کے سے لہجے میں جہانگیر قلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

’’یہ پیغام پہنچاتے ہوئے تم نے یہ نہ سوچا کہ یہ پیغام پہنچانے کے بعد تم عقوبت و عذاب سے آبروئی، عوسری اور موت، مرت کا شکار بھی ہو سکتے ہو۔‘‘

ابراہیم لودھی کے خاموش ہو جانے پر جہانگیر قلی نے بھی ایک گہری نگاہ ابراہیم لودھی پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

’’سلطان محترم! جیسا کہ آپ کا چوبدار میرے متعلق آپ کو تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہے میں غلام تھا اور اب بھی غلام ہوں ایک غلام کی حیثیت سے میں تشنگی کے عہد کا ایک کفن بدوش ہوں اس کے باوجود ضمیر بیچ کر حق کشی حرام سمجھتا ہوں۔ آگ و خون کے کھیل میں بھی خود کو بیچ کر جو خوشی ملے وہ اپنے لیے حرام خیال کرتا ہوں۔‘‘ یہاں تک کہتے کہتے جہانگیر قلی کو رک جانا پڑا اس لیے کہ بے پناہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے ابراہیم لودھی بول پڑا۔

’’تم نے سفارت کاروں کا سربراہ بن کر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا ہے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا ہے یہاں دہلی سے تمہیں ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ تم واپس ہی نہ جا سکو۔‘‘

ابراہیم لودھی کے خاموش ہونے پر جہانگیر قلی پھر بول اٹھا۔

’’سلطان محترم! میں نے ایک غلام کی حیثیت سے خواہشوں کے آنچل اور دامن کرچی کرچی ہوتے دیکھے ہیں میں اپنے شجرہ نسب کا آخری فرد ہوں میرا نہ کوئی زندگی کا حوالہ ہے نہ جان، روح کا اجالا۔ نہ

کوئی میری بزم ہستی کا عکس جان ہے نہ کوئی چاہتوں کا محور۔ سلطان محترم! میں اپنے جذبوں اپنے احساسات اپنے جسم اپنی جان اور اپنی تنہائیوں کے لمحوں کا واحد مالک ہوں۔ ایک غلام کی حیثیت سے میں سمندر کے تلاطم اور صحرائی طوفانوں کے سے حالات میں پہلے ہی اپنے دامنے کو لہولہو کر چکا ہوں اب نفرت کی چنگاریاں بیزاری کے بگولے اور کرودھ کے سلگتے انگارے مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتے۔ سلطان محترم میں نے بد دیانتی اور بے ایمانی نہیں کی جو پیغام مجھے دیا گیا تھا وہ میں نے ویسے کا ویسا ہی آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا پیغام پہنچانا ایک غلطی اور خطا ہے اور اس کی آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں تو سلطان محترم میں جہانگیر قلی بڑے برے حالات دیکھ چکا ہوں موت سے نہیں ڈرتا گردن کٹتی ہے تو کٹ جائے پر جو ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی وہ میں اتار چکا ہوں۔''

اس موقع پر ابراہیم لودھی اپنے قریب بیٹھے اپنے کچھ امراء سے صلاح مشورہ کرنے لگا تھا جبکہ جہانگیر قلی اور اس کے ساتھی غور سے اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جہانگیر قلی کے قریب ہی ایک نشست پر ابراہیم لودھی کا وہ سالار بیٹھا تھا جس کا نام قطب خان تھا اور جسے بھیرہ کے نواح میں جہانگیر قلی نے شکست دی تھی۔ قطب خان کے ساتھ ابراہیم لودھی کا نامور سالار احمد خان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس موقع پر احمد خان نے جہانگیر قلی کا بغور جائزہ لیا پھر بڑی دھیمی سرگوشی میں وہ اپنے ساتھ بیٹھے اپنے ساتھی سالار قطب خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''قطب خان ظہیر الدین بابر کا یہ سالار جس کا نام جہانگیر قلی بتایا گیا ہے میں نے اس کا جائزہ لیا ہے یہ مجھے گرم صحرا کے بھاگتے بگولوں میں جرات مندی کی شکتی اور دلیری کا آتش فشاں لگتا ہے۔ طوفانوں میں سرگردہ مٹی کے غبار میں لاجواب تیغ زن دکھائی دیتا ہے اور فکر کے بے سکون سوالوں میں شجاعت کی حرمت لگتا ہے اپنی شخصیت میں بھی خوب ہے دیکھو اس کے نکھرے خدوخال اس کی خوش قامتی سے کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ غلام ہے بلکہ اس کی شخصیت اس کے غلام ہونے کی نفی کرتی ہے۔

ابراہیم لودھی کا سالار احمد خان شاید کچھ اور بھی کہتا کہ چونکنے کے انداز میں وہ خاموش ہو گیا اس لیے کہ ابراہیم لودھی جہانگیر قلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جو پیغام تم نے دیا ہے وہ یقیناً ناقابل برداشت ہے لیکن تم چونکہ سفیر ہو لہٰذا ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کرتے ایک سفیر کی حیثیت سے ہم تمہیں پیشکش کرتے ہیں کہ دہلی میں جتنے دن چاہو آرام کرو اس کے بعد واپس جا کر میری طرف سے ظہیر الدین بابر سے کہنا کہ ہندوستان کی سرزمین کوئی دوکان نہیں ہے جس میں سے جو چیز چاہو مانگ لو۔ میں ان علاقوں کا حکمران ہوں اگر وہ کسی علاقے کا دعوے دار ہوتا ہے تو پھر اس کے اور میرے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی بس یہی پیغام اس تک پہنچا دینا اب میں تمہارے ساتھ اپنا ایک سالار بھیجتا ہوں جو تمہیں شاہی مہمان خانے کی طرف لے جاتا ہے۔''

جواب میں ابراہیم لودھی کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر قلی کہنے لگا۔

''سلطان محترم! آپ کی اس پیشکش کا شکریہ ہم ایک منزل پیچھے پوری طرح آرام کر چکے ہیں سستا چکے ہیں ہم وقت ضائع نہیں کرتے جو پیغام ہم نے آپ تک پہنچانا تھا پہنچا چکے آپ کا جواب بھی مل گیا ہے لہٰذا ہم ابھی اور اسی وقت یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔'' اس موقع پر ابراہیم لودھی نے چند ثانیوں تک بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھا پر انہیں جانے کی اجازت دے دی اس کے ساتھ جہانگیر قلی اپنے ساتھیوں کی ساتھ وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

جہانگیر قلی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس شاہراہ پر سفر کر رہا تھا جو شاہراہ دہلی سے نکل کر تھانیسر کے

کافی جنوب میں سرسوتی نام کی ندی کو عبور کرنے کے بعد وہاں سے کچھ آگے جا کر چناب کو پار کرنے کے بعد بصیرہ کی طرف جاتی تھی۔ جس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ سرسوتی نام کی ندی سے ابھی تھوڑا ہی دور تھا کہ اچانک اس نے اپنے گھوڑے کو روک دیا اس کے اس طرح گھوڑا روکنے پر اس کے ساتھی کچھ پریشان اور فکرمند سے ہو گئے تھے کچھ دیر تک جہانگیر قلی بیگ اپنے سامنے غور سے دیکھتا رہا اس کے ایسا کرنے پر اس کے ساتھی بھی سامنے دیکھنے لگے تھے ذرا فاصلے پر ہیولوں کی شکل میں انہیں کچھ سوار کھڑے دکھائی دیے کچھ دیر تک ان کا جائزہ لینے کے بعد آخر جہانگیر قلی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میرے عزیز ساتھیو! شاہراہ پر جو سوار سامنے ہیولوں کی صورت میں دکھائی دے رہے ہیں اگر میرا انداز غلط نہیں تو ہمارے دوست نہیں دشمن ہیں۔ ہماری راہ روکنے کے منتظر ہیں جہاں تک میں ان کا جائزہ لے پایا ہوں وہ چودہ پندرہ سے کم نہیں ہیں ہم سات ہیں شاہراہ پر وہ ہمارا گھیراؤ کرنے کی کوشش کریں گے یہ راہ روکنے والے کون ہیں میں نہیں جانتا لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ ابراہیم لودھی کے آدمی نہیں ہیں۔ ابراہیم لودھی کی فطرت ظالمانہ ہے اگر اس نے ہمارا انجام اس طرح کا کرنا ہوتا تو وہ اپنے قصر میں ہی ہمیں موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم دے سکتا تھا۔''

یہاں تک کہتے کہتے اچانک جہانگیر قلی بیگ پھر رک گیا نیچے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''نیچے اترو، یہ دیکھو ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے پتھر پھیلے ہوئے ہیں ہر کوئی چار چار پتھر اپنے پاس رکھ لے اس کے ساتھ ہی خود بھی جہانگیر قلی بیگ نیچے اترا چار پتھر اس نے بھی لیے دوبارہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا اس کے ساتھیوں نے بھی چار چار پتھر سنبھال لیے تھے جب ایسا ہو چکا تب ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں جہانگیر قلی اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میرے عزیز بھائیو! میں صرف تمہارا سالار ہی نہیں تمہارا محافظ بھی ہوں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی میں تمہاری حفاظت کا سامان کروں گا دیکھو راہ روکنے والے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں چودہ پندرہ سے کم نہیں ہیں جب ہم ان کے سامنے جائیں گے تو یقیناً وہ ہم پر حملہ آور ہوں گے۔

میں جب تم لوگوں کو مخصوص اشارہ دوں گا تو سب سے پہلے تم سب ان کو ہدف بناتے ہوئے ان پر پتھروں کی بارش کر دینا ظاہر ہے سب نشانے خطا تو نہیں جائیں گے کئی کو پتھر لگیں گے اور جب ان میں کچھ پتھر کھا کر گھوڑے سے گریں گے چیخیں چلائیں گے تو اسی وقت جب میں تکبیر بلند کروں گا تو ایک ساتھ ان پر حملہ آور ہوں گے اور کسی کو بچ کر بھاگنے نہیں دیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ رکا اس کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے وہ کہنے لگا۔

عزیز ساتھیو! ان کے قریب جانے کے بعد اپنی تلواروں اور اپنی ڈھالوں کو سنبھال لینا میرا اپنا اندازہ ہے کہ جونہی ہم ان کے سامنے جائیں گے اسی وقت وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے اگر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ان کے سامنے جائیں اسی وقت وہ حملہ کر دیں تو فوراً پتھروں کی بارش شروع کر دینا اس کے بعد دیکھیں گے کہ وہ ہمارا کیا بگاڑتے ہیں جس وقت پتھر پھینکو تو اپنی تلوار اور ڈھال دونوں اپنے ہاتھ میں رکھنا فکرمند نہیں ہونا زندگی میں ایسے حادثات بہت پیش آتے ہیں اور خداوند قدوس نے چاہا تو اس حادثے سے بھی ہم سرخرو ہو کر گزریں گے۔''

جہانگیر قلی بیگ کے ان الفاظ کے جواب میں اس کے سارے ساتھیوں نے ایک عزم اور پختگی کے ساتھ دشمن سے نبٹنے کا عہد کیا اس کے بعد سب نے

کوئی میری بزم ہستی کا عکس جان ہے نہ کوئی چاہتوں کا محور۔ سلطان محترم! میں اپنے جذبوں اپنے احساسات اپنے جسم اپنی جان اور اپنی تنہائیوں کے لمحوں کا واحد مالک ہوں۔ ایک غلام کی حیثیت سے میں سمندر کے تلاطم اور صحرائی طوفانوں کے سے حالات میں پہلے ہی اپنے دامنے کو لہولہو کر چکا ہوں اب نفرت کی چنگاریاں بیزاری کے بگولے اور کرودھ کے سلگتے انگارے مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتے۔ سلطان محترم میں نے بد دیانتی اور بے ایمانی نہیں کی جو پیغام مجھے دیا گیا تھا وہ میں نے ویسے کا ویسا ہی آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا پیغام پہنچانا ایک غلطی اور خطا ہے اور اس کی آپ مجھے سزا دینا چاہتے ہیں تو سلطان محترم میں جہانگیر قلی بڑے برے حالات دیکھ چکا ہوں موت سے نہیں ڈرتا گردن کٹتی ہے تو کٹ جائے پر جو ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی وہ میں اتار چکا ہوں۔''

اس موقع پر ابراہیم لودھی اپنے قریب بیٹھے اپنے کچھ امراء سے صلاح مشورہ کرنے لگا تھا جبکہ جہانگیر قلی اور اس کے ساتھی غور سے اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جہانگیر قلی کے قریب ہی ایک نشست پر ابراہیم لودھی کا وہ سالار بیٹھا تھا جس کا نام قطب خان تھا اور جسے بھیرہ کے نواح میں جہانگیر قلی نے شکست دی تھی۔ قطب خان کے ساتھ ابراہیم لودھی کا نامور سالار احمد خان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس موقع پر احمد خان نے جہانگیر قلی کا بغور جائزہ لیا پھر بڑی دھیمی سرگوشی میں وہ اپنے ساتھ بیٹھے اپنے ساتھی سالار قطب خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''قطب خان ظہیر الدین بابر کا یہ سالار جس کا نام جہانگیر قلی بتایا گیا ہے میں نے اس کا جائزہ لیا ہے یہ مجھے گرم صحرا کے بھاگتے بگولوں میں جرات مندی کی شکتی اور دلیری کا آتش فشاں لگتا ہے۔ طوفانوں میں سرگردہ مٹی کے غبار میں لا جواب تیغ زن دکھائی دیتا ہے اور فکر کے بے سکون سوالوں میں شجاعت کی حرمت لگتا ہے اپنی شخصیت میں بھی خوب ہے دیکھو اس کے نکھرے خدوخال اس کی خوش قامتی سے کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ غلام ہے بلکہ اس کی شخصیت اس کے غلام ہونے کی نفی کرتی ہے۔

ابراہیم لودھی کا سالار احمد خان شاید کچھ اور بھی کہتا کہ چونکنے کے انداز میں وہ خاموش ہو گیا اس لیے کہ ابراہیم لودھی جہانگیر قلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جو پیغام تم نے دیا ہے وہ یقیناً ناقابل برداشت ہے لیکن تم چونکہ سفیر ہو لہٰذا ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کرتے ایک سفیر کی حیثیت سے ہم تمہیں پیشکش کرتے ہیں کہ دہلی میں جتنے دن چاہو آرام کرو اس کے بعد واپس جا کر میری طرف سے ظہیر الدین بابر سے کہنا کہ ہندوستان کی سرزمین کوئی دوکان نہیں ہے جس میں سے جو چیز چاہو مانگ لو۔ میں ان علاقوں کا حکمران ہوں اگر وہ کسی علاقے کا دعوے دار ہوتا ہے تو پھر اس کے اور میرے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی بس یہی پیغام اس تک پہنچا دینا اب میں تمہارے ساتھ اپنا ایک سالار بھیجتا ہوں جو تمہیں شاہی مہمان خانے کی طرف لے جاتا ہے۔''

جواب میں ابراہیم لودھی کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر قلی کہنے لگا۔

''سلطان محترم! آپ کی اس پیشکش کا شکریہ ہم ایک منزل پیچھے پوری طرح آرام کر چکے ہیں سستا چکے ہیں ہم وقت ضائع نہیں کرتے جو پیغام ہم نے آپ تک پہنچانا تھا پہنچا چکے آپ کا جواب بھی مل گیا ہے لہٰذا ہم ابھی اور اسی وقت یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔'' اس موقع پر ابراہیم لودھی نے چند ثانیوں تک بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھا پر انہیں جانے کی اجازت دے دی اس کے ساتھ جہانگیر قلی اپنے ساتھیوں کی ساتھ وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

جہانگیر قلی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس شاہراہ پر سفر کر رہا تھا جو شاہراہ دہلی سے نکل کر تھانیسر کے

کافی جنوب میں سرسوتی نام کی ندی کو عبور کرنے کے بعد وہاں سے کچھ آگے جا کر چناب کو پار کرنے کے بعد بصیرہ کی طرف جاتی تھی۔ جس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ سرسوتی نام کی ندی سے ابھی تھوڑا ہی دور تھا کہ اچانک اس نے اپنے گھوڑے کو روک دیا اس کے اس طرح گھوڑا روکنے پر اس کے ساتھی کچھ پریشان اور فکرمند سے ہو گئے تھے کچھ دیر تک جہانگیر قلی بیگ اپنے سامنے غور سے دیکھتا رہا اس کے ایسا کرنے پر اس کے ساتھی بھی سامنے دیکھنے لگے تھے ذرا فاصلے پر ہیولوں کی شکل میں انہیں کچھ سوار کھڑے دکھائی دیے کچھ دیر تک ان کا جائزہ لینے کے بعد آخر جہانگیر قلی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر انہیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میرے عزیز ساتھیو! شاہراہ پر جو سوار سامنے ہیولوں کی صورت میں دکھائی دے رہے ہیں اگر میرا انداز غلط نہیں تو ہمارے دوست نہیں دشمن ہیں۔ ہماری راہ روکنے کے منتظر ہیں جہاں تک میں ان کا جائزہ لے پایا ہوں وہ چودہ پندرہ سے کم نہیں ہیں ہم سات ہیں شاہراہ پر وہ ہمارا گھیراؤ کرنے کی کوشش کریں گے یہ راہ روکنے والے کون ہیں میں نہیں جانتا لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ ابراہیم لودھی کے آدمی نہیں ہیں۔ ابراہیم لودھی کی فطرت ظالمانہ ہے اگر اس نے ہمارا انجام اس طرح کا کرنا ہوتا تو وہ اپنے قصر میں ہی ہمیں موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم دے سکتا تھا۔''

یہاں تک کہتے کہتے اچانک جہانگیر قلی بیگ پھر رک گیا نیچے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''نیچے اترو، یہ دیکھو ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے پتھر پھیلے ہوئے ہیں ہر کوئی چار چار پتھر اپنے پاس رکھ لے اس کے ساتھ ہی خود بھی جہانگیر قلی بیگ نیچے اترا چار پتھر اس نے بھی لیے دوبارہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا اس کے ساتھیوں نے بھی چار چار پتھر سنبھال لیے تھے جب ایسا ہو چکا تب ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں جہانگیر قلی اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''میرے عزیز بھائیو! میں صرف تمہارا سالار ہی نہیں تمہارا محافظ بھی ہوں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی میں تمہاری حفاظت کا سامان کروں گا دیکھو راہ روکنے والے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں چودہ پندرہ سے کم نہیں ہیں جب ہم ان کے سامنے جائیں گے تو یقیناً وہ ہم پر حملہ آور ہوں گے۔

میں جب تم لوگوں کو مخصوص اشارہ دوں گا تو سب سے پہلے تم سب ان کو ہدف بناتے ہوئے ان پر پتھروں کی بارش کر دینا ظاہر ہے سب نشانے خطا تو نہیں جائیں گے کئی کو پتھر لگیں گے اور جب ان میں کچھ پتھر کھا کر گھوڑے سے گریں گے چیخیں چلائیں گے تو اسی وقت جب میں تکبیر بلند کروں گا تو ایک ساتھ ان پر حملہ آور ہوں گے اور کسی کو بچ کر بھاگنے نہیں دیں گے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد جہانگیر قلی بیگ رکا اس کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے وہ کہنے لگا۔

عزیز ساتھیو! ان کے قریب جانے کے بعد اپنی تلواروں اور اپنی ڈھالوں کو سنبھال لینا میرا اپنا اندازہ ہے کہ جونہی ہم ان کے سامنے جائیں گے اسی وقت وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے اگر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ان کے سامنے جائیں اسی وقت وہ حملہ کر دیں تو فوراً پتھروں کی بارش شروع کر دینا اس کے بعد دیکھیں گے کہ وہ ہمارا کیا بگاڑتے ہیں جس وقت پتھر پھینکو تو اپنی تلوار اور ڈھال دونوں اپنے ہاتھ میں رکھنا فکرمند نہیں ہونا زندگی میں ایسے حادثات بہت پیش آتے ہیں اور خداوند قدوس نے چاہا تو اس حادثے سے بھی ہم سرخرو ہو کر گزریں گے۔''

جہانگیر قلی بیگ کے ان الفاظ کے جواب میں اس کے سارے ساتھیوں نے ایک عزم اور پختگی کے ساتھ دشمن سے نبٹنے کا عہد کیا اس کے بعد سب نے

مبارک باد دیتی ہوں کہ آپ نے راج سنگھ اور اس کے اوباش ساتھیوں کا خاتمہ کیا اب میں اپنے متعلق بتاتی ہوں۔

''میرا نام گوہر کماری ہے۔ میں گوالیار کے ایک پرگنہ دار دیو چند کی بیٹی ہوں۔ یہ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی ہے اور دو محافظ ہیں۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں خوب صورت ہوں اور گوالیار کے راجہ بکرماجیت کی راجکماری رادیکا مجھ سے جلتی ہے خار کھاتی ہے اس لیے کہ گوالیار کی سرزمینوں میں جب کسی خوب صورت لڑکی کا چرچا ہوتا ہے تو لوگ پہلے میرا نام لیتے ہیں پھر راجکماری رادیکا کا اور یہ بات رادیکا کو پسند نہیں کہ گوالیار کی راج دھانی میں خوب صورتی اور حسن میں کوئی لڑکی اس کے مقابل آئے اس لیے وہ مجھ سے دشمنی اور بیر رکھتی ہے۔

گوالیار کے راج محل میں بھی میرے باپ کے کچھ آدمی کام کرتے ہیں چنانچہ رادیکا نے یہ منصوبہ بندی بنائی کہ وہ مجھے اپنے محل میں بلا کر مجھے کسمپرسی کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ یہ راج سنگھ جو آپ کے ہاتھوں مارا گیا ہے اسے اس نے روانہ کیا تھا کہ آپ سے مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی میرے گھر سے نکال کر گوالیار کے راج محل میں لے کے جائے تاکہ مجھے راج کماری رادیکا کے حوالے کیا جائے اس معاملے کی خبر ہمیں کیونکہ پہلے راج محل میں کام کرنے والے ہمارے آدمیوں سے ہو گئی تھی لہٰذا میرے باپ نے دو مسلح جوانوں اور میرے بھائی کو میرے ساتھ کیا اور ہمیں دہلی کی طرف روانہ کر دیا ابھی ہم راستے ہی میں تھے کہ ان لوگوں نے ہمیں آ لیا۔ اب ان کا ارادہ یہ تھا کہ آپ سے نمٹنے کے بعد یہ واپس جائیں گے مجھے اور میرے بھائی کو اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے بھائی کو ہمارے گھر میں چھوڑیں گے اور مجھے گوالیار کے راج محل میں رادیکا کے حوالے کریں گے۔ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے ان پندرہ کو قتل کیا اب ہم آپ کے سپرد ہیں جو چاہیں ہمارے ساتھ سلوک کریں۔''

یہ ساری تفصیل جاننے کے بعد جہانگیر قلی بیگ نے کچھ سوچا پھر گوہر کماری کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

گوہر کماری ہم عورت کی عزت اس کے ناموس کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز خیال کرتے ہیں۔ تم چاروں دہلی میں کس کی طرف رخ کرو گے اور کہاں رہو گے؟''

اس پر گوہر کماری بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

سب سے پہلے تو میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ لوگوں کی طرف سے ہمیں امن مل رہا ہے۔

نیزہ لروں لے بازار میں برہان الدین نام کے ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کے ہاں ہمارا اکثر آنا جانا ہوتا ہے۔ وہ مسلمان ہیں اور میرے باپ کے پرانے اور مخلص ساتھی ہیں۔ میں اپنے بھائی اور ان مسلح ساتھیوں کے ساتھ انہیں کے ہاں جاؤں گی مسلح ساتھی واپس چلے جائیں گے میں اور میرا بھائی اس وقت تک وہیں قیام کریں گے جب تک حالات ہمارے حق میں بہتر نہیں ہو جاتے۔''

گوہر کماری جب خاموش ہوئی تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جہانگیر قلی کہنے لگا۔

''اگر تم لوگ خیال کرتے ہو کہ تم چاروں حفاظت کے ساتھ دہلی جا سکتے ہو تو تم لوگ روانہ ہو سکتے ہو اگر تم اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہو تو دہلی یہاں سے دور نہیں ہے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تم کو وہاں پہنچا کر واپس آ سکتا ہوں۔''

اس پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے گوہر کماری کہنے لگی۔

''آپ کا بڑا شکریہ آپ کی بڑی مہربانی اب ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے ہم لوگ پہلے بھی دہلی کی طرف آتے جاتے رہے ہیں اس پر جہانگیر قلی کہنے لگا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر روانہ ہو جاؤ ہم اپنی منزل کی طرف جاتے ہیں۔''

اس پر گوہر کماری اور اس کے بھائی جگن ناتھ اور دونوں محافظوں نے خوشی کا اظہار کیا اس کے ساتھ ہی جہانگیر قلی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کوچ کیا اور بھیرہ کا رخ کیا جبکہ گوہر کماری اپنے بھائی اور دونوں محافظوں کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

☆☆☆

دہلی کے نیزہ گروں کے بازار سے گزرنے کے بعد پچھواڑے میں ایک حویلی کے دروازے پر گوہر کماری نے دستک دی تھی تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا دروازہ کھولنے والا ڈھلی ہوئی عمر کا ایک شخص تھا جونہی اس نے دروازے پر اپنے گھوڑے کی باگیں پکڑے گوہر کماری اس کے بھائی جگن ناتھ اور اس کے ساتھ ان کے دو محافظوں کو دیکھا تو پشت کی طرف منہ کر کے زور سے پکارنے لگا۔ سلطانہ بیگم سلطان بیگم! قاسم! قاسم! بھاگ کر آؤ دیکھو کون آیا ہے۔''

سلطانہ بیگم شاید اس کی بیوی تھی اور قاسم بیٹا ہوگا چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد حویلی کے اندرونی حصے سے ڈھلی ہوئی عمر کی ایک عورت اور اس کے پیچھے لگ بھگ چودہ پندرہ سال کا لڑکا بھاگتے ہوئے آئے۔ جونہی انہوں نے اپنی حویلی کے دروازے گوہر کماری اور اس کے بھائی جگن ناتھ کو دیکھا سلطانہ بیگم تو بھاگ کر گوہر کماری سے گلے مل گئی تھی۔ اسے پیار کرنے لگی تھی جبکہ قاسم خان بھی بھاگ کر آگے بڑھا اور گوہر کماری کے بھائی جگن ناتھ سے گلے ملنے لگا تھا۔ اس کے بعد خود برہان الدین دونوں بہن بھائی سے ملنے کے بعد ان کے ساتھ آنے والے دونوں محافظوں سے مل رہا تھا۔

برہان سب کو لے کر حویلی میں داخل ہوا سب سے پہلے قاسم خان اور جگن ناتھ دونوں سارے گھوڑوں کو پکڑ کر حویلی کے اصطبل کی طرف لے گئے تھے۔ جگن ناتھ کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اکثر و بیشتر اس حویلی میں آتا رہا ہے جب وہ گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ کر ان کے دانے چارے کا انتظام کر کے اور ان کے ساتھ بندھا ہوا سامان اتار کر واپس آئے تب سب دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے انہیں مشروب پیش کیا گیا اس کے بعد کسی قدر جستجو بھرے اور استفہامیہ سے انداز میں برہان الدین غور سے گوہر کماری کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھا۔

''میری بیٹی! اس بار حسب معمول تم اور جگن ناتھ دونوں اکیلے آئے ہو۔ تمہارا باپ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا خیریت تو ہے اور یہ جو تمہارے ساتھ محافظ آئے ہیں پہلے تو تمہارے ساتھ محافظ نہیں آیا کرتے تھے۔''

برہان الدین کے یہ الفاظ سن کر گوہر کماری ہی نہیں اس کا بھائی جگن ناتھ بھی کسی قدر فکر مند ہوگیا تھا یہاں تک کہ برہان الدین کے پھر پوچھنے پر پورے حالات گوہر کماری نے تفصیل کے ساتھ سنا ڈالے تھے۔

یہ تفصیل جاننے کے بعد برہان الدین اس کی بیوی سلطانہ بیگم اور قاسم خان کچھ دیر تک اداس اور افسردہ بیٹھے رہے پھر دیوان خانے میں برہان الدین کی آواز گونجی تھی۔

''گوہر کماری میری بیٹی یہ راجکماری رادیکا کی زیادتی ہے کہ وہ تم سے بیر رکھے ہوئے ہے حسن اور خوب صورتی دینا میرے رب کی عنایت اور اس کا تحفہ ہے اس کے لیے اس کا شکر ادا کرنا چاہیے نا کہ کسی سے بیر رکھ لیا جائے بہر حال میری بیٹی میں سمجھتا ہوں کہ ظہیر الدین بابر کا سالار جس کا نام تم نے جہانگیر قلی بتایا ہے میں سمجھتا ہوں اس کی بڑی نیکی اور بڑا احسان ہے کہ اس نے تم لوگوں کو محفوظ رکھا اور یہ بھی پیشکش کی کہ وہ تمہیں دہلی تک چھوڑ آتا ہے میری بیٹی وہ ایک انتہا درجہ کا دلیر شجاع جرات مند انسان ہے۔''

برہان الدین کے الفاظ کے جواب میں گوہر کماری نے چونکنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ بابا کیا آپ ظہیر الدین بابر کے سالار جہانگیر قلی خان کو جانتے ہیں؟

جواب میں برہان الدین مسکرایا کہنے لگا۔

''میری بیٹی میں اسے جانتا نہیں مگر دہلی شہر میں اس کی شجاعت اس کی دلیری کے بڑے چرچے ہو گئے ہیں۔ دراصل بابر کی طرف سے وہ ایک سفارت لے کر یہاں آیا تھا اور اس سفارت کا وہ سربراہ تھا سارے شہر میں یہ دھوم مچی ہے کہ اس نے بڑی دلیری جرات مندی کے ساتھ اپنا مقصد ابراہیم لودھی کے سامنے پیش کیا حالانکہ ابراہیم لودھی کی فطرت سے سب واقف ہیں کہ وہ کسی کی معمولی سی بات بھی جو اس کے خلاف ہو برداشت نہیں کرتا سر قلم کر دیتا ہے لیکن اس جہانگیر قلی کے متعلق شہر میں مشہور ہو گیا ہے کہ اس نے ابراہیم لودھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظہیر الدین بابر کا پیغام ابراہیم لودھی تک پہنچایا دراصل ظہیر الدین بابر نے ابراہیم لودھی سے وہ علاقے مانگے ہیں جو ماضی میں ظہیر الدین بابر کے جد امجد تیمور لنگ نے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد حاصل کیے تھے لیکن ابراہیم لودھی نے وہ علاقے دینے سے انکار کر دیا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد برہان الدین رکا پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

''گوہر کماری میری بیٹی! دفع کرو ان معاملات کو ہماری اس سے کیا غرض وغایت اب چلو حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلتے ہیں۔'' اس موقع پر گوہر کماری کے ساتھ آنے والے دونوں محافظوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا پھر ایک برہان الدین کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''محترم برہان الدین ہم دونوں کو اجازت دیجیے اب ہم جاتے ہیں۔''

برہان الدین نے گھورنے کی انداز میں ان کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

''تم کسی اجنبی کے گھر میں نہیں ہو دیکھو گوہر کماری کا باپ جے چند میرا بھائی بنا ہوا ہے یوں سمجھو تم جے چند کے بھائی کے گھر میں آئے ہوئے ہو یہاں دو چار روز قیام کرو ہماری مہمان نوازی سے لطف اٹھاؤ اس کے بعد آرام سے واپس چلے جانا۔''

گوہر کماری نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا لہٰذا اس موقع پر برہان الدین نے جگن ناتھ اور قاسم خان کی طرف دیکھا اور ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

تم اپنے ان دو ساتھیوں کو مہمان خانے کی طرف لے جاؤ اور ان کی ہر آسائش کا اہتمام کرو اور اس کے ساتھ ہی برہان الدین اس کی بیوی سلطانہ بیگم گوہر کماری کو حویلی کے سکونتی حصے کی طرف لے جا رہے تھے۔

جہانگیر قلی بیگ دہلی سے جب بھیرہ پہنچا تو اس کے ساتھی نورنگ خان نے ظہیر الدین بابر کے ایک اور سالار حسین بیگ کے ساتھ بڑا پرتپاک استقبال کیا نورنگ بیگ سے گلے ملنے کے بعد جہانگیر قلی خان حسین بیگ سے گلے ملا پھر بڑی خوش طبعی میں اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''حسین بیگ تم کب آئے؟''

حسین بیگ کے بولنے سے پہلے ہی نورنگ بیگ بول اٹھا۔

''علی قلی میرے بھائی بابر نے حسین بیگ کو بھیرہ کا حاکم بنا کے بھیجا ہے اور ہم دونوں کو واپس بلا لیا ہے حسین بیگ ایک نیا لشکر لے کر آیا ہے جس کے ساتھ یہ یہاں بھیرہ میں قیام کرے گا اور جو لشکر میں اور تم لے کر آئے تھے اس لشکر کو لے کر ہم واپس جائیں گے۔''

علی قلی بیگ نے اس سے اتفاق ہی نہیں خوشی کا اظہار کیا تھا۔ حسین بیگ بقول مورخین بابر کا دودھ شریک بھائی تھا جب اس نے اسے بھیرہ کا حاکم مقرر کیا تو جس روز جہانگیر قلی خان دہلی سے بھیرہ پہنچا اس سے اگلے روز جہانگیر قلی اور نورنگ خان اپنے لشکر کو لے کر بھیرہ سے کابل کی طرف کوچ کر گئے تھے۔

☆☆☆

جہانگیر قلی اور نورنگ جب اپنے لشکر کو لے کر کابل پہنچے تو ظہیر الدین بابر کے حکم پر اس کے برادر نسبتی مہدی خواجہ نے کچھ سالاروں کے ساتھ ان کا

شان دار استقبال کیا اس موقع پر بابر کی بہن خانزادہ بیگم جس نے جہانگیر قلی کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا وہ جہانگیر قلی کے پاس آئی اسے گلے لگایا اس کی پیشانی چومی اور بڑی خوش طبعی میں کہنے لگی۔

''بیٹے بھیرہ کو فتح کر کے تو نے میرا دل خوش کر دیا ہے۔ اب میں سب کے سامنے سر اٹھا کر چل سکتی ہوں کہ میرے بیٹے نے ایک شان دار فتح حاصل کی میرے خیال میں تم تھکے ہارے ہو جا کے آرام کرو۔'' اس کے ساتھ ہی خانزادہ بیگم وہاں سے ہٹ گئی تھی اس کے جانے کے بعد جہانگیر قلی بابر کے برادر نسبتی مہدی خواجہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''محترم خواجہ ابراہیم لودھی اور گوالیار کے راجہ کے متحدہ لشکر سے ٹکرانے کے نتیجے میں ہمارے ہاتھ چار لاکھ شاہ رخی آئی ہیں دراصل شاہ رخی اشرفی کی ایک قسم تھی جو بڑی مہنگی خیال کی جاتی تھی۔

پھر جہانگیر قلی نے اپنے نائب نورنگ بیگ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

نورنگ بیگ جن امانت داروں کے پاس یہ چار لاکھ شاہ رخی ہیں انہیں مہدی خواجہ کے حوالے کرو تم بھی ان کے ساتھ جاؤ تاکہ یہ رقم آغا کے حوالے کی جائے۔

یہ الفاظ سن کر مہدی خواجہ کسی قدر اداس اور افسردہ ہو گیا تھا۔ کچھ سوچا پھر جہانگیر قلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ جہانگیر قلی میرے بیٹے تم بھی میرے ساتھ چلو بچے جب بابر کے سامنے جاؤ تو اپنا چہرہ اپنے خود کے نقاب سے ڈھانپ لینا۔

اس موقع پر جہانگیر قلی کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر مہدی خواجہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''آپ کا کہنا اپنی جگہ درست ہے لیکن آپ میری حیثیت اور میری اوقات سے بھی واقف ہیں آپ جانتے ہیں کہ جنگ میں میرے بابا اور میرے دادا کے مرنے کے بعد مجھے گرفتار کر کے غلام بنایا گیا اس وقت سے لے کر اب تک کیا کسی بھی موقع پر محترم ظہیر الدین بابر نے کبھی بلا کر کہا یا میری طرف یہ پیغام بھیجا کہ تمہاری غلامی کی مدت ختم ہو گئی ہے اب تم آزاد ہو لہٰذا خواجہ میں اب بھی اپنے آپ کو غلام خیال کرتا ہوں۔ میں نے بصیرہ میں جو فتح حاصل کی ہے یہ فتح ایک سالار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک غلام کی حیثیت سے ہے اس لیے کہ غلام کا کام ہے اپنے آقا کی ہر بات کا اتباع کرے۔ اس کے بعد جب مجھے سفارت کاری کے لیے ابراہیم لودھی کی طرف بھیجا گیا تو وہاں بھی میں نے ایک غلام ہی کی حیثیت سے گفتگو کی بلکہ میری بدقسمتی وہاں بھی میرے ساتھ گئی۔ میرے بتانے سے پہلے ہی ابراہیم لودھی کو خبر ہو چلی تھی کہ میرے حالات کیا ہیں اور یہ کہ میں ایک غلام ہوں لہٰذا میری آپ سے استدعا ہے بھیرہ کی فتح ایک سالار کی حیثیت سے میرے نام کوئی معرکہ نہیں آتا یوں جانو یہ ایک غلام نے اپنے آقا کے لیے ایک قرض ادا کیا ہے۔''

جہانگیر قلی کی یہ بات سن کر خواجہ بھی اداس ہو گیا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی موقع پر جہانگیر قلی وہاں سے ہٹا اور ظہیر الدین بابر نے خیموں پر مشتمل جو لشکر گاہ قائم کر رکھی تھی وہاں وہ اپنے خیمے کی طرف چلا گیا تھا۔

☆☆☆

گوالیار کا راجہ بکرماجیت ایک روز اپنے راج محل کے کمرے میں اپنی رانی بھروجہ، راجکماری راد یکا، بیٹا رام نارائن اداس اور افسردہ بیٹھے تھے کہ اس کمرے کے دروازے پر بکرماجیت کا سپہ سالار باس دیو اور اس کا دوسرا بھتیجا اور مرنے والے رائے سنگھ کا چھوٹا بھائی راج سنگھ نمودار ہوئے۔ دروازے پر کھڑے ہی کھڑے بکرماجیت کو تعظیم دینے کے بعد باس دیو مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔

''مہاراج آپ نے مجھے اور راج سنگھ کو بلایا ہے۔''

اداس سے انداز میں جب بکرماجیت نے اپنی گردن ہلائی تب باس دیو آگے بڑھا بکرماجیت کے

کہنے پر وہ دونوں بکرماجیت کے قریب ہی خالی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک کاٹ کھانے والی خاموشی رہی اس کے بعد گفتگو کا آغاز بکرماجیت کرنا ہی چاہتا تھا کہ عین اسی لمحہ اسی کمرے کے دروازے پر باس دیو کی بیٹی رتن دیوی نمودار ہوئی اس کے بولنے سے پہلے ہی بکرماجیت نے اسے اندر آنے کے لیے کہا رتن دیوی اندر گئی اور راج کماری رادیکا کے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

اس کے بعد بکرماجیت پھر بولا اور باس دیو کو پھر مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''باس دیو میں نے تم لوگوں کو ایک انتہائی بری خبر کے لیے بلایا ہے تھوڑی دیر پہلے میرے مخبروں نے یہ اطلاع دی ہے کہ تمہارا بھتیجا راے نگھ اپنے سارے ساتھیوں کے ساتھ سرسوتی ندی کے قریب مارا جا چکا ہے ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔''

یہ خبر سن کر رتن دیوی رونے لگی تھی۔ راج دیوی کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ باس دیو کی گردن جھک گئی تھی کچھ دیر ایسا ہی کاٹ کھانے والا سماں رہا یہاں تک کہ باس دیو نے اپنے آپ کو سنبھالا راج سنگھ اور رتن دیوی بھی اپنے آپ کو سنبھال چکے تھے یہاں تک کہ باس دیو راجہ بکرماجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''مہاراج ہمارے مخبروں نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ بابر کا سالار جہانگیر قلی بیگ صرف چھ ساتھیوں کے ساتھ سفارت لے کر ابراہیم لودھی کی طرف آئے گا۔ وہ ابراہیم لودھی کو بابر کا کوئی پیغام دینا چاہتا تھا میرا بھتیجا اس کے مقابلے پر اپنے صرف دس ساتھی لے جانا چاہتا تھا لیکن آپ کے کہنے پر اضافہ کر کے مسلح ساتھیوں کی تعداد پندرہ کر دی گئی مہاراج یہ کیسے ممکن ہے کہ ظہیر الدین بابر کا وہ سالار اپنے صرف چھ ساتھیوں کے ساتھ ہمارے پندرہ جنگجوؤں پر غالب آجائے اور سب کو قتل کر کے خیریت کے ساتھ واپس بھیرہ کی طرف نکل جائے۔''

باس دیو جب خاموش ہوا تب دکھ بھرے انداز میں بکرماجیت بولا اور کہنے لگا۔

''باس دیو ایسا ہی ہوا ہے ہمارے پندرہ جنگجوؤں کا خاتمہ کر کے وہ بھیرہ گیا اور بھیرہ سے وہ اپنے لشکر کو لے کر کابل کی طرف جا چکا ہے۔ بھیرہ پر اب بابر نے اپنے ایک عزیز حسین بیگ کو حاکم مقرر کیا ہے۔''

راجہ بکرماجیت جب رکا تب بے پناہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے رتن دیوی بول اٹھی۔

''رائے سنگھ میرا منسوب میرا منگیتر تھا اس سے پہلے بابر کے اس سالار نے جنگ کے دوران میرے بھائی کو موت کے گھاٹ اتارا اور اب اس نے میرے منسوب کو قتل کیا ہے میں آج سب کے سامنے عہد کرتی ہوں کہ جب تک اس جہانگیر قلی کی گردن نہیں کاٹ لیتی اس وقت تک شادی نہیں کروں گی۔''

رتن دیوی جب خاموش ہوئی تب مرنے والے رائے سنگھ کا بھائی راج سنگھ بھی بے پناہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں بھی آج سے عہد کرتا ہوں کہ جب تک ظہیر الدین بابر کے اس سالار جہانگیر قلی بیگ کی گردن نہیں کٹتی اس وقت تک میں اپنے تن پر کوئی نیا لباس نہیں پہنوں گا میں اب مہاراج آپ کے مہیا کردہ جاسوسوں کی مدد سے چاہوں گا کہ اس جہانگیر قلی پر گہری نگاہ رکھی جائے جب یہ کبھی ہندوستان کی مہم پر آیا تو میں اس کی گردن ضرور کاٹوں گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد راج سنگھ رکا کچھ سوچا دوبارہ وہ راجہ بکرماجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''مہاراج! ایک نہ ایک روز یہ بابر ہندوستان پر حملہ آور ضرور ہوگا اس لیے کہ خود رانا سانگا نے اسے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی ہے اور ساتھ ہی آج کل اس رانا سانگا نے ظہیر الدین بابر کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی قائم کر رکھے ہیں یہ رانا سانگا کی حماقت اور بے

لی ہے۔

رانا سانگا یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے جو ظہیر الدین بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی ہے تو بابر ہندوستان میں صرف ابراہیم لودھی پر حملہ آور ہوگا اور اس کی حکومت کا خاتمہ کرے گا اور کیونکہ وہ برفانی علاقے کا رہنے والا ہے لہٰذا زیادہ دن یہاں رک نہیں پائے گا واپس چلا جائے گا اور اس کی واپسی کے بعد ہندوستان پر کوئی بھی طاقت اور قوت رانا سانگا کا مقابلہ نہ کر سکے گی اور رانا سانگا پورے ہندوستان کا ایک طرح سے راجہ بن جائے گا اس لیے کہ ابراہیم لودھی کے مارے جانے کے بعد کوئی بھی قوت اس کے آڑے نہیں آئے گی۔''

راج سنگھ جب خاموش ہوا تو پہلی بار راجکماری رادیکا بولی اور کہنے لگی۔

''ظہیر الدین بابر کے اس سالار جہانگیر قلی کا قتل اب ہم لوگوں کے لیے انتہائی ضروری ہو چکا ہے اس کے قتل سے ہی ہم سب کے من کو چین اور اطمینان نصیب ہو گا۔'' راج کماری رادیکا جب خاموش ہوئی تب دھیمے سے لہجے میں جس میں دکھ اور افسردگی تھی راجہ بکرماجیت بولا اور کہنے لگا۔

''باس دیو میں آج ہی اپنے کچھ مخبر مقرر کروں گا جو بابر کے سالار پر اس وقت نگاہ رکھیں گے جب وہ ہندوستان میں داخل ہو گا اور کسی مناسب موقع پر راج سنگھ کو مسلح جوان مہیا کریں گے اور اس وقت اس پر حملہ کیا جائے گا جب وہ مزاحمت کرنے کی حالت میں نہیں ہو گا اور ہم آسانی سے اس کی گردن کاٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے میرے خیال میں اب تم سب لوگ جاؤ جا کے آرام کرو۔''

اس کے ساتھ ہی باس دیو اس کا بھتیجا راج سنگھ اور بیٹی رتن دیوی وہاں سے اٹھ کر نکل گئے تھے۔

(جاری ہے)

اچھی باتیں

☆ ہر آدمی کی رائے اس کے ذاتی تجربے کے مطابق ہوتی ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ پر اُمیدی سے سفر کرنا جلدی پہنچنے سے بہتر ہے۔ (سر جیمز جیسن)

☆ اگر تم چاہو تو اپنے خیالات کو بدل کر زندگی بہتر بنا سکتے ہو۔ (آسکر وائلڈ)

☆ زندگی کی خوشیاں ہمارے خیالوں پر منحصر ہیں۔ (کنفیوشس)

☆ وہ محبت یقیناً عظیم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی عزت پر مبنی ہو۔ (جانسن)

☆ تکلیف اُٹھانا اتنا تکلیف دہ فعل نہیں' جتنا ذلت اُٹھانا تکلیف دہ عمل ہے۔

☆ چرب زبان آدمی جتنی جلدی دل میں اُترتا ہے اتنی ہی جلدی دل سے اُترتا بھی ہے۔

☆ تم اللہ تعالیٰ کے ذکر میں دل لگا لو سکون و اطمینان تم میں دل لگا لیں گے۔

☆ بعض لوگ خطرناک ہوتے ہیں پر چالاک نہیں ہوتے لیکن جو چالاک ہوتے ہیں' وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

☆ ایک طرف دھیان لگانے کے لیے دوسری طرف سے دھیان ہٹانا لازمی ہے۔

☆ دنیا میں دل لگانا اسی طرح بیکار ہے جس طرح اندھے کا اپنے ساتھ روشنی رکھنا۔

☆ کسی بھی مقام کے اونچے شجر پر ہم خوش کلامی کی سیڑھی کے ذریعے چڑھ سکتے ہیں مگر بدکلامی کی معمولی سی لغزش سے ہم دھڑام سے نیچے بھی گر سکتے ہیں۔

گیت مرگ

ایم الیاس

آپ وقتاً فوقتاً عمران ڈائجسٹ کے ان صفحات پر جاسوسی، معاشرتی، سنسنی خیز اور دل چسپ کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ یوں تو ہر کہانی اپنی جگہ لکھنے والوں کی بہترین کاوش ہوتی ہے۔ آپ نے ایم الیاس کی کہانیاں ہر نئے اور اچھوتے موضوع پر پڑھی ہیں۔ یہ بھی ان کی ایک اچھوتی، سنسنی خیز اور پراسرار طویل کہانی ہے۔ دل کو چھو لینے والی ایسی گداز اور متاثر کہانیاں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ قدم قدم پر چونکا دینے اور تجسس اور اشتیاق آمیز کہانیاں بہت کم آپ کی نظر سے گزری ہوں گی۔ ایسی کہانیوں کی نہ صرف کمی بلکہ فقدان بھی ہے۔ اس کہانی کے متعلق مزید کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہانی کی ہر سطر نہایت متاثر کر رہی ہے۔ اس کہانی کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے یہ کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے اس کی روانی اور واقعات میں [illegible] آپ کی توجہ برقرار رکھے گی۔ جب آپ اس کے اختتام کو پہنچیں گے تو یہ سمجھیے کہ اس کا انجام آپ کو ہلا کر رکھ دے گا اور آپ صدمے اور سکتے میں آجائیں گے۔ ایک پولیس آفیسر باپ تھا لیکن اس نے اپنی فرض شناسی سے اپنی وردی کی لاج رکھی۔ یہ کہانی اس قدر متاثر کن ہے کہ جو آپ کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے گی (مدیر)

ایک شاہکار کہانی جو نذر قارئین ہے

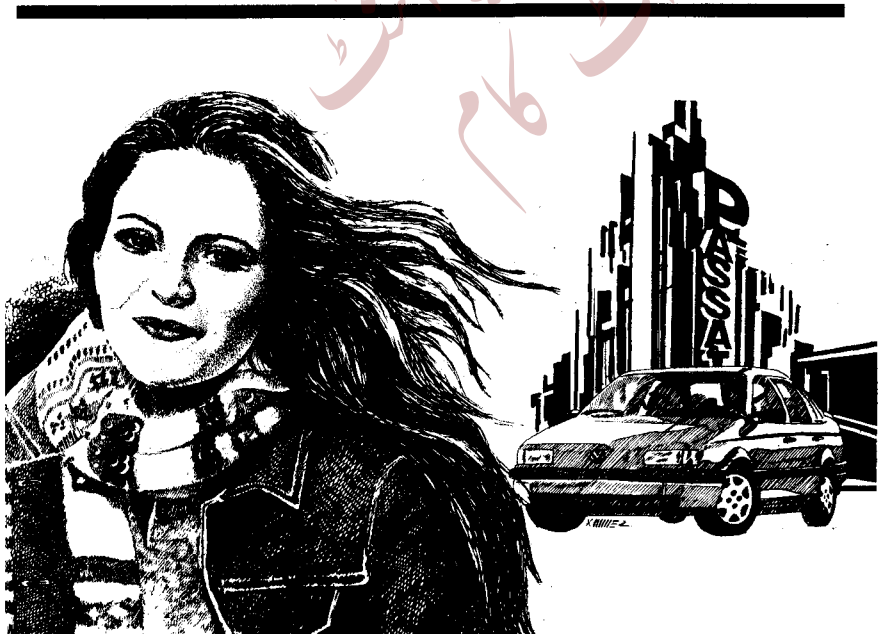

سینکڑوں میل دور سے آنے والی شور مچاتی ٹرین جنگل میں گم ہوگئی تو اسے یوں لگا جیسے وہ کسی غیر آباد سیارے پر قدم رکھنے والا پہلا آدمی ہو۔ گو ٹرین نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی تو ہوگئی تھی لیکن انجن کی آواز سنائی دیتے دیتے معدوم ہوگئی تھی۔

نادیدہ اور نامعلوم دشمنوں کے قاتلانہ حملے سے جاں بر ہونے اور تین ماہ تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ صحت یاب تو ہوگیا تھا مگر اس کے اعصاب پر ذہنی صدمے کا اثر باقی تھا۔

اس کے دوست انیل کپور نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ جسمانی اور ذہنی طور پر مکمل صحت یاب ہونا چاہتا ہے تو چاند نگر چلا جائے۔ یہ ایک دور دراز قصبہ ہے لیکن وہ ایک پرفضا مقام ہے۔ وہاں کا موسم ہر وقت معتدل رہتا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی بڑے خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔۔۔ لیکن وہاں ہر وہ سہولت موجود ہے جس کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔ ہوٹل اور شراب خانے بھی ہیں۔ اسے جدید ترین بنانے میں کوئی کسر اس لیے نہیں اٹھا رکھی ہوئی تھی کہ ایک تو تعلیم یافتہ لوگ ہیں بلکہ اکثریت وطن سے باہر ملازمت کر کے امریکی ڈالر، پونڈ، دینار اور ریال اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں اور پھر وہاں بڑی رونق حسن اور کشش اور دل کشی بھی ہے۔ اس چھوٹے مگر جدید ترین قصبے کی پر بہار فضا ضرور راس آئے گی۔ شملہ، کشمیر، بنگلور اور میسور میں اخراجات بہت ہوں گے۔ تمہاری جیب یہاں کے اخراجات کی متحمل ہو جائے گی۔

پھر اس نے اپنے دوست انیل کپور کو نہ صرف لعن طعن کیا بلکہ اس سے زیادہ اپنے دل کو کوسا کہ اس نے آنکھیں بند کر کے اس مشورے کو قبول کیا تھا۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پھر اس نے آبادی سے اتنی دور اسٹیشن بنانے والوں کو خوب گالیاں دیں۔ یہ ایک ویران اور سنسان جگہ تھی۔ انتظامیہ کی شان میں لمبا چوڑا قصیدہ پڑھنے پر مجبور ہوگیا تھا جو صرف ایک نامکمل فرد پر مشتمل تھی۔ جو ہاتھ کا اشارہ کرنے کے بعد لنگڑاتا ہوا دوسری سمت کے جنگل میں روپوش ہو چکا تھا۔

ریلوے لائن عبور کر کے وہ اس امید پر سرسبز میدان میں سو پچاس قدم تک نظر آنے والی پگ ڈنڈی پر ہولیا کہ یہی راستہ چاند نگر پہنچا دے گا۔ کیا وہ واقعی چاند پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے قیاس کیا کہ وہ شاید فرلانگ بھر دور گھنے درختوں کے پیچھے نظر سے اوجھل تھا۔ حالانکہ ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب اس سمت چلنے کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ تک مسافت طے کرنے کے بعد اس کا خیال درست ثابت ہوا۔

جنگل کے سکوت میں پرندوں کی صدا تک نہیں تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک بھی کوئی سا بھی پرندہ دکھائی نہیں دیا۔ کیوں کہ یہ جنگل تھا۔ یہ کوئی جدید ترین قسم کا علاقہ نہ تھا۔ بندر جو ہندوستان کے ہر ویرانے میں اور آبادی میں بھی ہوتے تھے۔ وہ بھی دکھائی نہ دیا۔ چنانچہ وہ کسی کے منہ سے سیٹی بجانے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔

سیٹی بجانے والا دائیں طرف سے نمودار تھا۔ تقریباً چالیس برس کا بھکاری نظر آنے والا دیوانہ سا شخص تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور غلیظ ہی نہیں مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کے سر کے بالوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔

وہ ایک مشہور فلمی گانے کے بول شروع کرتا۔۔۔ تیسرے مصرعے تک پہنچتا اور پھر پہلے مصرعے کے بول دوہرانے لگتا تھا۔ ہموار زمین پر راستہ صاف ہونے کے باوجود وہ لہراتا ہوا چل رہا تھا۔۔۔ اگر وہ بچہ ہوتا یا نشے میں دھت ہوتا تو الگ بات تھی۔۔۔ مگر اس حلیے میں یہ احمقانہ حرکت تھی۔ محض دیوانگی کی ہی علامت تھی۔

ونود اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ اپنی ہی دھن میں مگن نظر اٹھا کے ونود کو دیکھے بغیر گزرنے لگا تو ونود مجبوراً اسے مخاطب کرنا پڑا۔

''اوہ مسٹر۔۔۔ یہ چاند نگر قصبہ ہی ہے نا۔۔۔؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مسز سادھنا کا گیسٹ ہاؤس کس

طرف ہے۔'' نوود نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔'' وہ پرمسرت لہجے میں فخر سے سر اٹھا کے بولا۔ نوود کی آواز پر وہ لہرانا اور سیٹی بجانا تو بھول گیا۔۔۔ مگر چونکا نہیں تھا۔

''ہاں کا کیا مطلب ہوا۔۔۔'' نوود نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد چڑ کے کہا۔ ''بتاتے کیوں نہیں ہو؟''

''مگر تم نے تو بتانے کی بات ہی نہیں کی تھی۔'' وہ حیرانی سے بولا۔ ''کیا تمہیں نہیں معلوم۔۔؟ بڑی عجیب سی بات ہے۔ حیرت کی بات ہے۔''

''نہیں۔۔۔'' نوود نے ضبط سے کام لیا۔ کیوں کہ اس نے بڑی بے تکی کہی تھی۔ اگر وہ جانتا ہوتا تو اس احمق سے پوچھتا ہی کیوں۔ ''میں دہلی سے آیا ہوں۔۔۔ پہلی بار۔۔۔ مجھے اس گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنا ہے۔ تم تو بتاؤ بڑی دیا ہوگی۔''

''اچھا۔۔۔ اچھا۔'' وہ سر ہلا کے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔۔۔ ناک کی سیدھ چلے جاؤ۔ آگے دائیں طرف کا چوتھا مکان ہے۔۔۔ مگر سنو! لیکن تم وہاں کیوں اور کس لیے قیام کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟''

پھر اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر پراسرار انداز سے سرگوشی۔

''اور کیا کروں۔۔۔'' نوود نے بھنا کر کہا۔ ''کیا اور بھی کوئی اچھی جگہ ہے اس کے علاوہ۔'' اس شخص نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔

''جگہ تو کوئی اور نہیں ہے۔۔۔ مگر وہاں بھی تم خطرے میں آجاؤ گے۔۔۔ مجبوری ہے۔ اچھا تو جاؤ۔'' کچھ رک کر اس نے پھر سر ہلایا اور پھر دائیں بائیں لہراتا سیٹی بجاتا ہوا چل دیا۔

نوود کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے طے کیا کہ ہے ایک مخبوط الحواس شخص کی بات سمجھنے کی کوشش بھی وقت ہے۔ لیکن گاؤں میں سب ایسے ہی تو یہاں سکون کیا خاک ملے گا۔ واپسی پر اس کا بھی حال ہوگا۔ اگر اسے یہ قصبہ راس نہیں آیا تو پھر اسے واپس جانا ہوگا۔ اسے لینے کے دینے پڑیں گے شاید۔۔۔ اس نے قدم بڑھائے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

لیکن صرف دو منٹ کے بعد ہی اسے اپنا یہ خیال اور فیصلہ بدلنا پڑا۔

کچے راستے سے ہٹ کر ایک مختصر سی جھیل کے کنارے ایک نوجوان لڑکی رنگوں سے ایک قدرتی منظر کو کینوس پر اتار رہی تھی اور اپنے گرد و پیش سے غافل ہوگئی تھی اس منظر کو اتارتے ہوئے۔

نوود رک گیا۔ ناقدانہ نظروں اور غور کرنے پر اسے احساس ہوا کہ صرف لڑکی ہی نہیں بلکہ منظر بھی نہایت حسین ہے۔

مثلاً گلوں کا رنگ فرشِ خاک پر ہی نہیں بلکہ مصور کے لب و رخسار میں بھی جھلک رہا ہے۔

آسمان کی نیلاہٹ صرف جھیل ہی میں نہیں۔۔۔ بلکہ مصور کی آنکھوں میں بھی افق تا افق ہے۔ شفق کا سبز اجالا صرف بکھرے ہوئے بادلوں ہی میں نہیں بلکہ اس کے بکھرے ریشمی بالوں میں بھی ہے اور بہار کی تازگی صرف فضا میں ہی نہیں اس کے شباب میں بھی ہے۔ قدرت نے اس کے چہرے پر ایک نکھار پیدا کر کے اسے دل کش اور دل فریب نظارہ بنا دیا ہے۔

''ہیلو۔۔۔'' وہ اس کی محویت پر مسکرائی۔ پھر شوخی سے بولی۔ ''آپ ضرورت سے زیادہ حیران ہو رہے ہیں۔۔۔ جیسے مجھے پہلی بار اس طرح دیکھ رہے ہیں۔۔۔ جیسے میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی مخلوق ہوں۔''

اس کی مترنم آواز سن کر نوود محویت سے چونک پڑا اور گڑبڑا سا گیا۔

''ہاں۔۔۔ دراصل میں۔۔۔ میں ابھی دہلی سے آیا ہوں۔ ڈاکٹروں نے مجھے آرام کرنے کے لیے زبردستی یہاں بھیجا ہے۔'' وہ ایک بار نوود کو غور سے دیکھ کر کینوس میں رنگ بھرنے لگی۔

''آئی تو میں بھی دہلی سے ہوں۔۔۔ لیکن

مصوری کے لیے۔۔۔ مجھے تو یہاں آکر دیکھنے پر ایسا لگا کہ کائنات کا سارا حسن یہیں سمٹ آیا ہے۔''

''مجھے ایسا لگتا ہے۔۔۔ آپ مصورہ بھی ہیں اور شاعرہ بھی۔'' ونود نے سر کھجا کے کہا۔ ''چند لمحوں پہلے میرا خیال تھا کہ یہاں صرف دیوانے بستے ہیں۔'' وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی بھی بڑی دلکش اور مترنم تھی۔

''آپ کو شاید پرشاد ملا ہوگا۔۔۔ وہ ابھی یہاں سے گزرا تھا۔۔۔ سیٹی بجاتا ہوا۔۔۔

چاند کا اک شہزادہ تھا۔۔۔
ایک زمین کی شہزادی۔۔۔
ایک دن شہزادی نے کہا۔

پھر اس کی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آگے وہ بھول چکا ہے۔۔۔ صرف یہی یاد رہ گیا ہے اسے۔۔۔ اس کی سیٹی ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔''

''آپ نے مجھے اس کے گیت کے بول یاد دلا دیے۔'' ونود نے اعتراف کیا۔ ''وہ پاگل ہے نا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ بس تھوڑا سا کریک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر بچوں کی طرح بے ضرر حرکتیں بھی بچوں جیسی ہی کرتا ہے۔۔۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ذہنی طور پر پس ماندہ ہے۔۔۔ بعض کا خیال ہے کہ بنتا ہے۔۔۔ اندر سے بڑا گہرا ہے۔۔۔ بعض کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی ایسی عقل کی بات کہہ جاتا ہے سب کو حیران کر دیتا اور انہیں یقین نہیں آتا کہ اس قدر عقل مند بھی ہے۔۔۔ رہتا تو فقیروں کی طرح لیکن بھیک نہیں مانگتا۔۔۔ پس جو کسی نے دے دیا کھا لیا۔۔۔ لے لیا۔۔۔ یوں سمجھیں کہ مجذوب ہے یا جو چاہیں سمجھیں۔''

''میرا نام ونود سنگھ ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''اس نے اس پاگل کا ذکر ختم کر کے موضوع بدلا۔ ''میں مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کروں گا۔''

''میرا نام پدمنی ہے۔۔۔ پدمنی سیواگ۔۔۔ سیدھے ہاتھ پر چوتھا مکان ہے۔'' وہ نظر اٹھائے بولی۔ ''گڈ بائی۔''

''پھر ملاقات ہوگی۔'' ونود نے اخلاقاً کہا اور اس مکان کی سمت چل پڑا۔ لیکن اس نے تسلیم کیا کہ یہ اس کے دل کی آواز تھی۔

پچاس برس کی دبلی پتلی مسز سادھنا اسے اپنے چار کمروں کے گیٹ کے باہر ہی مل گئی۔

وہ خاصی پریشان اور کسی کے انتظار میں تھی۔ ونود کے تعارف پر وہ رسماً مسکرائی۔ پھر اس نے کھلے دروازے کی طرف منہ کر کے چیخ ماری۔

''اینا۔۔۔!'' اس کے جواب میں ریل کے اسٹیم انجن کی سیٹی کی سنائی دی۔

پھر اسٹیم انجن نمودار ہوا جس کا نام اینا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا۔

ونود نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ جسامت اور وزن کی سیاہ فام عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ مدراسن دیہاتن تھی شاید۔۔۔ اس نے ونود کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور آگے آگے چلتی ہوئی زینے پر چڑھنے لگی۔ زینہ خاصا پرانا چنانچہ مضبوط تھا۔ ٹھیکے پر بنی ہوئی عمارت ہوتی تو۔۔۔ خیر۔۔۔ اسے دہشت زدہ کر دینے والے خیالات سے گریز کرنا چاہیے۔۔۔ ونود نے خود کو سمجھایا۔

کیوں کہ وہ یہاں سکون اور آرام کے لیے آیا ہے۔ اینا نے کمرے کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہانپتے ہوئے ونود پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ہر سیوا کے لیے حاضر ہے۔ مگر اسے حقیر ملازمہ نہ تصور کیا جائے۔ اس کا تعلق ایک اچھے خاندان سے ہے۔ مالی حالات اور تنگ دستی نے اسے ملازمت پر مجبور کیا اور مزید یہ کہ جب گھنٹا بجے تو ونود کو سمجھ لینا چاہیے کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے اور تاخیر کا مطلب یہ ہوگا فاقہ۔۔۔

جب بالآخر وہ اپنی کئی بار سنائی ہوئی تقریر سنا کر رخصت ہوئی تو ونود نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اس کا خیال تھا کہ یہ باتونی جانے کب تک اسے بور کرتی رہے گی۔

ابھی اس نے غسل سے فراغت پا کر لباس بدلنے کا سلسلہ شروع ہی کیا تھا کہ گھنٹے کی زبردست گونج نے اسے دہلا دیا۔

وہ سمجھ گیا کہ اس بے پناہ قوت سے گھنٹے پر وار کرنے والی خادمہ ہی ہو سکتی ہے۔ مالکن پورا زور صرف کرتی تو گھنٹہ اتنا نہ چلاتا۔۔۔ وارننگ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ونود نے بڑی عجلت میں نیچے کا رخ کیا۔۔۔ کیوں کہ وہ تفریح کا آغاز فاقہ سے کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میز کے گرد چھ کرسیاں تھیں۔ دو پر مالکن اور خادمہ بیٹھی ہوئی تھیں اور ان میں جو فرق تھا وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دن تھی تو دوسرے سیاہ رات ۔۔۔ ایک تنکا تھی تو دوسری پہاڑ۔

مالکن بدستور متفکر اور پریشان تھی۔۔۔ خادمہ نے ونود کو بتایا کہ تشویش کا سبب مسٹر سوراج کی عدم موجودگی ہے جو گزشتہ رات سے پراسرار طور پر غائب ہیں۔ سوراج کے بارے میں کھانے کے دوران مالکن نے مزید انکشاف کیا۔

مثلاً یہ کہ گیسٹ ہاؤس میں وہ کئی برس سے مقیم ہیں کیوں کہ دنیا میں نہ تو اس کا کوئی ہے اور نہ ہی ۔۔۔ اور یہ کہ بغیر بتائے وہ اس طرح آج تک نہیں گیا۔۔۔ گھومنے پھرنے کا شکار کا ۔۔۔ نے میں بیٹھ کر پینے پلانے اور شغل ۔۔۔ جوئے خانے میں لٹنے لٹانے۔۔۔ یا ۔۔۔ کے عشق میں خوار ہونے کا اسے قطعی شوق ۔۔۔ وہ خلوت پسند اور اپنا بیشتر وقت کمرے ۔۔۔ سننے اور مطالعے میں وقت گزارنے والا ۔۔۔ بوڑھا آدمی ہے جس کا دل بیمار قطعی ۔۔۔ بیمار ہے۔ چنانچہ ایشور خیر کرے۔۔۔ وہ ۔۔۔ میں کسی سے بھی تلخی اور نفرت سے پیش نہیں

۔۔۔ نے محسوس کیا لوگ دور افتادہ دیہات کے ۔۔۔ خوش فہمی کا شکار ہیں۔۔۔ تفکرات ہر جگہ ۔۔۔ پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر شخص اپنے حالات اور مسائل کا شکار ہے۔ یہ سب ہر جگہ موجود ہیں اور سکون آسمان پر ہو تو زمین پر نایاب ہے۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد اس نے مرد واحد کی حیثیت سے خوف زدہ خواتین کے گھر کے اوپر نیچے تمام کمروں میں مسٹر سوراج کو یوں تلاش کرنا شروع کیا جیسے وہ سوئی ہوں جو کہیں بھی فرش پر پڑی ہوئی مل سکتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں انہیں گھر کے آس پاس اور تیسرے مرحلے میں گاؤں کے اندر یا باہر ڈھونڈنا تھا مگر تلاش پہلے ہی مرحلے میں تمام ہو گئی۔

ونود نے اوپر کی منزل کے اسٹور روم میں مسٹر سوراج کو دریافت کر لیا تھا۔

اس حالت میں کہ وہ چھت سے معلق تھے۔ اس کا پھندا ان کے گلے میں تھا۔ ایک کرسی جس پر چڑھ کے انہوں نے یہ پھندا اپنے گلے میں ڈالا ہوگا فرش پر اوندھی پڑی ہوئی تھی اور مسٹر سوراج جو قد میں کم تھے۔۔۔ فرش سے تین فٹ اوپر جھول رہے تھے۔
اسٹیم انجن کی زبردست سیٹی کے بعد اور مالکن کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔ لیکن ونود نے ایشور کا شکریہ ادا کیا کہ ان میں سے کسی کو بے ہوش ہونے کا خیال نہیں آیا۔ ورنہ اس کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

وہ لاش کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مسٹر سوراج نے کرسی پر چڑھ کے پھندا گلے میں ڈالنے کے بعد لات مار کے کرسی نہیں گرائی۔۔۔ کسی نے ان کو مار کے لٹکا دیا تھا۔ ان کے لیے لات مار کے کرسی گرانا بالکل ناممکن تھا۔ جب ونود نے کرسی کو سیدھا کر کے عین مسٹر سوراج کے نیچے کرسی کو رکھا تو اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اگر ان کے پیر کرسی پر رہتے تو وہ لٹک کے مر نہیں سکتے تھے اور اگر لٹک جاتے تو اس کرسی کو کیسے گراتے جواب بھی ان کے پیروں سے چند انچ نیچے تھی۔

دہلی ہو یا چاند نگر۔۔۔ ونود نے تلخی سے سوچا۔
تصور میں آرام اور تفریح نہ ہو تو کہیں آنے جانے

سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ چھوٹا گاؤں۔۔۔ پر بہار فضا۔۔۔ پرسکون ماحول۔۔۔ یہ سب خوب صورت دھوکا دینے والے الفاظ ہیں۔۔۔ اسے دھوکا تو الفاظ کا اس پاگل نے بھی دینا چاہا تھا جو چاند نگر میں قدم رکھتے ہی ایسے ملا تھا۔ جس نے دیوانگی میں ایک ایسی بات کہہ دی تھی جواب حقیقت بن کے سامنے آ چکی تھی۔

اس نے کتنے ہی پراسرار انداز میں کہا تھا۔ ''وہاں تم بھی چکر میں آ جاؤ گے۔۔۔ جاؤ۔''

کیوں اس نے یہ بات کہی تھی۔۔۔ اسے کیسے معلوم ہو چکا تھا کہ مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کرنے والا چکر میں پڑ جائے گا۔ جب کہ خود مسز سادھنا کو خبر نہیں تھی۔

ونود نے مسز سادھنا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بلا تاخیر پولیس کو طلب کرے اور خود کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگائے۔ پھر وہ باہر نکل آیا۔ اسٹور روم اوپر والی منزل کے شمالی کونے پر تھا اور اس کی کھڑکیاں دونوں طرف کھلتی تھیں۔ ونود نے پہلے شمال کی طرف سے کھڑکی میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ زمین پر لیٹ کے۔۔۔ بیٹھ کر اور آس پاس کے درختوں پر چڑھ کے کمرے کے ہر رخ اور ہر زاویے سے دیکھا مگر جھولتی ہوئی لاش تو درکنار اس کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ یہی صورت حال مغرب کی جانب تھی۔ باہر سے کوئی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا کہ کمرے میں ایک لاش جھول رہی ہے۔

پھر اس کریک نے کیسے اتنے یقین کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ وہ چکر میں آ جائے گا۔''

سنیاسی یا مجذوب۔۔۔ جو چاہے سمجھ لو۔'' پدمنی نے کہا تھا۔ ''بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاگل ہے۔۔۔ نہیں بنتا ہے۔''

ونود کے لیے اس کے رویے اور الفاظ کا کوئی اور مطلب نکالنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس کارٹون نے یقیناً کچھ دیکھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا اور کیسے۔۔۔ ''خیر حقیقت پر دیوانگی کا پردہ ہوگا تو بہت جلد ہٹ جائے گا مسٹر کارٹون!'' اس نے گھر کے اندر لوٹتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

کرشن آدھے گھنٹے کے بعد جائے واردات پر وارد ہوا۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے معمولی سے پولیس آفیسر نے بڑے افسوس کے ساتھ ونود سے مصافحہ کیا۔ افسوس کی ایک بات یہ تھی کہ ونود سیدھے سادھے خودکشی کے کیس کو قتل کا کیس بنانے پر مصر تھا۔۔۔ دوسری افسوسناک بات ونود دہلی کے پولیس کے محکمے میں ایس پی کے عہدے پر فائز تھا۔ سراغ رساں بھی سینئر تھا۔ جس کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید کہ ونود نے صرف ایک فیتہ لے کر دو اور دو کو چار ثابت کر دیا تھا

مسٹر سوراج کا قد۔۔۔ چھت سے فرش کا فاصلہ۔۔۔ فرش سے سورج کا فاصلہ۔۔۔ کرسی کی بلندی۔۔۔ اور مسٹر سوراج کے پیروں کا فاصلہ کرسی سے۔۔۔ چاند نگر کے چیف کی اہمیت اپنے بدتمیز ماتحت اور اپنی رعایا کی نظروں میں گم ہونے لگی تھی۔ مگر مصالحت میں بہتری تھی۔

''مسٹر ونود۔۔۔! میرا نام کرشن ہے۔'' اس نے خوش دلی سے مصافحہ کیا۔ ''اس کیس میں ہمارا اشتراک فائدہ مند رہے گا۔''

اس نے اشتراک کا لفظ استعمال کر کے اپنا وقار بحال رکھا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ پلیز۔۔۔! میری مدد کریں۔۔۔ یا آپ کی مدد مجھ پر ایسا احساس ہوگی جسے میں عمر بھر بھلا نہیں سکوں گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے لہجے کی پشت پر التجا ضرور تھی۔

لیکن اس معاہدے کے باوجود ونود نے پرشاد کی بات گول کر دی تھی۔ کیوں کہ ابھی وہ اس گاؤں میں اجنبی تھا اور ذاتی طور پر تصدیق کیے بغیر کسی پر شبہے کا اظہار بھی رائے عامہ کو اپنے خلاف کرنے کے مترادف تھا۔ کرشن جیسے نہ جانے کتنے ہوں گے جو پرشاد کو بچے کی طرح بے ضرر یا قابل رحم سمجھتے ہوں گے۔ وہ انہیں قائل کرنا نہیں چاہتا تھا کہ پرشاد سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔

گاؤں کی مارکیٹ صرف چھ دکانوں پر مشتمل تھی اور ان میں سے پانچ بند ہو چکی تھیں۔۔۔ چھٹی دکان بہت کچھ تھی۔ یعنی کافی ہاؤس بار۔۔۔ ریسٹورنٹ۔۔۔ سگریٹ، اسٹور وغیرہ۔۔۔ چنانچہ کچھ آباد تھی۔۔۔ اندر باہر دو چار گاہک اونگھ رہے تھے یا پھر وقت ضایع کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہیں بہرحال وقت گزاری کرنا تھی۔

مالک نے دہلی سے تشریف لانے والے معزز مہمان کی خاطر یوں کی کہ تعارف کے فوراً بعد اسے گاؤں کی تاریخ اور جغرافیہ پر ایک لیکچر دیا۔۔۔ پہلے چائے۔۔۔ پھر کافی اور آخر میں وہسکی پلاتے ہوئے اس نے خود کو بتایا کہ پرساد کیا یہاں سب خرابی ہیں۔ اور پاگل تو ایک سے ایک ہے مگر یہ لوگ خوش قسمت ہیں ورنہ جس زمین پر یہ آباد ہیں یہ ان کے باپ کی جاگیر نہیں۔۔۔ چاند نگر پہلے جزیرہ تھا مگر بعد نہ جانے کیسے اور کب وہ نہر خشک ہوگئی جس نے چاند نگر کو باقی زمین سے الگ کر رکھا تھا۔ اور وہ خاندان بھی مرکھپ گیا جس کی یہ زمین تھی اور جو جزیرے کا مالک تھا۔ چنانچہ لوگ اس پر قابض ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ کے اہم واقعات کے موضوع پر آتا ونود وہاں سے بھاگ لیا۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہو چکا تھا۔ باہر آ کر اس نے گہری سانس لی۔ مالک دکان سے پیچھا چھوٹا۔ وہ بور کرنے پر تل گیا تھا۔ پھر وہ ہدایات کی مدد سے زمین میں نقشہ مرتب کر کے چلنے لگا۔ پرشاد کا گھر پاگل خانہ سے زیادہ عجائب خانہ تھا۔ اسے کباڑ خانہ سے بھی موسوم کیا جا سکتا تھا۔ گاؤں کے باہر اس نے ایک جھگی یا جھونپڑی بنا رکھی تھی جس کی تعمیر میں اینٹ، چونے، پتھر یا سیمنٹ کے سوا ہر چیز استعمال ہوئی تھی۔ اسے جتنا کاٹھ کباڑ مل سکا تھا وہ دیواروں کی تعمیر میں استعمال ہو گیا تھا لکڑی کے باکس، ٹین کے ڈبے اور ٹکڑے۔۔۔ تختے اور درختوں کی خشک ٹہنیاں۔۔۔ ان سب کو اس سے باندھ کر پالکیوں سے جوڑ کر ایک کمرے کی شکل دے دی تھی جو مشکل سے آٹھ دس فٹ اونچا اور لمبائی چوڑائی میں دس فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ دروازے کی جگہ خلا تھا جو دور سے ہی ونود کو نظر آیا تھا۔

ونود پوری احتیاط سے سر جھکا کر اندر داخل ہوا۔ سر کے ٹکرانے یا ہاتھ پیر کے غلط جگہ لگ جانے سے اس کباڑ خانے کا ایک ڈھیر کی صورت میں اس پر گر جانا۔ عین ممکن تھا۔ اندر کی نیم تاریک فضا سے مانوس ہو جانے کے بعد اسے یقین آنے لگا کہ پرشاد واقعی پاگل ہے۔۔۔ اندر وہ سب ناکارہ چیزیں بھری پڑی تھیں جو دنیا نے فالتو یا بے مصرف سمجھ کر کوڑے میں پھینک دی تھیں۔۔۔ خالی بوتلیں اور ڈبے۔۔۔ ٹوٹے ہوئے آئینے۔۔۔ ٹوتھ پیسٹ اور شیونگ کریم کی خالی ٹیوبوں کے ڈھکن۔۔۔ الجھے ہوئے رنگین ریشمی دھاگے اور اون کے لچھے۔۔۔ شکستہ چینی کے برتن۔۔۔ ان نوادرات کی فہرست بہت طویل تھی جو پرشاد نے نہ جانے کتنے عرصے میں کہاں کہاں سے سمیٹ کر اپنے گھر میں سجائے تھے۔ یہ چیزیں صرف دیواروں پر ہی نہیں چھت پر بھی آویزاں تھیں۔ ونود ایک پرانے لکڑی کے باکس پر بیٹھ گیا جو ایک سائز کے چار ڈبوں پر قائم تھا۔

پھر وہ اس صورت حال پر غور کرنے لگا جو مجموعی طور پر سنگین بھی تھی۔ مضحکہ خیز بھی اور ناقابل یقین بھی۔

پرشاد کی ذات ایک بات سے معمہ بن گئی تھی جسے حل کرنا بہت ضروری بھی تھا دور سے سیٹی کی آواز سنائی دی جو رفتہ رفتہ قریب سے قریب آتی گئی۔ وہی تین بول اور ان کی مسلسل تکرار۔۔۔ پھر پرشاد اندر آیا اور ونود کو دیکھتے ہی سہم گیا۔۔۔ اس کی صورت پر وہی خوف تھا جو کسی بچے کی صورت پر چوری چھپے کوئی غلط کام کرتے ہوئے پکڑے جانے سے نظر آنے لگتا ہے۔۔۔ حالانکہ اسے ونود کے بلا اجازت اندر گھسنے پر برہم ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی جو کسی بھی شخص کو زیب نہیں دیتی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔ وہ خوف زدہ اور پریشان سا ہو گیا کہ ایک

اجنبی شخص اس کی جھونپڑی میں کیوں اور کس لیے گھس آیا ہے۔

''تم نے مجھے پہچانا۔۔۔۔'' ونود نے دوستانہ نرم لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم سے مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس کا پتا پوچھا تھا۔''

پرشاد جواب دینے کے بجائے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی پلکیں اور آنکھیں منجمد اس کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ ونود کا خیال تھا کہ اپنی عقل سے کام لے کر وہ اس نیم پاگل شخص سے سب کچھ معلوم کرسکتا ہے۔

مگر دس فٹ کے بعد ہی اس کا حوصلہ جواب دینے لگا۔۔۔ پرشاد سیدھی بات کا الٹا یا ذومعنی جواب دینے میں ماہر تھا اور بڑی خوبصورتی سے اصل بات کو گول کر جاتا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ بڑا ذہین اور چالاک بھی ہے۔

''مسٹر سوراج۔۔۔۔ جسے مسٹر فیشن بھی لوگ اور مالکن بھی کہتی ہیں۔۔۔ اس لیے کہ جو فیشن لیتا ہے اسے مسز فیشن کہتے ہیں۔۔۔ ہاں میں گیسٹ ہاؤس کے پاس سے گزرا تھا۔۔۔ جانتے ہو کیا دیکھا تھا میں نے۔۔۔ گیسٹ ہاؤس اور کیا۔۔۔۔'' بالآخر ونود نے اس کی گردن دبوچ لی۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ بکتے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ وہاں جاؤ گے تو چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تمہیں معلوم تھا کہ وہاں ایک قتل ہوا۔ تمہیں یہ بات کیسے اور کیوں کر معلوم ہوئی تھی۔۔۔ جب کہ باہر سے کچھ نظر نہیں آتا۔'' ونود نے بڑے تیز لہجے میں کہا۔

پرشاد کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے خود کو چھڑانے کی معمولی سی جدوجہد کی۔

بھگوان کی سوگند۔۔۔ میں نے باہر سے دیکھا تھا۔۔۔ اندر تو میں جا بھی نہیں سکتا۔۔۔ ورنہ وہ بلا میرے پیچھے پڑ جاتی۔۔۔ موٹی کالی بلا۔۔۔ کالی چڑیل۔۔۔ وہ جھاڑو لے کر مجھے مارنے دوڑتی ہے مجھے دیکھتے ہی۔''

''پھر تم چوری چھپے اندر گئے ہوگے۔'' ونود نے اسے دبائے رکھا ''کیا مسٹر فیشن نے تمہیں کچھ چراتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟''

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔۔۔ مردے کسی کو دیکھ نہیں سکتے۔'' وہ چلایا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ وہ مر چکا تھا۔'' ونود نے اس کی بات پکڑ لی۔ ''اس کی لاش وہاں لٹک رہی تھی۔ تم وہاں کیا چرانے گئے تھے۔۔۔؟'' پرشاد نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور ونود کی گرفت سے نکل گیا۔ نہ جانے کہاں سے اس نے دو سیب برآمد کیے اور سینے سے لگا کر کونے میں دبک گیا۔ ''یہ سیب میرے ہیں۔۔۔ میں نے مسٹر سادھنا کے باغ سے نہیں توڑے۔''

ونود نے خود کو سمجھایا کہ اس کا واسطہ ایک دیوانے سے ہے۔ چناں چہ اسے ہوش سے کام لینا چاہیے۔

''ٹھیک ہے پرشاد۔۔۔! یہ سیب تمہارے ہیں مگر تم نے چرائے ہیں۔۔۔ مجھے سچ سچ بتا دو گے تو میں اپنا سے نہیں کہوں گا اور نہ ہی مسز سادھنا کو بھی بتاؤں گا۔ تم نے درخت پر سے اندر جھانکا تھا۔'' ونود نے اپنا لہجہ بدستور نرم رکھا۔

''نہیں۔۔۔ کھڑکی کھلی تھی میں ڈر رہا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔'' وہ سیب کو کترتے ہوئے بولا۔ ''سیب کیسے میٹھے اور رس بھرے ہیں۔''

''مگر تم نے لاش دیکھ لی تھی۔۔۔ پھر تم نے یہ بات مسز سادھنا کو کیوں نہیں بتائی۔۔۔ وہ تو تمہیں نہیں مارتی۔'' ونود نے کہا۔ ''وہ تو بڑی اچھی اور نرم دل عورت ہے۔ تم اس کے مزاج سے تو واقف ہو گے۔''

''میرا خیال تھا کہ انہیں علم ہوگا۔۔۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''کیا میرے گھر میں لاش ہوگی تو مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہوگی۔'' اس کے لہجے سے دیوانگی کا عنصر اچانک غائب ہوگیا تھا۔ ''کیا انہیں زندہ مردہ کی تمیز نہیں۔۔۔ وہ شاید جھی ہوں گی کہ مسٹر

بھولا بھول رہے ہوں گے۔'' وہ ونود کو لاجواب چھوڑ کر اٹھا اور دوسرے کونے کی طرف بڑھا۔ فرش کی ایک اینٹ اٹھا کے اس نے نیچے کسی خفیہ خانے میں ہاتھ ڈالا اور پھر مطمئن ہو کر اینٹ پر بیٹھ گیا۔ ونود اس کی پراسرار اس حرکت کو غور سے دیکھتا رہا۔ لمحہ بھر کی پہلے کی متانت پھر دیوانگی کے آثار میں ڈھال گئی۔ ''یہ آپ میرے کھانے کی میز پر بیٹھے ہیں۔۔۔ اور اب میرے ڈنر کا وقت ہو گیا ہے۔''

پرشاد نے کاغذ کے مختلف لفافے کھول کے کھانے کی بہت سی چیزیں نکالیں جو یقیناً لوگوں کی دی ہوئی تھیں۔ ان میں سے جو خوشبو پھوٹ رہی تھی اشتہا انگیز بھی لگتا تھا کہ [illegible] آ رہی ہے [illegible] ذائقہ دار اور لذت آمیز بھی ہیں۔

ونود باکس پر سے اٹھا اور اس نے پرشاد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر پرشاد ہذیانی لہجے میں چلایا۔

''چور۔۔۔ تم چور ہو۔۔۔ میرا خزانہ لوٹنے آئے ہو۔۔۔ نکل جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔''

ونود نے اینٹ ہٹا کے خلا میں دیکھا۔۔۔ موبل آئل کے ایک ڈبے کو کھود کر اس طرح دفن کیا گیا تھا کہ زیر زمین خانہ بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ مگر اس ڈبے میں ردی کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔ ونود نے تین مختلف قسم کے تاش۔۔۔ ایک پرانا کیلنڈر جس پر ایک مشہور فلمی ستارہ کی ہیجان خیز تصویر۔۔۔ کسی فلمی رسالے سے کاٹی ہوئی چند ہوش ربا قسم کی رنگین تصویریں۔۔۔ تقسیم سے قبل کے برٹش دور کے سکے۔۔۔ دو ٹافیوں اور دو کریم والے بسکٹوں پر مشتمل پیکٹ۔۔۔ اور ایک پرانے ریشمی رومال کو شرمندگی سے دیکھا۔ مائکرو فلم یا بلیو پرنٹ۔۔۔ ایک بچے کے خزانے میں اور کیا ہوگا۔۔۔؟

ڈائنامیٹ۔۔۔ ٹیپ۔۔۔ کوڈ بک۔۔۔ ٹرانسمیٹر۔۔۔ اب تک تو اس نے لوگوں کو یہی سب کچھ چھپاتے دیکھا تھا۔ اس نے ساری چیزیں واپس بھر دیں۔

''پرشاد۔۔۔! تم سیٹی بہت اچھی بجاتے ہو جس پر بانسری کا دھوکا ہوتا ہے مگر تم گانا پورا کیوں نہیں گاتے۔۔۔'' ونود نے اینٹ رکھ کے کہا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ شہزادی نے کیا کہا تھا۔۔۔'' پرشاد سوچتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔۔۔'' ونود نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے پورا گانا آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے۔ بچپن میں گاتا تھا۔ جب پسند بھی تھا۔''

''تو پھر اب کیوں نہیں گاتے ہو۔۔۔'' پرشاد نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''میں بھی بچپن میں گایا کرتا تھا۔ لیکن اب تو مجھے پورا گانا یاد نہیں۔'' ونود کچھ دیر پرشاد کی متانت کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''دوست۔۔۔ یا تو تم واقعی دیوانے ہو یا دیوانے بن کے دنیا کو دیوانہ بنا رہے ہو۔ فکر مت کرو۔ میں معلوم کر لوں گا۔'' اس نے دروازے کے پاس جھک کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اینا کو اس بات پر غصہ کم سخت صدمہ تھا کہ پولیس والے سوراج یعنی مسز فیشن کی لاش بالکل نئی چادر میں لپیٹ کر لے گئے۔ انہوں نے اجازت لینا اور پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ کوئی پرانی چادر دے دیتی۔ کیا نئی چادریں لے جانا واقعی ضروری تھا۔

ونود نے اسے تسلی دی کہ مرنے والے کے لیے پھولوں کی چادر نہ سہی۔۔۔ گیسٹ ہاؤس کی طرف سے نئی چادر کو نذرانہ سمجھ لیا جائے۔ یہ بھی ایک طرح سے مان ہے۔ یہ مسز فیشن کے لیے عزت کی بات ہے۔ ایک چادر کی اوقات ہی کیا۔

پھر اس نے مطلب کی بات کی۔ ''گزشتہ رات تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی؟''

''لیس سر۔۔۔!'' وہ نہایت راز دارانہ لہجے میں بولی۔ ''رات کو جھینگر اڑ رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں نا کہ جب کوئی مرتا ہے تو۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔'' ونود نے اعتراف کیا۔ ''اس کے علاوہ کوئی اور آواز۔۔۔ کوئی

آہٹ۔۔۔ تمہیں محسوس ہوئی تھی۔" اینا نے پھر بڑے اعتماد سے سر ہلایا۔" کوئی سیٹی بجا رہا تھا۔" پھر اس نے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا اور کچھ سوچنے لگی۔

"وہ چاند کے شہزادے۔۔۔ اور زمین کی شہزادی والا گیت۔۔۔"

اینا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور اس نے پلکیں جھپکائیں۔

"آپ۔۔۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔ آپ تو اس وقت چاند نگر پہنچے بھی نہیں تھے۔"

"بس۔۔۔ یہ بات کسی کو بھی بتانا نہیں۔" ونود نے مسکرا کر اس کے عظیم الشان کندھے پر تھپکی دی۔

اس روز شام کو کرشن پھر آ پہنچا۔۔۔ یوں لہ رسمی کارروائی بہر حال ناگزیر تھی۔۔۔ مسز سادھنا نے کہا کہ وہ اپنے بھانجی کے گھر چلی گئی تھی۔ جسے اپینڈکس کا درد اٹھا تھا۔ مگر اس کے ناتجربہ کار شوہر نے فرض کر لیا کہ وہ صاحب اولاد ہونے والا ہے۔

کرشن قہقہہ مار کے ہنسا اور اینا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ سوال ہر جگہ تفتیش کے نصاب میں شامل تھا۔

"اینا۔۔۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ کیا تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی۔۔۔؟"

پھر اس نے جھینگروں کی نوحہ خوانی کے عقیدے کا ذکر کیا۔ "مگر میں ڈر کر سو گئی تھی۔۔۔ کانوں میں روئی دے کر اور سر چادر میں لپیٹ کر۔"

کرشن نے سر کھجایا۔ "اب تفتیش خاک کی جائے۔ ایک بڈھا بیوی کی موت کے بعد گھر چھوڑ کر اس کمرے میں بند ہو گیا تھا اور پانچ برس سے گوشہ نشین تھا۔ ایک رات مالکن کی عدم موجودگی میں اسے پھانسی پر لٹکا پایا۔۔۔ اس کا دشمن کوئی نہ تھا۔ چناں چہ یہ حرکت چور ڈاکو سے منسوب کی جا سکتی تھی۔۔۔ بشرطیکہ کچھ چوری ہوا ہوگا۔۔۔ لیکن اب کسے پکڑا جائے۔۔۔ اینا کو۔ نو سر۔۔۔! تفتیش ختم۔۔۔ کسی پاگل خبطی نے بلاوجہ ایک شریف آدمی کو مار ڈالا اسے کیا ملا ہوگا۔۔۔ شاید وہ کسی چیز اور رقم کے لیے آیا ہوگا خالی ہاتھ گیا۔"

"نہیں۔۔۔ کرشن۔۔۔!" ونود نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ قتل بے مقصد نہیں ہوا۔ قاتل کو معلوم تھا کہ آج رات مسز سادھنا گھر میں نہیں ہیں اور اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ قتل کو خودکشی کا کیس بنانے کی کوشش سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجرم کے ذہن میں پہلے سے یہ منصوبہ تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کی موت سے کس کی ذات کو فائدہ ہو سکتا تھا اور کیا۔۔۔؟"

کرشن نے بڑی بے بسی سے بہت بڑے شہر کے بہت بڑے سراغ رساں کو دیکھا۔ جسے بال کی کھال نکالنے کا شوق تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کی بات مسترد کرنا اپنی نااہلی کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا۔ ڈاکٹر نے کتنا فیصلہ لکھا تھا۔ نہ خودکشی نہ قتل۔

متوفی کمرے میں رسی سے معلق پایا گیا۔ موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی۔ بات ختم بشرطیکہ ختم سمجھی جائے۔

تیسرے دن اتوار کو مسٹر فیشن کا کریا کرم ہو گیا۔ سارا گاؤں شریک ہوا۔ اس رات ونود کی ملاقات ایک پارٹی میں دوسرے خبطی سے ہوئی۔ یہ کرشن کا بیٹا سریندر تھا جو بنگلور میں کسی سرکاری محکمے میں اچھا بھلا افسر تھا مگر کسی بات پر ایک اچھی نوکری پر لات مار کر چاند نگر آ گیا تھا۔ کیوں کہ شہر میں اس کا دل نہیں لگتا تھا اور اسے وہ گاؤں بہت یاد آتا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور پلا بڑھا بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اپنے باپ کے ماتحت کی حیثیت سے چاند نگر میں رہ کر رعایا کی سوا کرے۔

ونود سخت حیران ہوا۔ بنگلور جیسے خوب صورت، بارونق اور ہنگامہ پرور شہر میں زندگی کی پیش قدمی انتہائی ترقی یافتہ اور کمپیوٹر پارک جس کی برق رفتاری کامیابی نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی تھی۔ زندگی بڑی سرعت سے رواں دواں تھی۔ لیکن اس گاؤں میں وقت بادل ناخواستہ کچھوے کی طرح آگے رینگتا تھا اور لوگ ہی نہیں اس ماحول میں ہر چیز سوئی سوئی یا

نشے میں مدہوش بھری تھی۔ مگر سریندر اس خوابیدہ گاؤں کی فضا میں لوٹ آیا تھا۔ جہاں ایک دن ایک مہینے کی طرح طویل انتظار کے بعد تمام ہوتا ہے۔ سریندر نے اس گاؤں میں پیدا ہو کر بھی جانے کیوں یہاں کی زندگی کو پسند کیا تھا۔

اس حساب سے یہاں لوگ سینکڑوں سال جی لیتے ہیں مگر ونود کو اس جینے کا کوئی مقصد نظر نہیں آیا تھا۔ خود سریندر کے باپ نے اعتراف کیا تھا کہ گاؤں میں سب ایک دوسرے کا شجرہ نسب تک جانتے ہیں۔ چنانچہ جرائم مفقود ہیں۔ لوگ گھروں میں تالے تک نہیں لگاتے۔۔۔ کبھی کوئی نشے میں کسی اپنے پرائے کی ایک آدھ ہڈی توڑ دیتا ہے یا کسی کی بکری غائب ہو جاتی ہے اور بعد میں پتا چلتا ہے کہ فلاں فلاں کے لڑکے اسے بھون کر کھا گئے ہیں۔۔۔ چنانچہ فلاں فلاں بکری والے کو بکری لے دیتے۔ بیویاں عموماً خاموش رہتی ہیں کیوں کہ شوہر کو آج اور اس جدید دور میں جہاں آزادی نسواں ہے اور عورت نے کچھ حد سے زیادہ آزادی حاصل کر لی ہے۔ وہ مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے حاکم سمجھا جاتا ہے۔ جب زیادہ آزاد خیال بیویاں بے لگام ہو جاتی ہیں اور زبان درازی پر مار کھا کے بھائیوں کی خدمات حاصل کر لیتی ہیں یا پھر ان کے والدین یا سرپرست سمجھاتے ہیں کہ شوہر کی حاکمیت قبول کر لو۔ انہیں سوئیکار کیا اور وچن دیے ہیں تو اس پر چلو۔۔۔ شوہر سے ہی عزت ہے۔ وہی ہمارا ہے۔۔۔ وقت ایسا ہے کہ حالات سے سمجھوتا کر لو۔۔۔ اگر تمہیں شوہر نے چھوڑ دیا تو کیا کرو گی۔۔۔ نوجوان اور حسین لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہو رہی ہیں اور وہ رشتوں کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں۔ ہمارے سماج میں بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے شادی کوئی نہیں کرتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی حسین، نوجوان، پرشباب اور بے پناہ کشش کی مالک کیوں نہ ہو۔۔۔ ایسی متاثرہ عورت دو کوڑی کی سمجھی جاتی ہے یہ خیال دل کے ہر کونے سے نکال دو کہ بھائی شوہر اور پولیس والوں کا دماغ درست کر دیں گے۔ چوں کہ یہ بات سولہ آنہ یا سو فیصد درست ہوتی تھی۔ وہ دنیا دیکھتی تھیں اور حقیقت پسند بن جاتی تھیں۔ حالات سے سمجھوتا کر لیتیں۔۔۔ لہٰذا بات ختم۔۔۔

گاؤں کی تاریخ میں چوری ڈکیتی کی دو چار سنسنی خیز واقعات تو شامل تھے۔۔۔ مگر قتل۔۔۔ نو سر۔۔۔! یہاں جان لینا صرف فرشتہ اجل کا کام ہے۔ جو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے اور اس کے باوجود۔۔۔ ونود نے سوچا، جرائم کے انسداد میں بطور معاون اپنے باپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔ لوگ اس کے ایثار سے اور اس کی اس عظیم جذبے سے بے حد متاثر تھے۔ اس کی گاؤں سے گاؤں والوں سے محبت کے قائل ہو چکے تھے اور ونود کا ہم عمر سریندر خاں اسمارٹ، خوش پوشاک اور چاق و چوبند تھا اور دراز قد بھی۔۔۔ اس لیے وہ ایک طرح سے ہیرو بن گیا تھا جس کے مقابل زندگی کی فلم میں ہر لڑکی ہیروئن اور محبوبہ بننے کو تیار تھی۔

مسز سادھنا۔۔۔ جو اپنے معزز مہمان کو ہر ایک کے سامنے نمائش کے لیے پیش کر رہی تھیں۔۔۔ ونود کو چپکے چپکے اور غیر محسوس انداز سے منسوب خوبیاں۔۔۔ خامیاں۔۔۔ روایات اور اسکینڈل اپنے تبصرے کے ساتھ سنائی جا رہی تھی۔۔۔

ایک ان کی ہم حیات۔۔۔ ہم وزن جو گوری چٹی دیا کی رنگت کی شریمتی کے ساتھ مسز سادھنا جیسی پورٹیبل لڑکی جس کا رنگ کالا تھا۔۔۔ اور سن یا نیگرو جیسی رنگت۔۔۔ مسز سادھنا نے بتایا کہ موٹی عورت بے حد کمینی اور کنجوس ہے۔ یہ کالی لڑکی اس کے بیٹے کی منگیتر تھی اور وہ زندہ رہتا تو اس سے شادی یقیناً شادی کر لیتا۔ اس کالی لڑکی میں بڑی جاذبیت اور بے پناہ کشش تھی۔ بدن بھی پرشباب اور گداز تھا۔ چہرے کے نقوش میں ایسا تیکھا پن تھا کہ جو سیدھے دل میں اتر جاتے تھے۔ گاؤں میں اور بھی نوجوان کالی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ اس کا منگیتر جو

دولت کے حصول کے لیے امریکا گیا تھا یا اقوام متحدہ کی طرف سے امن فوج میں ویت نام گیا تھا لوٹ کر نہیں آیا۔۔۔ اب لڑکی تمام عمر شادی نہ کرنے کی سوگند کھا چکی ہے اور بڑے خلوص سے بڑھیا کی خدمت کرتی ہے مگر بڑھیا صلے میں نفرت کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ کیوں کہ لڑکی بہت ہی زیادہ کالی توے کی طرح ہے۔ بڑھیا اسے منحوس بھی سمجھتی ہے کہ جوان بیٹے کو کھا گئی جو سرخ وسفید گوروں کی طرح تھا۔ بھلا محبت کی نظر کو قاتل کون سمجھتا ہے۔ اس پارٹی میں ونود نے تقریباً پچیس چھبیس برس کی ایک عورت کو دیکھا جو دور شباب میں ہی بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ اس [illegible] اور اب [illegible] کشش [illegible] کے دل کش نشیب وفراز کو متاثر کر دیا تھا۔۔۔ مسز سادھنا نے اسے بتایا کہ شوہر دن رات نشے میں دھت پڑا رہتا ہے اور بیوی پر سخت ظلم کرتا ہے۔۔۔ کرن دولت مند ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی مگر دولت شادی کے تین برس کے اندر اندر شراب بن کر بہہ گئی۔۔۔ پھر رنجن یعنی کرن کے شوہر نے زیورات بھی ٹھکانے لگا دیے اور اب کرن اسپتال اور گھروں میں آیا کا کام کرتی ہے۔ چونکہ اسپتال کی انتظامیہ اور لوگ حالات سے واقف ہیں اس لیے معاوضہ کچھ زیادہ ہی دے دیتے ہیں جسے شوہر پی جاتا ہے۔ اس پر اس لیے شک کرتا ہے کہ اس کا جسم متناسب اور پرشباب ہے اس لیے کرن کی ہڈیاں توڑتا ہے کہ۔۔۔ بتا تو جو اتنی دیر سے آتی ہے کس یار کے پاس جاتی ہے جو تجھے کام کے اتنے پیسے دیتا ہے۔ کرن کی زندگی جہنم ہے مگر وہ اب بھی نباہ رہی ہے۔ وہ چاہے تو کسی بھی قریبی بڑے شہر میں جا کر ملازمت کر کے سکون اور اطمینان کی گزار سکتی ہے۔ چوں کہ محبت کی شادی ہے اس لیے شوہر کو نہیں چھوڑتی ہے۔

کرن ایک مثالی عورت تھی جو اس معاشرے میں خال خال ہی رہ گئی تھی۔ وفاداری کے اس بے رحم معیار پر ونود کو بڑا دکھ ہوا جو جان کا نذرانہ لیے بغیر نہ بخشے۔ اس عورت نے محبت کی کیسی لاج رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا شوہر اس قابل تھا کہ اسے سولی پر چڑھا دیا جائے۔ پارٹی میں وہ تنہا آئی تھی۔۔۔ کیوں کہ اس کا شوہر رنجن شراب کے نشے میں مدہوش پڑا تھا اور صبح سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ناممکن تھا۔ تازہ ترین مار پیٹ کی نشانیاں ہنوز اس کی صورت، گلے کے نیچے ابھاروں اور مرمریں سڈول بانہوں پر نمایاں تھیں لیکن لوگ اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے اور وہ ہنس رہی تھی اور خوش بھی تھی کہ جیسے شوہر کی پیار کی نشانیاں ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ توجہ اور التفات دراصل نرس کی خیرات ہے جو سب اپنے نامہ اعمال میں ایک نیکی [illegible] ہیں۔ مسز سادھنا نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ کرن نے ان نامساعد حالات اور شوہر کے ظلم وستم اور جبر اور شقاوت پر اپنے اوپر کبھی آنچ نہیں دی۔ وہ پوتر ہے۔ حالاں کہ ایسے مردوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس کی پاکیزگی اور آبرو پر داغ بننا اور منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ اپنی اذیت اور دکھ وہ اپنے آپ کو رات دن مصروف رکھ کے اور اسپتال میں دکھی مریضوں کی سیوا میں گھول دیتی ہے۔

مسز سادھنا نے ونود کو دہلی سے ایک برس سے قبل آئی ہوئی اس مصورہ سے بھی متعارف کرانے کی کوشش کی جو محض تصویریں بنا رہی ہے۔ حالانکہ رنگ اور برش سے محنت کرنے کے بجائے یہی کام کیمرے سے بھی بہتر طور پر چشم زدن میں بہت اچھی اور ہر طرح اور زاویے سے اتر جاتی تھیں۔ اب تو کیمرے ایسے ایسے آگئے تھے جو طلسماتی قسم کے تھے۔

کرشن کے اس دیہاتی اجتماع میں صرف دو افراد تھے جن سے وہ شہر کی باتیں کر سکتی تھی۔ ایک دہلی سے آنے والا ونود اور دوسرا بنگلور سے لوٹنے والا سریندر۔۔۔ ایک بیماری کے باعث آیا ہوا اور دوسرا مستعفی ہو کر۔۔۔ مگر اہمیت کے اعتبار سے دونوں کے فرائض ایک جیسے تھے۔ بالکل نامعلوم خود پر ونود اور سریندر کے درمیان رقابت کا ایک فضول سا جذبہ

ہو گیا۔

ونود نے محسوس کیا کہ سریندر اپنے رویے اور اس کی غیر موجودگی اور باتوں سے بلاوجہ لوگوں کو زیادہ متاثر کر سکتا تھا اور ونود کا یہ انداز غلط نہ تھا کہ سریندر بلاوجہ اسے چیلنج کر رہا ہے۔۔۔ مگر اب سچ میں کپ ملاتے ہوئے اسے احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ مزید یہ اب اسے پدمنی کی توجہ بلاشرکت غیرے نہیں مل رہی تھی۔ چنانچہ وہ ضرورت سے زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش میں ونود کو تنقید یا مذاق کا نشانہ بنانے لگا تھا۔ ونود کو مجبوراً جوابی کارروائی کرنی پڑی۔ اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔

پارٹی ختم ہوئی تو وہ یوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ ان کے درمیان کشیدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ درمیان میں چلنے والی پدمنی کو بھی احساس ہونے لگا تھا۔ تقریباً سو گز تک وہ ان کی نوک جھونک برداشت کرتی رہی تھی۔ پھر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کسی ایک کا مذاق دوسرے کو گراں گزرا تو نوبت تلخ کلامی تک پہنچ جائے گی۔ پدمنی نے ان دونوں سے الگ ہو کر جانے کا فیصلہ کیا ہی تھا کہ گلی میں ایک گھر کا دروازہ کھلا اور کسی عورت نے چیخ ماری۔ سریندر اور ونود ایک ساتھ اس کی مدد کے خیال سے اس طرف دوڑے۔

''کرن۔۔۔'' سریندر نے اسے دور ہی سے شناخت کر کے کہا۔ ''کیا بات ہے۔۔۔''

''سریندر۔۔۔!'' کرن نے ہسٹریا کے مارے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نرنجن۔۔۔ وہ میرا خیال ہے کہ۔۔۔ نرنجن مر گیا ہے۔۔۔ دنیا سے دفع ہو گیا ہے۔'' کرن کا خیال بالکل غلط نہیں تھا۔ نرنجن سیڑھیوں کے قریب بڑے مضحکہ طریقے پر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اس کا سر ایسا پھٹا تھا کہ ایک طرف سے خون کے ساتھ مغز بھی باہر آ گیا تھا۔۔۔ دوسری طرف اس کے رخسار کا گوشت آنکھ کے گوشت کے کنارے تک کٹ گیا تھا اور اس کے سارے دانت نظر آنے لگے تھے یہ شگاف شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل کے ایک تیز دھار والے نوکیلے ٹکڑے سے آیا تھا جس کے باقی حصے بھی قریب ہی بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ بوتل کی شراب فرش پر بہہ چکی تھی اور اس کا دھارا بہتے ہوئے خون سے جا ملا تھا۔ وہ دونوں چند لمحوں تک صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔

''نشے میں آدمی کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو ٹھوکر کھاتا ہی ہے۔'' سریندر نے اوپر سے آنے والے لکڑی کے زینے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا خیال ہے کہ نرنجن اوپر سے نیچے آتے ہوئے گرا اور سر کی چوٹ کے علاوہ بوتل کے زخم سے مر گیا۔ ونود گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔ اس میں شبے کی کون سی بات ہے۔'' سریندر نے طنز سے کہا۔ ''یہ ممکن تھا کہ وہ گر کے بھی بچ جاتا۔۔۔ کیوں کہ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جو گرنے سے ٹوٹ گئی۔۔۔ اور۔۔۔''

''آپ کا خیال سو فیصد غلط ہے۔'' ونود نے اٹھتے ہوئے تکرار کی۔ ''جاؤ۔۔۔ اور جا کر اپنے پتا جی کو بلا کر لے آؤ۔۔۔ ان سے کہو کہ کسی نے نرنجن کو قتل کر دیا ہے۔'' ونود کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔

سریندر نے پلکیں جھپکا کر بے وقوفوں کی طرح ونود کو دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

بیس منٹ کے بعد باپ بیٹا اتحادی فوجوں کی طرح مارچ کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ انسپکٹر کی حیثیت سے کرشن نے سب سے پہلے لاش کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے ونود کو دیکھا۔ ''آپ کا یہ کہنا ہے کہ یہ حادثہ نہیں قتل ہے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔'' ونود نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور بے نیازی سے اپنی سگریٹ جلائی۔ ''نرنجن اوپر سے نہیں گرا۔ وہ اوپر جا رہا تھا کہ کسی نے اس کی گردن توڑ دی اور بعد میں جب وہ مر چکا تھا اس کے سر پر شراب کی بوتل مار کر سر بھی توڑ دیا اور شراب کی بوتل بھی توڑ دی۔''

''اس مفروضے۔۔۔ بلکہ احمقانہ مفروضے کی

بنیاد کیا ہے؟'' کرشن نے بیٹے سے سنی ہوئی بات کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''اپنی رائے کو فی الحال محفوظ رکھیں۔'' ونود نے سگریٹ کو ایک کش کے بعد زمین پر ڈال کے رگڑ دیا۔ ''میں ابھی اوپر گیا تھا جہاں نرنجن مے نوشی میں مصروف تھا۔ وہاں ایک بوتل رکھی ہے جو بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔۔۔ اس میں سے ایک خاصے بڑے جام کو بھرا جا سکتا ہے۔۔۔ نرنجن دوسری بوتل اس صورت میں لاتا جب وہ خالی ہو جاتی۔۔۔ بلانوش آخری قطرے تک نہیں چھوڑتے۔۔۔ لیکن اس سے ملنے کوئی آیا تھا۔۔۔ کوئی ایسا شخص جس کے علم میں تھا کہ کرن پارٹی میں ہوگی اور نرنجن اکیلا رہے گا۔ نرنجن اس کی خاطر مدارت کے لیے دوسری بوتل لینے اترا تھا کیوں کہ اب اسے ایک نہیں دو جام بھرنے تھے۔''

''یہ سب آپ کے ذہن کی اختراع ہے۔'' سریندر نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

''شٹ اپ۔۔۔ پہلے میری بات ختم ہونے دو۔'' ونود نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔ ''آپ نے یہ زینہ دیکھا ہے۔۔۔ زینہ لکڑی کے الگ الگ تختوں کا بنا ہوا ہے۔ دو تختوں کے درمیان تقریباً آٹھ انچ کا فاصلہ ہے۔۔۔ کوشش کر کے دیکھو۔۔۔ یہ فاصلہ کتنا بڑھ سکتا ہے۔ دو تختوں کو اوپر نیچے کھینچو۔۔۔ تختوں کی لچک سے درمیان کا خلا نو انچ تک ہو جاتا ہے۔۔۔ نرنجن جب بوتل لے کر اوپر جا رہا تھا تو قاتل اوپر موجود تھا۔۔۔ اور شاید ہاتھ میں کوئی چیز لے کر منتظر تھا کہ نرنجن کا کام تمام کر دے اور نکل جائے۔۔۔ مگر قدرت یا نرنجن کی شامت اعمال نے ایک بہتر موقع فراہم کر دیا۔۔۔ نرنجن چند زینے چڑھا اور ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔ ممکن ہے اس کا سر دو تختوں کے درمیان پھنس گیا لیکن یہ ذرا مشکل ہے۔۔۔ قاتل نے خود یہ کام کیا کہ نرنجن کو اٹھنے نہیں دیا اور ایک پاؤں سے دبا کر اس کا سر دو تختوں کے درمیان کر دیا۔۔۔ پھر وہ اوپر والے تختے پر چڑھ گیا۔ اور اس کے وزن نے نرنجن کی گردن توڑ دی۔۔۔ بعد میں اس نے نرنجن کو نیچے لڑھکا دیا۔۔۔ شراب کی بوتل نرنجن کے ہاتھ میں تھی۔ قاتل نے بوتل کو گردن سے پکڑ کے نرنجن پر وار کیا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ بوتل کا جو حصہ ٹوٹ کر قاتل کے ہاتھ میں رہ گیا تھا وہ الگ پڑا ہے۔۔۔ اسے غور سے دیکھو۔۔۔ اس پر انگلیوں کے نشانات تو نہیں ملیں گے مگر آپ کارک پر لگی ہوئی سیل سلامت ملے گی۔ کیوں۔۔۔؟ نرنجن بوتل کھولے بغیر اوپر کیوں لے جا رہا تھا۔ اوپر تو کوئی ایسی چیز نہیں جس سے سیل توڑی جا سکے یا کارک نکالا جا سکے۔۔۔ پھر ذرا غور سے نرنجن کی گردن کو دیکھو۔۔۔ ایک گہرا سیاہی مائل نیلا نشان تو دو تختوں کے کناروں کا ہے مگر گردن میں لکڑی کے ریشے پیوست ہیں۔۔۔ باریک باریک سلائیاں سی ہیں جو خون کے نیچے چپکنے سے رہ گئیں۔ اگر تم زیادہ تفصیل سے معائنہ کرو گے تو تمہیں کہیں اوپر نیچے دو تختوں کے کناروں پر گوشت کے ریزے بھی چپکے ہوئے مل جائیں گے۔۔۔ اگر یہ مفروضہ میرے احمقانہ ذہن کی اختراع ہوگی آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔۔۔ تمہاری تفتیش فضول اور لاحاصل اور وقت کا ضیاع ہوگی۔''

پندرہ منٹ مکمل خاموشی میں گزر گئے۔ ایک وحشت سی رہی تھی۔

کرشن نے نرنجن کی گردن کا معائنہ کر لیا تھا اور اب ونود کی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن یہ مجبوری اس پر سخت گراں گزری تھی۔ سینکڑوں میل دور سے آنے والے ایک سراغ رساں نے اس کی زندگی میں مشکلات پیدا کر دی تھیں۔۔۔ پہلے اس خودکشی کے اس سیدھے سادے کیس کو قتل بنایا۔۔۔ اور اب ایک حادثے کو قتل ثابت کر کے اسے دوہری اذیت میں دھکیل دیا تھا۔ یہ اذیت۔۔۔ ایک بدترین ذہنی عذاب میں ڈال دیا تھا۔ ایک ایسے گرداب میں پھنس گیا تھا جس سے اس کا نکلنا دشوار اور سنگین بن گیا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو ایک دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا محسوس کرنے لگا۔ جس میں نکلنا اور

باہر آنے کی کوشش میں اتنا ہی وقت چلا جائے۔ اب اس کی صرف یہ ذمے داری نہیں بلکہ فرض شناسی کا امتحان تھا کہ اب وہ دونوں وارداتوں کا سراغ لگائے اور دو قاتلوں کو پکڑے ورنہ اس کا سارا ریکارڈ خراب ہی نہیں ستیاناس بھی ہو جائے گا اور اتنے بڑے شہر سے آنے والا اتنا بڑا سراغ رساں فرائض میں غفلت برتنے پر اسے معطل ہی نہیں اندر بھی کرا سکتا ہے۔ ادھر چالاک قاتل اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا ورنہ پریشانی کی بات نہ ہوتی۔

''ان کی ازدواجی زندگی کے حالات سب پر عیاں ہیں۔'' ونود نے دوسری سگریٹ جلا لی پوری بات کہہ دینے کے بعد وہ اپنے غصے پر قابو پا چکا تھا ''اگر کرن پارٹی میں موجود نہ ہوتی تو اب اس پر آسانی سے الزام تھوپ سکتے تھے۔ مگر قتل کی یہ ہولناک واردات ایک گھنٹے پہلے ہوئی ہے۔ کرن کو تین گھنٹے تک متواتر دیکھنے والے گواہ بہت ہیں۔ وہ تین برسوں سے جس عذاب میں مبتلا [illegible] کوئی اور عورت ہوتی تو اپنی اس ظالم اور [illegible] کو تین ماہ میں کسی نہ کسی طرح راستے سے ہٹا دیتی۔ لیکن اس نے ایسا کیا اور نہ سوچا۔۔۔ وہ ایک مثالی شوہر پرست پتنی کی طرح ہر ظلم سہہ کر سیوا کرتی رہی۔۔۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا اور آپ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں اور اس عورت کو سمجھتے ہیں۔''

''مسٹر ونود۔۔۔!'' سریندر نے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں جیسے ونود کے وجود پر ڈنک مارا۔ ''اس گاؤں کی تاریخ میں کبھی قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔۔۔ مگر آپ کے قدم رنجہ فرماتے ہی ایک ہفتے میں دو قتل ہو گئے ہیں۔''

''میری رائے اس کے برعکس ہے مسٹر سریندر۔۔۔!'' ونود نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''دو قتل تو پہلے بھی ہوئے ہوں گے مگر انہیں نا اہلی کے باعث یا دیدہ دانستہ خودکشی یا حادثہ سمجھ لیا ہوگا کیوں کہ قتل کے بعد قاتل کا سراغ بھی لگانا پڑتا ہے۔۔۔ بصورت دیگر کریا کرم میں شرکت یا پرساد دینے کے علاوہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔۔۔ دو مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔۔۔ پرانی تاریخ کے واقعات کی وضاحت نہیں کروں گا اس لیے کہ میں موجود نہیں تھا۔۔۔ مگر شاید آپ کے پتا جی کر سکیں۔۔۔''

پھر اس نے تیزی سے گھوم کر کرشن کو دیکھا اور واک آؤٹ کر گیا۔

کرن ساتھ والے کمرے میں منجمد بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ آنکھوں میں ویرانی برس رہی تھی۔

''کرن شریمتی۔۔۔!'' ونود نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اندازے سے بتا سکتی ہیں کہ یہ حرکت کس نے کی ہوگی۔۔۔؟''

''اندازے سے۔۔۔۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔ ''میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ حرکت [illegible] کی ہو گی۔۔۔ جس میں اتنی اخلاقی جرات تھی کہ ایک مظلوم اور بے بس عورت کو زندگی کے نرک سے نجات دلا سکے۔۔۔ جسے معلوم تھا کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ نرنجن کو مار سکے یا اس سے طلاق لے کر نجات پالوں یا بھاگ کر چھٹکارا حاصل کر سکوں۔'' وہ ہذیانی کیفیت میں ہنسی۔ ''میں بڑی وفا شعار بیوی تھی۔ میں نے کبھی بھولے سے بھی اپنی ذات پر آنچ نہیں آنے دی۔۔۔ جب کہ میری جسمانی دل کشی کے امیدواروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ مجھے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے کیا کیا چارا ڈالتے رہے۔۔۔ مگر مجھے اس کی موت کا قطعی رنج نہیں۔۔۔ صرف اس کی موت ہی میرے مصائب کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میری موت یا نرنجن کی موت۔''

کرن ذہنی انتشار میں مبتلا تھی اور اس نے کہا تھا کہ آج سے وہ راتوں کو سکون کی نیند سو سکے گی۔۔۔ وہ مر گیا۔۔۔ خبیث۔۔۔ یوں گھر آنے پر شک بھری نظروں سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا کہ ''یہ بال بکھرے ہوئے کیوں ہیں۔۔۔ لباس بے ترتیب اور شکنوں سے بھرا ہوا کیوں ہے۔۔۔ ہونٹوں کی

لپ اسٹک اڑی اڑی سی کیوں ہے۔۔۔ چہرہ سرخ کیوں ہو رہا ہے۔۔۔ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ کن کن ڈاکٹروں نے تجھے اتنی دیر کیوں اور کس لیے روکے رکھا۔۔۔ اچھا تو کتنا مال اور کتنی شراب کی بوتلیں لائی ہے؟''

ونود نے ہمدردانہ اور دوستانہ لہجے میں بات کی اور چند لمحوں میں یہ معلوم ہو گیا کہ کرن نے بھی گھر سے روانہ ہوتے وقت کسی کو دیکھا نہیں تھا مگر قریب ہی کوئی سیٹی بجا رہا تھا۔۔۔ وہی شہزادی اور شہزادے والا گیت جن کے درمیان زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔۔۔ اس گیت کی دھن سے گاؤں کا ہر بچہ۔۔۔ لڑکیاں عورتیں اور لڑکے مرد سبھی واقف تھے۔ انسان ہے۔

باہر جانے سے پہلے ونود ذرا سی دیر کے لیے درمیان والے دروازے پر رکا۔

''مسٹر کرشن۔۔۔! میں آپ کے لیے دشواریاں تو پیدا نہیں کر رہا ہوں مگر آپ کی مدد اور تعاون بھی میرا فرض ہے۔ یہ دونوں قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان تعلق بھی ہو۔'' پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

مصوری میں ونود کا ذوق عام آدمی سے بہتر نہیں تھا جو وہ اچھے منظر کی یا خوب صورت چہروں کی تصویر دیکھ کر تعریف کر سکتا تھا۔ دل میں سراہے اور نہ ہی داد دینے کے الفاظ کی ادائیگی کیسے کی جاتی ہے اور کس تصویر کی کن الفاظ میں ادا کرے۔ مگر وہ فن کی باریکی یا تجریدی مصوری سے نا آشنا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ تجریدی آرٹ کی نمائش دیکھی تھی۔ اس میں کل بائیس پینٹنگز تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا اس کے دوست نے سمجھایا تو اس کے پلے نہ پڑا۔ اسے لگا کہ کسی شریر بچے یا پھر کئی بچوں نے مل کر ان کے کینوس پر مختلف رنگ گرا کے برش اور جھاڑو پھیر دی ہو۔۔۔ چناں چہ پدمنی کے گھر میں اپنی صورت کا خوب صورت سا نقش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنی صورت کو ہمیشہ آئینے میں دیکھا تھا کسی مصور کی نظر سے نہیں تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ''بڑے شہر کا بڑا جاسوس''

اس نے وہیں ایک آئینے میں اپنا عکس تصویر سے ملا کر دیکھا اور مزید حیران ہوا۔ خیر۔۔۔ مصور کی نگاہ جس انداز سے چاہے دیکھے۔ جانے لوگ اسے کس کس نظر سے دیکھتے ہوں گے۔۔۔ وہ کسی کی نگاہوں پر پہرا بٹھا تو نہیں سکتا۔۔۔ اس نے دل کو تسلی دی۔۔۔ یہ بھی کیا کم ہے۔ ایک مصورہ نے اسے اتنی اہمیت دی۔ جب کہ وہ فلمی ستاروں کی تصویریں بنانے کو اہمیت دیتے ہیں۔

اس کے خیالات کی رو یک لخت ٹوٹ گئی۔ باہر سے سیٹی بجانے کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اور گیت کی لے وہی تھی۔ ونود نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کے دیکھا۔ پرشاد اپنے مخصوص انداز دیوانگی میں لہراتا ہوا آ رہا تھا۔ قریب آ کے وہ رکا اور اس نے ایک نظر دائیں بائیں ڈالی۔ اس ایک نظر میں دیوانگی نہیں تھی۔۔۔ احتیاط تھی۔۔۔ اسے یقین آ گیا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آیا۔ ونود نے اسے دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔۔۔ پلٹا اور دس قدم دور جھاڑیوں کے پیچھے ہی چھپ گیا۔

پرشاد کی شخصیت اس کے لیے روز بہ روز پراسرار بنتی جا رہی تھی لیکن اس وقت اس کا رویہ ونود کے لیے باعث تشویش بن گیا تھا۔ کیوں کہ پدمنی گھر کھلا چھوڑ کے نہ جانے کہاں نکل گئی تھی اور یہ بھی نہ معلوم تھا کہ کب لوٹے گی۔۔۔ پرشاد کی یہاں اس طرح سے آنا اور چھپ کر آنا اور انتظار کرنا بے مقصد نہیں تھا اور یہ مقاصد بہر حال نیک نہیں لگتے تھے۔

وہ اب واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پرشاد کی آمد کے بعد اسے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

یہ خوب صورت اور نازک سی لڑکی جس کے ہاتھ رنگوں سے جادو جگانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تنہا تھی اور اس دور افتادہ مقام پر جہاں کوئی

پاگل یا جنونی دو قتل کر چکا تھا قطعی غیر محفوظ تھی۔ جب پانچ منٹ کے بعد ونود کو پدمنی کی شکل نظر آئی تو اس نے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے لیے پدمنی کا انتظار اذیت ناک بنا ہوا تھا۔

باہر شام کا اندھیرا اب رات کی سیاہی کی آغوش میں سما چکا تھا۔ ونود گھر سے نکل کے جھاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں پرشاد دبکا ہوا تھا اور پدمنی اس کے اور ونود سے قطعی بے خبر تھی۔

''پرشاد۔۔۔!'' ونود نے پدمنی کی آواز سنی۔

''پھر وہی شرارت۔۔۔ چلو باہر نکلو۔'' وہ پرشاد کو یوں ڈانٹ رہی تھی جیسے کوئی تربیر بچہ ہو۔ پرشاد خفت زدہ سا جھاڑی سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس وقت تک ونود بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ پدمنی اسے دیکھ کر حیرت اور مسرت سے مسکرائی۔

''آپ۔۔۔ آپ کب سے انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوگئی؟''

''میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے بڑی آسانی سے پرشاد کو تلاش کر لیا۔'' ونود نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ اس قسم کی آنکھ مچولی کی عادی ہیں۔'' اس کی نگاہ پرشاد کے چہرے پر جمی رہی جو نروس ہو رہا تھا۔ پدمنی دل کش انداز سے ہنسی اور پھر اس نے پرشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔۔ پرشاد ایسی بچکانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔۔۔ میں اس کی ان حرکتوں کی عادی ہو چکی ہوں۔''

''بچکانہ۔۔۔'' ونود نے بے خیالی میں کہا۔ پھر وہ مسکرایا۔ ''پرشاد۔۔۔! تم مجھ سے کشتی لڑو گے۔۔۔؟''

''کشتی۔۔۔۔'' پرشاد اس غیر متوقع سوال پر بوکھلا کے پیچھے ہٹا۔ ''مگر۔۔۔'' وہ ہکلایا۔

''ڈرو نہیں۔۔۔ آنکھ مچولی تو لڑکیاں کھیلتی ہیں۔'' ونود نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''کشتی مردوں کا کھیل ہے۔۔۔ آؤ۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔

مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ونود کے لیے ناقابل یقین تھا۔ اس کی حیرت دو چند ہوگئی۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ اس کا وہم ہو۔

پرشاد کوندے کی طرح لپکا اور ونود کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ کسی آہنی شکنجے کی طرح لپٹ گئے۔ بیک وقت ونود کے دونوں پیر زمین سے یوں رند گئے جیسے زمین نیچے سے ہٹ گئی ہو۔ پھر ونود نے خود کو فرشی خاک پر چت لیٹا ہوا پایا۔

پرشاد اس پر سوار تھا اور ونود کے لیے اٹھنا تو درکنار وہ جنبش کرنا بھی محال ثابت ہو رہا تھا۔ کیوں کہ پرشاد اس کی چھاتی پر سوار تھا۔ اس نے دائیں بائیں پلٹ کر خود کو چھڑانے کی اور کھڑے ہونے اور اٹھنے کی انتہائی کوشش کی مگر پرشاد نے کسی فری اسٹائل ریسلنگ کے پہلوان کی طرح ہلنے تک نہیں دیا۔ اسے پرشاد نے ایسا قابو میں کیا تھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال سے پدمنی بھی گھبرا گئی تھی۔ پھر وہ پرشاد کو سمجھانے لگی تھی کہ پرشاد بس کرو۔۔۔ تم جیت گئے۔ اب ہٹو۔۔۔ مسٹر ونود کو اٹھنے دو مگر ونود نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس طرح کہ پرشاد نے یہ اشارہ نہیں دیکھا۔

''ٹھیک ہے، پرشاد۔۔۔! تم نے دشمن کو زیر کر لیا۔۔۔ اب تم کیا کرو گے۔'' ونود نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اکسانے کے انداز میں کہا۔ پرشاد کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک کوند گئی۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

اس کے ہاتھ ونود کی گردن پر جم گئے۔ آہستہ آہستہ دباؤ بڑھنے لگا اور ونود کا سانس رکنے لگا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ پرشاد کے ہاتھوں میں اتنی قوت پوشیدہ ہے۔۔۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔۔۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں رنگین دائرے جھلملانے لگے تھے اور اس کا سارا وجود زندہ رہنے کی جدوجہد میں شریک تھا۔ وہ تو اسے واقعی

زندہ درگور کرنے پر تل گیا تھا۔

لیکن اب پرشاد کو ہٹانا یا زبان سے منع کرنا۔۔۔ تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔

پدمنی کی چیخ ایک دہشت زدہ پکار تھی۔ وہ ہذیانی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''پرشاد! پرشاد۔۔۔ بس، بس دیکھو تم ونود کو مار ڈالو گے تم جیت گئے فاتح بن گئے تم سکندر اعظم بن گئے۔ اچھا اب ہٹو اچھا یہ لو ادھر دیکھو لال اور نیلا اور پیلا رنگ ہر ٹیوب میں صرف ایک رنگ ہے۔ تم چاہے تو ایک رنگ لے لو یا پھر تمام رنگ بھی لے سکتے ہو۔''

پدمنی نے ذہانت سے کام لیا تھا مگر اس پر ہسٹریا کا اثر غالب تھا۔

پدمنی کی بات سنتے ہی پرشاد کے ہاتھوں ونود کی گردن کو چھوڑ دیا۔

پھر وہ ونود کو یک لخت بھول کر ایک دم سے اٹھا اور لال نیلے پیلے رنگوں کی طرف بڑھا جیسے ان کی کشش کے سامنے وہ بے بس ہے۔

پدمنی غیر محسوس انداز سے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ پرشاد کو دس قدم لے جانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کی کوشش کامیاب ہوگئی۔ پھر اس نے اپنے سارے رنگ پرشاد کے حوالے کر دیے۔۔۔ پرشاد کا چہرہ فرط مسرت سے دیکھنے لگا۔ یہ رنگ جیسے اس کی بہت کم زوری اور ان کے حصول کی خواہش تھی۔ پھر وہ انہیں جیب میں ٹھونس کر اور پلٹ کر دیکھے بغیر جنگل میں گم ہوگیا۔

پھر چند ساعتوں کے بعد اس کی سیٹی سنائی دینے لگی۔ چاند کا ایک شہزادہ تھا۔ ایک زمین کی شہزادی۔۔۔ ایک دن شہزادی نے کہا۔۔۔ ونود فرش پر لیٹا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پدمنی نے اس کی حالت پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس نے اپنا مرمریں ہاتھ بڑھایا اور اسے اخلاقاً سہارا دیا۔

''مجھے امید نہ تھی کہ پرشاد اتنا طاقت ور ہوگا۔'' پدمنی نے ونود کے اٹھنے کے بعد کہا۔

''ہاں۔۔۔ اندازہ تو میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔'' ونود نے کپڑے جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن اس کی جسمانی قوت کے علاوہ پرشاد کی صلاحیت خود میرے لیے ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز ہے۔''

وہ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ونود نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''مس پدمنی۔۔۔! پلیز! آپ میری ایک بات مانیں۔ ایسے جنگل میں آپ اکیلی نہ گھوما کریں۔ خصوصاً شام کے بعد۔۔۔ اگر دل شام کے وقت سیر کے لیے کرتا ہے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آبادی کے قریب کوئی گھر لے لیں۔ کوئی نہ کوئی معقول کرایہ پر دے دے گا

''مجھے کچھ نہ ہوگا آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔'' وہ دل کش انداز سے مسکرادی۔ ''میں خوامخواہ لوگوں کو چیلنج کرتی نہیں پھرتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ونود بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ ''یوں بھی یہ کام آپ کا نہیں ہے مگر اس کے باوجود آپ نے ایک شریف آدمی کی اچھی بھلی صورت کا کارٹون بنا کے۔۔۔ کیا مجھے چیلنج نہیں کیا ہے۔۔۔ کاش! میں بھی مصور ہوتا تو۔۔۔''

''تو۔۔۔'' وہ بولی۔ ''پھر کیا آپ میرا کارٹون بنا دیتے۔ کارٹون بنانا بہت آسان ہے۔''

''جی نہیں۔۔۔ ایسی تصویر بناتا کہ مس ورلڈ نہ سہی مس انڈیا لگتیں۔'' پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

بھگوان کے کارخانے میں سکون اور شانتی صرف سادی کی آغوش میں مل سکتی ہے۔ ونود نے کسی فلسفی کی طرح طے کیا اور ویلیم کی مقررہ دو گولیاں کھانے کے بعد روشنی گل کر کے روانہ ہوگیا۔۔۔ لوگ جو دہلی کے شہروں میں رہتے ہیں انہیں چاند نگر جیسے گاؤں سکون کا کہوارہ لگتے ہیں دور کے ڈھول سہانے۔۔۔ اس نے تمام فضول خیالات کو ذہن سے خارج کرنے کی کوشش کی اور دھیرے دھیرے

خوابوں کی نگری کی طرف بڑھنے لگا۔ جب سکوت شب میں دل خراش چیخوں سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس کو بھی خواب سمجھا۔۔۔ مگر خواب تو کچھ اور ہی تھا۔ اس نے سوچا پھر اس کی نگاہ کلائی کی گھڑی پر گئی۔۔۔ اسے سوئے ہوئے صرف چالیس منٹ ہوئے تھے۔۔۔ پلک جھپکتے ہی وہ بستر سے کود گیا۔ پتلون چڑھانے کے بعد قمیص پہنتا ہوا وہ باہر بھاگا۔ دوڑتے دوڑتے اس نے بٹن لگائے اور قمیص کے لہراتے ہوئے دامن کو پتلون کے اندر کیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اس احاطے کے باہر جا پہنچا جہاں قریب سے آنے والے چار پانچ افراد پہلے سے موجود تھے۔ مزید لوگ مختلف سمتوں سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔'' ونود نے حیرانی سے کہا 'اندر ایک عورت مدد کے لیے چلا رہی ہے اور آپ لوگ کھڑے سن رہے ہیں۔

وہ لکڑی کے پھاٹک پر سے اندر کود گیا۔ باقی لوگوں نے بھی شرمندہ ہونے کے بعد اس کی تقلید کی۔

''کون رہتا ہے یہاں۔۔۔؟'' ونود نے دوازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بڑھیا مسز شکنتلا۔۔۔'' کسی نے جواب دیا۔ ''اس کی حبشی جیسی مدراسن کالی بہو۔۔۔ کنواری بیوہ مس امرتا۔''

ونود نے یہ احمقانہ جواب دینے والے کو گھور کے دیکھا اور دروازے کو ٹکر ماری۔ ''دروازہ کھولو۔۔۔ ہم مدد کے لیے آئے ہیں۔''

دروازہ کھل گیا اور ونود نے اپنے مقابل اس سیاہ فام جیسی مدراسن دبلی پتلی لڑکی کو جس کا محبوب اقوام متحدہ کے امن مشن میں ویت نام جا کر مارا گیا تھا تو اس نے باقی عمر شادی کے بغیر گزارنے کی سوگند کھالی تھی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں مسلسل چیخ رہی تھی۔

مس امرتا ہانپنے لگی۔ ''میں۔۔۔ میں سو رہی تھی۔۔۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔۔۔ کوئی۔۔۔ مسز شکنتلا کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اف!'' اس کے بدن نے جھرجھری سی لی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

''بلیک بیوٹی۔۔۔! لیکن پرکشش۔'' مجمع میں سے دو چار افراد کی استہزائیہ انداز سے ہنسنے کی آواز آئی۔ گلا اس کا کوئی گھونٹ رہا تھا تو تمہیں چلانے کی کیا ضرورت تھی

''شٹ اپ۔۔۔'' ونود نے گھوم کر کہا۔ ''خواب میں تم اپنی ماں کو قتل ہوتا دیکھو گے تو کیا سکون سے سوتے رہو گے؟''

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور پھر کسی نے ہنسنے اور کھسر پھسر کی کوشش نہیں کی۔ ''ہاں مس امرتا۔۔۔!''

''پلیز۔۔۔ پہلے میری بات سن لیں۔'' وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''خواب سچ بھی تو ہو جاتے ہیں نا۔ میری آنکھ کھلی تو۔۔۔ تو شریمتی شکنتلا دیوی کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔''

ونود بات پوری ہونے سے قبل ہی آگے نکل گیا تھا۔ ''کون سا کمرہ ہے اس کا۔۔۔ کیا اوپر والا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔'' لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ ''نیچے والا آخری کمرا۔۔۔ موٹی عورت اوپر نہیں چڑھ سکتی۔۔۔ اسی لیے یہ کمرا اس نے اپنے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔''

کمال ہے۔۔۔ ونود نے رخ بدلتے ہوئے سوچا۔۔۔ لوگوں کو یہ بات تک معلوم ہے کہ کون کس کمرے میں ہوتا ہے۔۔۔ اسے اینا کی ہم وزن اور ہم جسامت شکنتلا۔۔۔ کا چہرہ بھی یاد آ گیا تھا۔۔۔ مسز سادھنا نے کہا تھا کہ وہ گاؤں کی سب سے دولت مند خسیس اور کمینی عورت ہے۔

شریمتی شکنتلا دیوی واقعی مر چکی تھی۔۔۔ لیکن اس کی موت سے امرتا کے منحوس خواب کی تعبیر کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دھڑ مسہری پر تھا مگر کچھ

اوپر کھسک گیا تھا۔۔۔ مسہری کے سرہانے منقش ستون سے تھے جن کی نقاشی کا نمونہ مسہری کے ہر پائے پر بھی نظر آ رہا تھا۔ شریمتی شکنتلا دیوی کی گردن شیشم کی لکڑی کے دو فٹ اونچے اور تقریباً تین انچ قطر کے مینار جیسے ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ کسی نے پیچھے سے اس کی گردن کے گرد نائلون کی ایک انچ موٹی رسی کا پھندا ڈال کے کھینچ لیا تھا۔۔۔ اسے یقیناً شریمتی شکنتلا دیوی جیسی بھاری بھرکم عورت کو گھسیٹنے کے لیے خاصی قوت صرف کرنی پڑی ہو گی۔۔۔ قاتل نے بعد میں رسی کو مزید دو بار گردن کے گرد گزارا تھا اور گانٹھ باندھ کے رخصت ہو گیا۔۔۔ ونود نے ایک نظر مرے پر ڈالی۔۔۔ کارنس پر ڈبل فریم میں دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔۔۔ ایک نسبتاً معمر آدمی کی اور دوسری نوجوان کی۔۔۔ صورتوں کی مشابہت خود بتاتی تھی کہ وہ باپ بیٹا ہیں۔۔۔ دونوں وردی میں تھے۔ شریمتی شکنتلا دیوی کا پتی اور اس کا بیٹا جو ویت نام کی اجنبی مٹی میں مل گیا۔ باپ کو نہ جانے کس محاذ پر کس زمین کی قبر ملی ہو گی ونود نے سوچا۔

دوسرے کمرے میں کالی لڑکی مس امرتا بھی چیخ رہی تھی لیکن مدد کی پکار دیوانگی کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ وہ روتے روتے اچانک ہنسنے لگتی تھی اور اس کی ہنسی کسی ویرانے والی چڑیل کی ہنسی سے زیادہ دہشت ناک تھی۔

ونود نے واپس آ کر ان لوگوں کو دیکھا جو کمرے میں تماشائی بنے کھڑے ہوئے تھے اور مس امرتا کی بکواس سن رہے تھے مگر خوف و صدمے کی شدت نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر رکھا تھا۔ مس امرتا ہاتھ میں شراب کی ایک بوتل لیے دہلیز میں آ کھڑی ہوئی تھی اور بوتل منہ سے لگائے پیتی جا رہی تھی۔ ایک بلانوش کی طرح۔

''دیکھو۔۔۔ یہ دیکھو تمہارے آباؤ اجداد نے کبھی پی۔۔۔ کتنی قیمتی اور نایاب اور ہزار برس پرانی ہے۔'' وہ بوتل اٹھائے مجمع کو مخاطب کرتی استہزائیہ انداز سے بولی۔ ''پینا تو درکنار اس کی شکل تک نہیں دیکھی ہو گی۔۔۔ سفید کتو۔۔۔ اب میں ہر روز صبح و شام یہی پیوں گی۔۔۔ کیوں کہ اب میں بہت دولت مند ہوں۔۔۔ تم لوگ مجھے کالی چڑیل۔۔۔ ڈائن کہتے رہتے ہو نا۔۔۔ میں سارے سفید کتوں کو خرید سکتی ہوں۔۔۔ سب کو غلام بنا سکتی ہوں۔ تمہیں اپنی سفید چمڑی پر بڑا ناز ہے نا۔۔۔ تم کتوں کی طرح میرے چرن چاٹو گے۔'' اس نے توقف کر کے ایک قہقہہ مارا اور بوتل منہ سے لگالی۔

ونود کے ہاتھوں نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھیننے تک تین چوتھائی بوتل کر دی تھی۔

''تو۔۔۔ تو سفید کتے۔۔۔ تو۔۔۔ تو کون ہوتا ہے۔۔۔ کیا یہ بوتل تیرے باپ کی جو تو چھیننا چاہتا ہے۔''

ونود کا ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ گرتے گرتے بچی اور لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی تو دیوار سے لگے ہوئے بستر پر جا گری اور اس کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا۔

پھر ونود نے پلٹ کر لوگوں کو دیکھا جو تماشائی بنے ہوئے تھے۔

''جاؤ۔۔۔ کوئی کرشن کو جلدی سے بلا کے لاؤ۔۔۔ باقی سب باہر۔'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''یہاں کوئی تماشا نہیں ہو رہا ہے۔ سمجھے۔''

ونود کے تحکمانہ انداز اور سخت لہجے کے سامنے کسی نے لب نہیں کھولے۔ سب کے نکل جانے کے بعد ونود نے دروازہ بند کر دیا۔ امرتا اب بستر پر منجمد بیٹھی تھی۔

''یہ کیا بکواس ہے۔۔۔'' ونود نے اسے مس امرتا کہہ کے مخاطب کیا اور برہمی سے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے۔ یہ سب مل کر کیا کر سکتے ہیں۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ سب میرے خلاف گواہی دے سکتے ہیں کہ میں قاتل ہوں۔'' امرتا نے تلخی سے کہا۔ ''کیوں کہ جانتے ہیں

رادھا۔۔۔ میرا مطلب شریمتی شکنتلا دیوی اس گاؤں کی دولت مند عورت تھی جس نے مجھے اپنا وارث بنا دیا تھا۔۔۔ قانونی طور پر۔۔۔ اس کا وصیت نامہ وکیل کے پاس ہے۔۔۔ ایک روز اس نے اس خبیث عورت کے ظلم و ستم سے نفرت کرتے ہوئے مجھے رازدارانہ انداز سے بتایا اور سوگند لی کہ میں یہ راز عیاں نہ کروں۔۔۔ اور اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے بہت جلد کر دیتا۔۔۔ جو میں نہ کر سکی تھی۔"

"مسز شکنتلا کا وصیت نامہ یا تحریری دراثت نامہ کس کے پاس ہے۔" ونود نے سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

"وکیل کے پاس۔۔۔ اب بڑھیا مر گئی ہے تو میں اس علاقے کی سب سے دولت مند عورت ہوں۔" وہ پھر ہسٹریائی انداز سے ہنسی۔ "میں نہ صرف کروڑ پتی عورت ہوں بلکہ اس گاؤں کی معزز ترین۔۔۔ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوگی وہ اتنی ہی معزز کہلاتی ہے۔۔۔ میں بلیک بیوٹی ہوں۔ کنواری بیوہ۔۔۔ کالی چڑیل۔۔۔ ڈائن۔۔۔ منحوس۔۔۔ آج بلکہ ابھی اور اسی وقت سے یہ سارے خطابات ختم۔"

"میں نے سنا تھا کہ بڑھیا تم سے سخت نفرت کرتی تھی اور اس نے تم پر ظلم و ستم کے بہت پہاڑ توڑے ہیں۔۔۔ تمہارا جینا حرام کیا ہوا تھا۔"

"آپ نے ٹھیک سنا۔۔۔ اس میں رتی بھر مبالغہ نہیں۔۔۔ اس لیے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اس چڑیل کے ظلم سے واقف نہ ہو۔۔۔ بچہ بچہ بھی بتا سکتا ہے۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس نے اپنی تمام دولت مجھے آسانی سے بخش دی۔" پھر وہ ہنسی۔

"اس کمینی نے مجھے رلا رلا کے۔ تڑپا تڑپا کر۔۔۔ ذلیل کر کے میرے ساتھ کتوں سے بھی کہیں بدتر سلوک کر کے مجھے اس دولت کی زنجیر سے باندھ رکھا۔۔۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے قتل کر دوں۔ ہر رات جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتی تھی تو میرے ذہن میں یہی خیالات پرورش پاتے رہتے تھے کہ اسے کیسے ماروں۔۔۔ یوں تو طریقے بہت تھے لیکن الزام ہر صورت میں مجھ پر ہی آتا تھا۔۔۔ چنانچہ میں کچھ نہ کر سکی۔ صرف سوچ کے رہ جاتی۔ لیکن خواب میں اسے ہزار بار عذاب دے دے کر دیکھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر ختم ہو رہی تھی۔۔۔ اور میں اس کی حالت پر رو نہیں رہی ہوں۔"

اب اس پر نشہ غالب آنے لگا تھا۔ چنانچہ ونود نے اسے بولنے دیا۔ کیوں کہ نشے میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

"اس وقت بھی میں خواب دیکھ رہی تھی۔۔۔ یہی خواب کہ اس کا کوئی گلا گھونٹ رہا ہے۔ کوئی سایہ سا ہے جو میرے قریب سے گزرا ہے۔ پھر میں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے اٹھ کے دیکھا تو بھگوان نے میری سن لی تھی اور۔۔۔"

"مس امریتا۔۔۔! یہ راز کی بات ہے۔" ونود نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ "ہر طرف خاموشی ہوگی۔۔۔ تم نے آنے جانے والوں کے قدموں کی آہٹ تو نہیں سنی تھی۔۔۔ مگر ذرا سوچو۔۔۔ شریمتی شکنتلا دیوی کے چلانے کی آواز آئی تھی یا کسی اور کی آواز سنی تھی تم نے۔۔۔ جسے تم پھر سنو تو پہچان لو۔۔۔ ذہن پر زور دو۔۔۔ شاید وہ آواز شناسا ہو۔۔۔ آشنا ہو۔"

امریتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے ذہن پر زور دے کر کہا۔

"مجھے صرف ایک بات یاد ہے۔۔۔ وہ بڑا حوصلہ مند شخص تھا۔۔۔ جاتے وقت وہ ذرا بھی نروس نہیں تھا۔۔۔ کیوں کہ قتل کرنے کے بعد کوئی مزے سے سیٹی بجاتا ہوا نہیں جا سکتا۔۔۔ اتنے سکون اور بے خوفی سے قتل کرنا" اس نے جملہ نامکمل اور نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں یاد ہے وہ سیٹی پر کیا دھن بجا رہا تھا۔"

ونود نے حیران ہوئے بغیر کہا۔

''ہاں۔۔۔ ہاں مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔۔۔ اس لیے کہ اس کے لبوں پر میری کہانی کا گیت تھا۔'' امرتا ہنسی۔ ''میں زمین کی شہزادی ہوں نا۔۔۔ اور تم۔۔۔ چاند کے شہزادے ہو۔۔۔ وہ میرا اور تمہارا گیت تھا۔۔۔ آؤ، میرے پاس آجاؤ۔'' اس نے اپنی مرمریں گداز اور عریاں باہیں پھیلا دیں۔ ''میں صدیوں سے، برسوں سے تمہارے انتظار میں ہوں۔۔۔ چاند کے شہزادے۔۔۔''

کرشن دروازے پر نمودار ہوا اور زیر لب مسکرایا۔ ''اور کچھ بتایا زمین کی کالی شہزادی نے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ آپ کا کام ذرا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔'' ونود نے اپنی متانت برقرار رکھی۔ ''آپ کا واسطہ کسی ایک ہی قاتل سے ہے جو انتہائی چالاک ہے۔ بظاہر معصوم مگر بے حد سفاک۔۔۔ یہ سارے خون اس ایک آدمی نے کیے ہیں۔''

''یہ تو خاصی کام کی بات معلوم ہوگئی۔'' کرشن کے لہجے میں طنز بھرا ہوا تھا۔ ''آپ اس شخص کا نام بھی بتا دیں تاکہ میں اسے گرفتار کرلوں۔''

☆☆☆

گاڑی سمندر کے ساحل پر پہنچ کر رک گئی۔ ان کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔

اب تک ان دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کار کا انجن بند ہو جانے کے بعد رات کے دھندلکے اور سناٹے میں سمندر کی جھاگ اڑاتی موجوں کا شور تیز ہو گیا تھا۔ نم آلود خنک ہوا اس کے بال اڑانے لگی تھی۔ اس نے ریشم کے کالے بادلوں جیسے ڈھیر کو پیچھے کیا اور اسکارف سے باندھ لیا۔۔۔ گوپال اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک سرد آہ بھری۔

''یوں لگتا ہے جیسے تمہیں ایک ہفتے بعد نہیں بلکہ ایک صدی بیت جانے کے بعد دیکھا ہے۔''

''گوپال! میں جھوٹ بول کر پارٹی کے بہانے سے نکلی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''اس وعدے کے بعد کہ پارٹی میں تم سے بات بھی نہیں کروں گی۔۔۔ میری یہ بات تم یاد رکھنا گوپال۔۔۔۔'' اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔

''یہ کتنی بڑی سزا ہے میری جان مونا۔۔۔! میں اور تم اتنے پاس رہ کر بھی دور ہیں۔۔۔ کیوں کہ ہمارے درمیان جو سماج حائل ہے وہ محبت کرنا جانتے ہی نہیں۔۔۔ جو صرف نفرت کر سکتے ہیں۔۔۔ معلوم نہیں اس زندگی کی ایک غلطی کا عذاب کب ختم ہوگا۔''

''میں نے تمہیں چاہنے کے سوا کوئی غلطی نہیں کی ہے گوپال۔۔۔!'' وہ سرگوشی میں آہستہ سے بولی۔ ''ہمارے ہاں محبت کرنا کیوں جرم ہے۔''

گوپال نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ گوپال دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے اندھے سمندر کو دیکھتا رہا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چاہت کا ایک ہی جذبہ امرت رس بن جاتا ہے اور زہر کا پیالہ بھی۔۔۔ ایک عورت وہ بھی تھی جس کی چاہت کے فریب میں گوپال نے جذبات کی سرحدوں کو عبور کر کے مذہب، رسم و رواج اور قانون کے تقاضے پورے کیے تھے اور شادی کے چند ماہ بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تہی دست رہ گیا ہے۔ نہ اس کے پاس باپ کی چھوڑی ہوئی دولت تھی اور نہ بیوی کی محبت جو اسی دولت کے دم سے زندہ تھی۔ پھر اس پر حقائق کا ہر انکشاف ظلم کا پہاڑ بن کے ٹوٹنے لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ اتنی خوب صورت اور پرشباب گداز بدن کی نظر آنے والی شعلہ مجسم اور ایسی خوب صورت پیار بھری باتیں کرنے والی بیوی کتنی بڑی اداکارہ ہے۔۔۔ وہ ایسی ہی محبت پہلے بھی اپنے دو سابق شوہروں سے کر چکی تھی۔ چناں چہ محبت کے مکالمے اسے ازبر ہو چکے تھے۔

گوپال کو بہت کچھ پہلے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا۔۔۔ مثلاً یہ کہ جب دولت نہ رہے گی تو وہ بیوی کے اخراجات کا بار کیسے اور کیوں اٹھائے گا۔۔۔ قیمتی

ملبوسات۔۔۔ سامان آرائش اور زیورات۔۔۔ نائٹ کلب۔۔۔ ریس اور جوئے خانوں۔۔۔ عالمی ہوٹلوں اور سیر و تفریح کے اخراجات جس کے لیے قارون کا خزانہ بھی بالآخر کم ثابت ہوتا۔۔۔ اور جب یہ اخراجات نہیں ہوں گے تو صرف محبت نہیں ہو گی۔۔۔ بیوی سر دلاش کی طرح اپنے آپ کو حوالے کر دے گی اور اس کی محبت، مہربانی اور فیاضی رخصت ہو جائے گی۔ محبت کا گہرا جذبہ تو در کنار اس کی رمق بھی نہ ہو گی۔۔۔ بیوی کی محبت اور قربت ایک ایسی دولت ہوتی ہے جو ان کو سرور اور شانتی بخشتی ہے۔

بیوی کو خواب ناک زندگی نہ دینے کی صورت میں وہ صرف نام کی بیوی ہو گی اور اس کے حسن کے پرستار ہوں گے جو اس کی مصروفیات کا سلسلہ دراز کرنے کی ذمے داری قبول کر لیں گے۔۔۔ وہ قانوناً بیوی کا کہیں آنے جانے پر اور کسی سے ملنے پر کوئی پابندی عائد نہ کر سکے گا اور پھر اس دور میں بیوی روایتی اور ڈگر پر چلنے والی نہ رہی تھی۔

اختلافات کے ایک برس بعد وہ مونا سے ملا تھا اور چھ مہینے تک اس عشق کی صداقت کو ہر پیمانے پر آزمانے کے بعد یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مونا سراب نہیں۔۔۔ درحقیقت زندگی کے صحرا میں اس نخلستان تک آ گیا ہے جہاں مرادوں کی منزل ہوتی ہے اور اس میں عافیت بھی ہے۔ اس نے مونا سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔۔۔ کیوں کہ بعد میں اسے یہ بات معلوم ہوتی تو اعتماد کا آئینہ ٹوٹ کے بکھر جاتا۔۔۔ مونا اس کا درد سمجھ لینے کے بعد اس کا درماں بن گئی۔

دوسرے لوگ صرف انگلیاں اٹھانا جانتے تھے اور دوسروں کی آنکھ میں تنکا تلاش کرنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھنا نہیں جانتے تھے۔ پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔۔۔ مونا کے والدین نے پرانا حربہ استعمال کیا اور مونا کو دھمکی دی کہ اس نے ایک شادی شدہ مرد سے معاشقہ نہ چھوڑا وہ بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیں گے۔۔۔ گوپال نے طلاق کے لیے بیوی سے بات کی۔۔۔ لیکن حقیقت کا علم ہوتے ہی وہ اڑ گئی کہ طلاق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ وہ جو اسے خوش کرتی اور کسی بات سے انکاری نہیں ہوتی ہے۔۔۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ اس کا اپنا ازدواجی مستقبل برباد ہو چکا تھا۔ اور وہ اس کا بدلہ ایسے ہی لے سکتی تھی کہ گوپال کسی کے ساتھ اور کسی کو گوپال کے ساتھ آباد نہ ہونے دے۔ وہ گوپال کے ساتھ رہتے ہوئے ایک اجنبی عورت بن گئی تھی۔ اس کے جذبات اور احساسات تک کا خیال نہیں کرتی تھی۔۔۔ اور پھر وہ ایسے جلوے دکھاتی کہ گوپال اسے پانے کی حسرت کی آگ میں جلتا رہے۔ اس لیے بھی کہ وہ شعلہ مجسم تھی۔ اگر اس کی زندگی میں مونا نہیں آئی ہوتی تو وہ بیوی کے قرب اور حشر سامانیوں سے احساس محرومی میں مبتلا ہو جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنا جلد ہو سکے مونا اس کی جیون ساتھی بن جائے۔۔۔ چھپ چھپ کر ملنا ان دونوں کو پسند نہیں تھا۔ نہ ہی وقت گزاری۔

دو ماہ کے بعد مونا کے کہنے پر اس نے وکیل سے رابطہ کیا۔ مشورہ کیا تو اسے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے اپنی لالچی بیوی سے آزادی خریدنے کی کوشش کی مگر وہ گھر سے جا چکی تھی۔ گوپال اسے ساری دنیا میں کہاں کہاں تلاش کرتا۔۔۔ وہ دل شکستہ لوٹ آیا۔ مونا کو قائل کیا جا سکتا تھا۔ دنیا اور عدالت کو نہیں۔۔۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا جرم تھا۔۔۔ عجیب قانون تھا کہ کسی غیر عورت سے تعلقات رکھنا اور میاں بیوی کی طرح رہنا شادی جیسا جرم نہیں تھا۔ اس کی وہ سزا نہیں تھی جو دوسری شادی کرنے پر تھی۔

مونا گاؤں کی لڑکی تھی۔ فلم کی ہیروئن نہیں۔۔۔ اس نے گوپال سے ملنا چھوڑ دیا تو گوپال تقریباً پاگل ہو گیا۔۔۔ لیکن اس جدائی نے خود مونا کے لیے زندگی کو روگ بنا دیا اور وہ چھپ چھپ کر

گوپال سے ملتی رہی۔ تاہم اس میں گھر سے فرار ہونے کی جرات پیدا نہ ہوسکی۔

”گوپال۔۔۔!“ مونا نے بیکراں سمندر کی دولت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ماں بننے والی ہوں۔۔۔ جس کا خوف، اندیشہ اور خدشہ تھا۔ ان ملاقاتوں کا یہی نتیجہ نکلنے والا تھا۔۔۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ آئے دن کی تنہائی میں ملاقاتیں رنگ ضرور لائے گی۔ لیکن کہتے تھے کہ مونا۔۔۔! کیا کروں۔۔۔ میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔۔۔ میری اس محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔۔۔ میل نہیں ہے۔۔۔ جنگ اور محبت پر بات جائز ہو جاتی ہے۔۔۔ میں [illegible] نہیں۔۔۔ [illegible] جوانی [illegible] میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہوں۔۔۔ میں بیوی سے طلاق لے کر جتنا جلد ہو سکے ایک ہو جائیں گے۔ لیکن جو سوچا وہ نہ ہو سکا۔ تم تمام حالات سے باخبر ہو۔۔۔ اب کیا ہوگا میری جان گوپال!

گوپال نے چونک کر اسے اوپر سے نیچے اور اس کے چہرے کو دیکھا۔۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا اور یوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔ مونا ماں بننے والی ہے۔۔۔ ایک بچے کی ماں۔۔۔ میرے بچے کی ماں۔۔۔ اس بچے کی ماں جس نے میری بیوی کے بطن سے جنم لینا قبول نہ کیا۔۔۔ اس نے مونا کا چاند جیسا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

”مونا۔۔۔! پانی سر سے اوپر گزر چکا ہے۔ دیکھو مونا۔۔۔! اب ہم اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔۔۔ کیوں کہ یہ دنیا ہمیں جینے کا حق نہیں دے گی۔ نہ تمہیں اور نہ مجھے اور نہ ہمارے بچے کو۔۔۔ چلو ہم یہاں سے دور بہت دور چل کر بسا لیتے ہیں ہم گنہ گار ان فرشتوں کی دنیا سے جو اسے اپنی جنت سورگ اور جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔۔۔ جن کے ہاتھوں میں پتھر ہیں۔ اگر دنیا ہمیں سنگسار کرتی ہے تو کرے۔۔۔ ہم ایک ساتھ تو مریں گے۔۔۔ مونا! اب انکار کا وقت نہیں رہا ہے۔۔۔ وقت جو کسی کا نہیں ہوتا ہے۔۔۔ وہ اندھا ہوتا ہے۔۔۔ بس گزرتا ہے اور گزرتا چلا جاتا ہے۔۔۔ بولو اب تم کیا کہتی ہو۔۔۔؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ وقت کبھی مہلت نہیں دیتا ہے۔ اب اس کی گنجائش نہیں رہی۔“ مونا نے جذباتی ہو کر ایک سرد آہ بھری۔ ”چلو۔۔۔ تم۔۔۔ جہاں کہو گے میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری بیوی لوٹ آئے۔“

”وہ کبھی نہیں آئے گی۔ کیوں آنے لگی۔ کیوں کہ وہ اپنا حسن وشباب اور بھرپور جوانی اور حشر سامانیاں [illegible] رہی ہے۔۔۔ وہ ایک طوائف سے بھی بدتر ہے [illegible] بستروں کی زینت بنی رہتی ہوگی۔۔۔ اس کے وجود میں بے پناہ غلاظت ہوگی۔۔۔ میرے خیال میں تو ایک طوائف بھی بہتر ہوگی۔۔۔ اسے طوائف نہیں کتیا کہنا چاہیے۔۔۔ گلی کی پالتو کتیا۔“

مونا نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کے آنکھوں کو پلکوں کے دریچے سے بند کر لیا۔ وہ ان جانے سپنوں کی دنیا میں دور، بہت دور چلی گئی جہاں اس کا اپنا گھر ہوگا۔۔۔ گوپال صرف اور صرف اس کا ہوگا۔ ان کا بچہ دل کی ٹھنڈک اور آنکھوں کا تارا ہوگا۔۔۔ اور پھر وہ نئی زندگی ہوگی۔۔۔ ایک نیا جیون۔۔۔ وہ جیون جو ایک عورت چاہتی ہے۔۔۔ وہ چاہتی ہے۔

وہ سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد اس کے سپنوں کا رنگ بکھر گیا۔۔۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ ہوا کے ساتھ جو کسی کے واضح طور پر سیٹی بجانے کی آواز آئی تھی اس سے وہ سپنوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی تھی۔

مونا نے گوپال کے سینے سے سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”گوپال۔۔۔! یہ کون ہے۔۔۔؟ کون سیٹی اتنی تیز بجا رہا ہے۔۔۔“ مونا نے کہا۔

”معلوم نہیں۔۔۔ سارا گاؤں تو جشن میں

ہے۔'' گوپال نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔

''جب میں بہت چھوٹی تھی میری ماں مجھے پریوں، جن بھوتوں اور راج کماروں کی کہانیاں سناتی تھیں۔'' مونا نے پھر اس کے چوڑے چکلے اور مضبوط سینے پر اپنا خوش نما سر رکھ دیا۔ خاموش آنسو اس کے رخساروں پر سے ہوتے گوپال کی قمیص کے گریبان کو تر کر رہے تھے۔ ''مجھے ان پریوں کی اور دوسری کہانیوں کے مقابلے میں یہ گیت مجھے بے حد پسند تھا اور میں ماں سے کئی بار سنتی تھی۔۔۔ چاند کا شہزادہ اور زمین کی شہزادی۔۔۔ ان دونوں کا ملن کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ یہی پوچھتا تھا نا شہزادی نے۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ اور شہزادنے کہا تھا۔۔۔ چاند بھی تو زمین کا ٹکڑا ہے۔'' گوپال نے آنکھیں بند کر کے مونا کے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو سے مسحور ہو کر کہا۔ ''یہ گیت مجھے بھی بہت پسند تھا۔۔۔ وہ بھی مٹی ہے۔۔۔ یہ بھی مٹی ہے۔۔۔ بھگوان نے انسانوں کو اور ہمیں بھی مٹی سے بنایا ہے۔۔۔ چلو ہم اوپر چلے جائیں۔۔۔ آکاش پر جہاں ستارے ہوتے ہیں اور جہاں جسموں کا نہیں آتماؤں کا ملاپ ہوتا ہے۔''

''مگر گوپال۔۔۔! یہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں آیا ہے۔۔۔'' مونا نے آنکھیں کھول کے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ یہ کون ہے۔۔۔'' گوپال نے دروازہ کھول کے باہر نکلنا چاہا۔ سیٹی بجانے والا واقعی بہت قریب آ گیا تھا۔

''نہیں گوپال۔۔۔! مجھے اکیلا چھوڑ کے مت جاؤ۔۔۔ ہو گا کوئی پاگل۔۔۔ چلا جائے گا۔'' مونا نے اسے روک لیا۔

لیکن گوپال نے دیکھ لیا تھا کہ ریت کے ٹیلے پر ان سے چند گز دور ایک سایہ سا نمودار ہو گیا ہے۔۔۔ اس نے مونا کے گالوں کو تھپ تھپایا۔

''میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔۔۔ اس میں ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔ یہ وہی ہو گا۔۔۔ پرشاد۔''

اس نے دلاسا دیا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ریت پر چلتا ہوا گوپال اندھیرے میں دور ہو رہا تھا اور پھر مونا کا دل ڈوبنے لگا۔ ایک ان جانی اس سے کہہ رہی تھی۔

''مونا۔۔۔! تو نے اسے جانے نہ دیا ہوتا تو اچھا تھا۔۔۔ جانے والوں کا کیا ہے۔۔۔ اگر وہ لوٹ کے ہی نہ آئیں۔۔۔'' مونا ہذیانی لہجے میں چلائی ''گوپال۔۔۔! گوپال۔۔۔!'' آنکھیں پھاڑ کے اس سمت دیکھنے لگی جدھر گوپال گیا تھا۔

اس نے دیکھا۔ مگر گوپال ریت کے ٹیلے پر ایک دھبا سا رہ گیا تھا۔ مونا کا دل سینے میں دم توڑنے لگا۔ وہ کار سے نیچے اتر آئی۔

سیٹی اب بھی سنائی دے رہی تھی۔۔۔ ذرا سی دیر کے لیے مکمل خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔۔۔ جس میں کوئی صدا نہ تھی۔۔۔ نہ سمندر کی پکار۔۔۔ نہ دل کی دھڑکن۔۔۔ نہ آواز۔۔۔ بس موت کا سا ہولناک سناٹا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگی۔۔۔ اس کا سانس اپنے جسم کو۔۔۔ اور اس جسم کے اندر پرورش پانے والے وجود کو گھسیٹتے ہوئے پھول گیا۔

''گوپال۔۔۔!'' وہ پھر چلائی۔ اس کی سابقہ ہذیانی چیخ سے کہیں تیز اور اونچی تھی۔

مگر آسیب زدہ سکوت برقرار رہا۔ ٹیلے پر پہنچتے ہی مونا نے اسے دیکھ لیا۔

وہ ریت پر بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا۔۔۔ مونا ایک چیخ مار کر بھاگی اور دوسری طرف اترنے لگی۔ ریت اس کے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ زنجیر ڈال رہی تھی۔ آگے مت جاؤ۔۔۔ آگے مت جاؤ بے وقوف لڑکی۔۔۔ آگے کچھ نہیں ہے۔۔۔ گوپال بھی نہیں ہے۔۔۔ ٹھوکر کھائی۔ توازن قائم نہ رکھ سکی تو گری۔ پھر سنبھلی۔۔۔ لیکن اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔

خون گوپال کے سینے سے اب بھی بہہ رہا تھا اور ریت میں جذب ہو رہا تھا۔

''گوپال۔۔۔! گوپال۔۔۔!'' وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ ''تم جھوٹے ہو۔۔۔ دغاباز ہو۔۔۔ فریبی ہو ابھی چند منٹ پہلے تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔۔۔ تم نے مجھ سے ابھی کہا تھا کہ ہم ایک ساتھ مریں گے۔۔۔ کیا تم نے مجھ سے یہ سب کچھ نہیں کہا تھا'' وہ اسے بری طرح جھنجھوڑنے لگی تھی۔ پھر معاً اس کی نظر نے فرشتہ اجل کو دیکھا۔۔۔ وہ کھڑی ہوگئی اور اس کے سینے میں سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''تم نے مارا ہے نا اسے۔۔۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھتی کہ کیوں۔۔۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ تم موت کے فرشتے ہو نا۔۔۔ تم نے ہی ان سب کی جان لی۔۔۔ میں تم سے نہیں پوچھتی کہ کیوں۔۔۔ بوڑھے مسٹر فیشن کی۔۔۔ سوراج کی اور شریمتی شکنتلا دیوی کی۔۔۔ تمہارا یہی کام ہے۔۔۔ میرا بھی کام کردو۔۔۔ پلیز! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی ہوں۔۔۔ یہ زندگی بھی لے لو۔۔۔ اس لیے کہ اب اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔۔۔ جینا بھی تو ایک عذاب سے کم نہیں رہا۔''

لیکن موت کا فرشتہ اس کی بات نظرانداز کرکے پلٹا اور سیٹی بجاتا ہوا بے نیازی سے چلا گیا اور وہ اسے ایک ساعت تک جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

''چلو۔۔۔ ہم اوراوپر چلیں۔۔۔ اوراوپر چلے جائیں۔ آکاش پر جہاں ستارے رہتے ہیں۔۔۔ اور جہاں جسموں کا نہیں روحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔۔۔ یہ ملن ابد تک رہے گا۔۔۔ رہتا ہے نا۔۔۔''

سیٹی کی آواز دور ہوتی ہوئی معدوم ہوتی گئی۔ اس کی درد بھری آواز بھی۔۔۔ التجا بھی۔۔۔ فرشتہ اجل کو متاثر نہ کرسکی۔

وہ آہستہ آہستہ واپس چلنے لگی۔۔۔ وہ بھی چلا گیا۔۔۔ موت کا فرشتہ بھی چلا گیا۔۔۔ خیر میں خود اس کے پاس پہنچ جاتی ہوں۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔

کار میں بیٹھ کر اس نے اگنیشن میں لگی چابیوں کو دیکھا۔ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ مگر اس نے لوگوں کو اور گوپال کو کار چلاتے دیکھا تھا۔ اور دیکھتی رہتی تھی۔۔۔ چابی گھماتے ہی سویا ہوا انجن بیدار ہو گیا۔ اب۔۔۔ ہاں کلچ۔۔۔ پھر گیئر۔۔۔ کار ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی۔۔۔ مونا نے اسٹیرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایک پاؤں سے ایکسیلیٹر دباتی گئی۔ اتنا تو بہرحال اس کے علم میں تھا کہ رفتار کیسے بڑھائی جاتی ہے۔۔۔ روکنے کا مسئلہ سرے سے تھا ہی نہیں۔۔۔ اور کار کے دائیں بائیں لہرانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔ یہاں کون تھا۔۔۔ جو تصادم سے ٹوٹے۔۔۔ سمندر۔۔۔ سمندر کہاں ٹوٹتا ہے اس کی آغوش میں پناہ ہے اس کے دل میں بڑی جگہ ہے۔ گناہ گاروں کے لیے بھی۔

کار بے قابو کے انداز میں پانی میں اتری۔۔۔ موجوں نے بڑھ کے مونا کا سواگت کیا۔ مگر کار رک گئی تھی۔۔۔ پانی مونا پر چھینٹے اڑاتا گزر رہا تھا۔ مونا نے بالوں پر سے اسکارف کھولا۔۔۔ گردن کو اسٹیرنگ پر رکھا اور پھندا بنانے کے اسکارف کو باندھ دیا۔۔۔ یوں کہ وہ جتنا گردن چھڑانے کی کوشش کرے پھندا اتنا ہی سخت ہوتا جائے۔۔۔ اس نے ایک بار پھر چابی گھمائی۔ انجن آخری بار پھڑپھڑایا۔۔۔ اور کار خودکشی کے لیے گہرائی میں کود گئی۔۔۔ پانی اب مونا پر سے گزر رہا تھا لیکن کار کی چھت پر سے نہیں۔۔۔ جب سوچ گزر جاتی تھی تو چھت پر دکھائی دینے لگتی تھی۔۔۔ چنانچہ گھنٹہ بھر بعد جب آخر شب کا چاند طلوع ہوا تو اس کی مدھم روشنی میں ایک ماہی گیر نے دیکھا کہ کل تک جہاں صرف ریت تھی وہاں ایک چٹان سی نظر آنے لگی ہے۔ اس نے کوئی دو تین مرتبہ آنکھیں مل کر دیکھا کہ یہ اس کا واہمہ نہ ہو۔۔۔ یہ واہمہ نہ تھا۔ وہ حیران ہو کے آگے بڑھا۔

☆☆☆

ونود ان جاہل دیہات کے رہنے والوں کے لیے تماشا بنا ہوا تھا جو شہر کے رہنے والے کو مسخرے کی طرح فرش پر منہ کے بل گرتے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے تھے اور ہنس ہنس کے بے حال ہو رہے تھے۔ جیسے کسی فلم کا مزاحیہ منظر ہو۔۔۔ وہ کوئی مزاحیہ کردار ہو۔

گاؤں کے واحد ڈانس ہال کے فرش پر لیٹا ہوا ونود سوچ رہا تھا کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔۔۔ شوقیہ اور محض تفریح کے لیے فلمی دھن پر رقص ہونے لگا تو وہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ رقص کے دوران کسی نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑائی تھی اور ونود کو سنبھلنے اور توازن قائم رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔۔۔ اسے سریندر پر شبہ تھا جو پدمنی کو مسلسل ہم رقص دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن مسز سادھنا بڑی چالاکی سے ونود کی مدد کر رہی تھی اور دیوالی کے پرمسرت تہوار کا رقص رقابت کا ایک دلچسپ کھیل بنا ہوا تھا۔

سریندر، ہجوم سے دور نکل گیا تھا چنانچہ ونود اس شبے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ پدمنی اپنی خفت پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام تھی۔ ونود نے تمام دیہاتی کے رہنے والوں کی عزت خاک میں ملا دی تھی۔۔۔ مگر ہوا کیا تھا۔۔۔ ونود بہت اچھا رقص کر رہا تھا۔۔۔ پھر یہ اچانک اس کے قدم کیوں اکھڑ گئے۔۔۔ اس نے ونود کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر ونود خود ہی کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

جشن مسرت آدھی رات بیت جانے کے بعد زور و شور سے جاری تو رہا تھا لیکن اس میں وہ گرم جوشی اور شباب اور جنون نہیں تھا۔ اس لیے کہ چاند نگر میں یہ پہلی دیوالی تھی جو خوف و ہراس کی فضا میں آئی تھی۔ گاؤں کے یکے بعد دیگرے تین قتل ہو چکے تھے اور بظاہر ان تینوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ ہر شخص خود کو دست قاتل کا اگلا شکار سمجھنے میں حق بجانب تھا۔۔۔ وہ کوئی جنونی تھا یا دیوانہ۔۔۔ مگر یہ بات سب ہی سمجھتے تھے کہ وہ بے حد چالاک بھی ہے۔۔۔ عیار بھی ہے۔ پیشہ ور مجرم سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اس کا اندازہ یوں ہوتا تھا کہ اس نے کہیں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا ورنہ ہر قتل اپنا وجود کسی نہ کسی طرح نام و نشان چھوڑ دیتا ہے۔

کرشن کی حالت سب سے خراب تھی۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار تھا۔ ابتر حالت پر قابو اسے بڑا دشوار تھا۔۔۔ کیوں کہ جسے ایک قاتل کا نہیں بلکہ تین قاتلوں کا پتا چلانا تھا یا تینوں کو قتل کرنے والے ایک شخص کا۔۔۔ مگر اس کی ہر کوشش کا نتیجہ ابھی تک صفر ہی تھا۔ اس کی صلاحیت اور ساری قابلیت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اس کا دماغ معطل سا تھا کہ یہ وارداتیں معمہ کیوں بن گئی ہیں۔

وہ مزید اس لیے بھی پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی بائیس سالہ ملازمت کا ریکارڈ خراب ہو رہا تھا۔۔۔ اور پولیس کی نوکری جسے وہ اب تک حلوہ سمجھتا آیا تھا لوہے کے چنے چبوا رہی تھی۔۔۔ لوگ ہر جگہ اور ہر وقت زبان سے یا آنکھوں کی زبان سے پوچھتے رہتے ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو۔۔۔ ہماری سلامتی کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم اس لیے ٹیکس دیتے ہیں کہ قانون ہمارا محافظ ہے اور ہماری جان و مال خطرے میں لگ رہی ہے۔ کرشن کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اب رات کے وقت باہر نہیں نکلتے تھے۔ گھروں کے دروازے سرِشام ہی بند ہو جاتے تھے اور اس کے باوجود چاند نگر کے رہنے والے ایک ان جانے قاتل کے خوف سے رات بھر کروٹیں بدلتے تھے۔۔۔ ہر آہٹ پر سہم جاتے تھے اس لیے وقت آنے والے مہمانوں کو بھی فرشتہ اجل سمجھ کر ڈر جاتے تھے۔ اس فضا میں دیوالی کی خوشیاں بھی ماند پڑ گئی تھیں تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔

ونود کا موڈ اب اتنا آف ہو گیا تھا کہ وہ اس غیر مہذب اجتماع سے نکل جانا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ معمولی سے حادثے کو حماقت کا بدترین مظاہرہ سمجھ کے ونود پر دل کھول کر ہنس رہے تھے۔۔۔ اور فقرے

چست کر رہے تھے۔۔۔ بدقسمتی یہ کہ ونود کے ساتھ گاؤں کی کوئی لڑکی نہیں خود پدمنی تھی ورنہ الزام شاید کسی دیہاتی لڑکی پر آجاتا۔ بہت ساری لڑکیاں حسن وشباب کا نادر نمونہ بھی تھیں۔

ونود برا نہ مانتے اور بدستور محو رقص رہنے کی کوشش میں بدستور تماشا بن رہا تھا اور اسے تماشا بنانے والوں میں سریندر پیش پیش تھا جس کے جملے بعض اوقات غیر شائستہ ہو جاتے تھے۔۔۔ مگر ونود کے لیے رقص کے بجائے باکسنگ یا جوڈو کا مظاہرہ دہلی والوں کی رہی سہی ناک کٹوا دینے کے مترادف ہوتا۔۔۔ چنانچہ وہ غیر محسوس انداز سے دروازے کی طرف کھسکتا چلا گیا کہ نظر بچا کے نکل جائے۔

بوڑھے اب ہانپ رہے تھے یا پھر تھک کے بیٹھ چکے تھے۔۔۔ مگر پچاس کے قریب نوجوان جوڑے بڑی مستقل مزاجی سے رات بھر ڈانس کرنے کے ارادے پر عمل پیرا تھے۔ لڑکیاں زیادہ پرجوش تھیں۔۔۔ چوں کہ دیوالی کا دن تھا اس لیے وہ بہک اور چہک رہی تھیں۔ جیسے ان کے والدین اور سرپرستوں نے کھلی چھوٹ دے رکھی ہو۔۔۔ اور پھر ان کی خواہش تھی کہ لڑکے انہیں جیون ساتھی چن لیں۔ انتخاب کے لیے یہ سنہرا موقع تھا۔۔۔ لڑکیاں خصوصی طور پر تیار ہو کر آئی تھیں اور وہ لڑکوں سے بہت زیادہ فری ہو رہی تھیں۔ ان کی بے تکلفی نے لڑکوں کو مائل اور متاثر کر دیا تھا۔

ونود نے پدمنی کو بتا دیا تھا کہ ایسی کی تیسی مقابلہ رقص کی۔۔۔ وہ واپس جا کے سوئے گا۔۔۔ روئے گا اپنی عقل پر اور تقدیر پر بھی۔ مگر عین وقت اس وقت جب ونود دروازے سے نکلنے والا تھا اس کے کندھے پر کس نے ہاتھ رکھا۔ ونود نے پلٹ کے دیکھا تو اسے کرشن کا وحشت زدہ چہرہ نظر آیا۔

”مسٹر ونود۔۔۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔۔۔“

”آپ کا معاون اور دست راست آپ کا بیٹا ہے۔“ ونود نے غرا کر کہا۔ ”مسٹر سریندر۔۔۔ وہ دیکھو مسز سادھنا کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔“

”پلیز۔۔۔۔ مسٹر ونود!“ کرشن نے نر... سے کہا۔ ”یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔۔۔ ناتجربہ کار ہے۔“

کرشن کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے ونود کو سوچنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چ... ساعتوں تک اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر وہ پدمنی سے معذرت ک... کے کرشن کے ساتھ باہر آ گیا۔

”کیا بات ہے مسٹر کرشن۔ آپ بہت ہ... پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

”بات۔۔۔ بات تو صرف اتنی سی ہے کہ پہلے تین آدمی الگ الگ مرے تھے۔۔۔ یا قتل ہوئے تھے۔“ کرشن نے تلخی سے کہا۔ ”اب دو دو مرنے لگے ہیں یا قتل ہونے لگے ہیں۔۔۔ میری عقل کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ۔۔۔ آخر زندگی دینے والے نے اس گاؤں میں رہنے والوں کو طبعی موت مرنے کے مواقع سے کیوں محروم کر دیا ہے۔۔۔ ہمیں کس کے گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟“

ونود اس کی پوری بات سمجھنے کے باوجود خاموش رہا اور بالآخر اس کے جذبات کا آتش فشاں سرد ہوا اور وہ معقولیت کے ساتھ بات سننے اور سنانے کے قابل ہو گیا تو ساحل سمندر کی طرف چلتے چلتے اس نے ونود کو گوپال اور مونا کی داستانِ عشق اپنے تبصرے اور حالات کے پس منظر کے حوالے کے ساتھ سنا دی۔

”یہ رومیو جولیٹ سے بہتر کیس بن سکتا تھا۔۔۔ بشرطیکہ وہ مردود گوپال اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے جولیٹ کو قتل کر کے خودکشی نہ کرتا۔ بلکہ دونوں ہی اکٹھے مرتے۔۔۔“ اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ وہ اب ساحل تک آ پہنچے تھے۔

”آپ کو ایک ایسی فلمی کہانی ملتی جس سے ممبئی کی فلم نگری کا کوئی پروڈیوسر لاکھوں کما لیتا۔۔۔“

"یہ بتاؤ کہ تمہاری تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔"
ونود نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کیا کچھ معلوم ہوا؟"

"معلوم یہ ہوا کہ کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔" کرشن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "ایک چھوٹی سی بات قابل غور ہے۔۔۔ شریمتی شکنتلا دیوی کے گھر میں سے سرخ رنگ کے آئل پینٹ کی ایک خالی ٹیوب ملی تھی۔"

ونود نے سرہلایا۔ "وہ پدمنی نے میرے سامنے مس عطبی پرشاد کو دی تھی۔ کسی نے اسے مورد الزام ٹھہرانا چاہا ہوگا۔"

"ہوگا کیا مطلب۔۔۔" کرشن نے تکرار کی۔

"واقعات کی شہادت۔۔۔"

"وہ شہادت بوسنی سنائی پر مشتمل ہے۔" ونود نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ "امکانات کو نظرانداز مت کریں مسٹر کرشن۔۔۔! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اصل قاتل پھانسی کا پھندا پرشاد کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔ پینٹ کی ٹیوب پر تو مس پدمنی بھی مشتبہ افراد میں شامل ہو جاتی ہے۔"

"عقل سے کام لو۔۔۔ کیا پرشاد یا پدمنی واقعی قتل کر سکتے ہیں؟"

"مس پدمنی کا کوئی سوال نہیں۔۔۔" کرشن نے [illegible] کتے ہوئے کہا۔ "مگر پرشاد۔۔۔ نو سر! میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔۔۔ جس شخص نے کار کو ڈوبا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے کسی کو سیٹی بجاتے بھی سنا تھا اور وہ سنا جس سے بچہ بچہ واقف ہے مگر اس نے کسی کو دیکھا نہیں۔۔۔ وہ کشتی میں جال ڈالنے جا رہا تھا۔"

ونود نے پہلے گوپال کی لاش دیکھی اور خودکشی کے نظریے کو یکسر مسترد کر دیا۔

اس کے دل میں ایک خنجر پیوست تھا اور اگرچہ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں خنجر کے دستے پر لپٹی ہوئی تھیں۔۔۔ مگر اس نے اپنے ہاتھ اپنے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے استعمال نہیں کیے تھے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ قاتل کا ہاتھ تھام لے اور اس کوشش میں گوپال کے اپنے ہاتھ کٹ گئے تھے۔ اس نے دستہ تھام کے زور لگایا ہوتا تو یہ کبھی نہ ہوتا۔۔۔ پھر کرشن کو مزید مایوسی ہوئی جب ونود نے ٹارچ کی روشنی میں ریت پر زنانہ قدموں کے نشان دریافت کر لیے۔

"کوئی عورت۔۔۔ ظاہر ہے مونا یہاں تک آئی تھی اس وقت گوپال مر گیا تھا اور وہ یہاں گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ ریت میں یہ ننھا سا گڑھا اور پنڈال کا سانچہ نظر آ رہا ہے آپ کو۔" ونود نے کہا۔ "کیا مطلب ہو سکتا ہے۔" کرشن سر ہلا کے رہ گیا۔ مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

"مطلب صاف اور واضح ہے۔ گوپال کو مونا نے قتل نہیں کیا تھا۔۔۔ اگر وہ مونا کے ساتھ خود بھی کار میں موجود ہوتا تو سارے کپڑے نہ سہی۔۔۔ اس کے جوتے کپڑے تو پانی میں بھیگتے۔۔۔ آپ نے دیکھا اور دیکھ رہے ہیں نا کہ جوتے کپڑے خشک ہیں۔" ونود نے وضاحت کی۔

"پھر۔۔۔ پھر مونا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ اس بات کا سب کو علم ہے۔" کرشن نے سر جھکا کر کہا۔

"اور پھر آپ نے اس امر پر غور کیا کہ مونا کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔" ونود نے اپنی وضاحت جاری رکھی۔ "مگر یہ ہاتھ مونا کے نیچے دبے ہوئے تھے۔۔۔ کیا خودکشی کرنے والا اس پوز میں بیٹھا رہ سکتا ہے۔۔۔ نزع کے کرب میں ہاتھ خود بخود گلے پر آ جائے اور اسکارف کھولنے کی غیر شعوری کوشش ضرور کرتی۔۔۔ پھر یہ دیکھو کہ اسکارف کا پھندا خاصا ڈھیلا ہے۔۔۔ وہ تھوڑا سا سر اٹھا سکتی تھی۔۔۔ اتنا کہ ناک پانی کی سطح سے اوپر رہے بلکہ تھوڑی سی جدوجہد کر کے اپنا سر بھی نکال سکتی تھی۔ اسکارف میں بڑی لچک ہوتی ہے۔"

کرشن سمندر کو دیکھتا رہا جس کی موجیں اس کی بے بسی پر خندہ زن نظر آتی تھیں۔ وہ لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔ کیا کہہ سکتا تھا۔

''یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔۔۔ مسٹر ونود۔۔۔! اچھا نہیں ہو رہا ہے۔۔۔ لوگ اب خوف زدہ نہیں مشتعل ہیں۔ بے قابو ہو رہے ہیں۔ برداشت کا دامن ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔۔۔ آپ اجنبی ہیں۔۔۔ آپ ان گاؤں والوں کی نفسیات اور مزاج کو نہیں سمجھتے۔۔۔ انہیں سمجھانا فضول اور لاحاصل ہے۔۔۔ یہ لوگ اگر پرشاد کو مجرم اور آپ کو منحوس سمجھنے لگیں تو اس میں میرے لیے تعجب کی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

تعجب خود ونود کو بھی اس وقت نہیں ہوا جب اگلے روز کرشن کے آفس میں تفتیش کا آغاز ہوا اور گواہوں نے اپنے اپنے بیانات لکھوانے شروع کیے۔ کرشن کے معاون سریندر کے علاوہ گاؤں کے چند سرکردہ اور معتبر لوگ بھی کارروائی میں شریک رہے۔ آفس کے باہر خوف کا مارا ہوا مشتعل ہجوم اس آتش فشاں کی طرح کھڑا رہا جو پھر پھٹنے کے قریب ہو تو دھواں دینے لگے۔

ہر چہرے پر اب بھی سوالات تھے مگر ان کی نوعیت بدل گئی تھی۔

وہ پوچھ رہے تھے کہ قاتل کے خلاف اتنے لوگوں کی گواہی موجود ہے تو اسے گرفتار کر کے قانون کے تقاضے پورے کیوں نہیں کیے جاتے۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ چھٹا اور ساتواں اور آٹھواں قتل بھی اسی سفاکی اور بے رحمی سے نہیں ہوگا اور یہ قانون اتنی ہی بے بسی کے ساتھ تفتیش کی رسمی کارروائی کے سوا کچھ نہ کر پائے گا۔ بلکہ اپنی زندگی کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ انصاف بھی ہمیں کیا اپنے ہاتھ میں لینا ہوگی۔ کرشن کا ستارہ گردش میں آ گیا تھا تو وہ غریب کیا کرتا۔

اور یہ اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ وقت تھا اسے بیک وقت پانچ افراد کے خون کا حساب دینا تھا اور وہ کورے کاغذ پر صرف قتل ہونے والوں کے نام لکھے بیٹھا تھا۔ بلاشبہ گواہ ایک دو نہیں بہت سارے تھے مگر ان میں ایک بھی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ قانون ٹھوس ثبوت چاہتا تھا۔ بغیر ثبوت کے وہ کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ صرف شک وشبہ کر سکتا تھا جس کی قانون میں اور عدالت کے نزدیک کوئی گنجائش نہ تھی۔ وقفے وقفے سے کوئی آگے بڑھتا تھا اور اندر گواہی دینے کے لیے آ جاتا تھا۔

''میرے کانوں کو دھوکا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں اور نہ ہی یہ میری سماعت کا فتور ہے۔'' نرجن بیوہ نے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی بیوگی کا کوئی نہیں۔۔۔ میں جس روز بیوہ ہوئی کتنی خوشی ہوئی ہے بیان کرنے کے الفاظ نہیں ہیں۔۔۔ میں ایسا محسوس کرتی آئی ہوں اور کر رہی ہوں کہ میں نے جو دولت پائی ہے وہ ایک بڑی نعمت ہے۔۔۔ آزادی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔۔۔ جبر واستبداد کی چکی میں تیس برس تک پستی رہی ہوں۔۔۔ مگر ایک تو میں اپنی ذات پر آنے والے شگوک کے داغ مٹانا چاہتی ہوں۔۔۔ دوسرے میں کسی اور موت نہیں چاہتی کہ وہ شقاوت اور بے رحمی سے نشانہ بن جائے۔۔۔ بلاشبہ میرا نجات دہندہ اور عظیم محسن ضرور ہے۔۔۔ لیکن اب وہ خون آشام درندہ، اب ایک خون آشام درندہ بن چکا ہے۔ میں سوگند کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے سیٹی سنی اور دھن فوراً پہچان لی تھی۔ کیا یہ گیت کسی اور نے نہیں سنا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن کیا آپ کو اب بھی وہ گیت یاد ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''یادداشت پر زور دیجیے اور سوچ کر بتائیے کہ سیٹی بجانے والے نے ہر بول دوہرایا۔ آخر کب تک۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔'' نرجن کی بیوہ نے سوچ کے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس نے پورا گیت سنایا تھا۔ سنانے کا مطلب ہے میں نے سنا تھا۔ ظاہر ہے وہ سامنے نہیں تھا صرف سیٹی کی آواز آ رہی تھی۔''

دوسری گواہی اینا کی تھی۔ ''لارڈ!'' اس نے اپنے وسیع وعریض سینے پر انگلی کے اشارے پر خاصی بڑی صلیب بنائی۔

''اس رات جھینگر رو رہے تھے۔۔۔ میں نے

کہا کہ یسوع مسیح خیر کرے۔ ایشور خیر کرے۔۔۔ نہ
انے کس کو دنیا سے جانا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ
انے والا کب کا اس سنسار سے جا چکا ہے۔'' اور
وف کی کپکپی سے اس کے پہاڑ جیسے بدن میں زلزلہ آ
گیا۔

چوں کہ اس کی سانس سینے میں ہچکولے کھا رہی
تھی اس نے اس پر قابو پا کر قدرے توقف کے بعد
کہا۔

''اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جہاں میں سو رہی
ہوں۔۔۔ اس کمرے کے اوپر چھت سے کوئی لاش
لٹکی ہے تو صبح میری بھی لاش ملتی۔۔۔ میرا ہارٹ
فیل ہو جاتا۔۔۔ بھینگروں کے رونے سے میں
دہشت زدہ ضرور تھی اور سو نہیں سکی تھی۔ چناں چہ
میں نے سیٹی کی آواز ضرور سنی تھی۔''

ونود نے اپنا سوال دوہرایا۔ ''کتنی دیر تک سیٹی
بجانے والے نے پورا گیت سنایا تھا۔۔۔؟''

''لارڈ۔۔۔!'' اینا نے حیرانی سے ونود کو
دیکھا۔ ''یہ آپ شہریوں جیسے سوال کیوں کرتے
ہو۔۔۔ مجھے کیا معلوم گیت کتنا لمبا ہے؟''

''اچھا دھیان سے سنو۔'' ونود نے کہا 'میں
سیٹی بجاتا ہوں۔ تم مجھے عین اس جگہ ٹوک دینا جہاں
تمہیں شک ہو کہ تم نے اس سے آگے کچھ نہیں سنا
تھا۔'' اینا نے سر ہلا دیا اور ونود نے سیٹی بجانا شروع
کیا۔۔۔ چاند نگر کے سرکردہ لوگوں نے اور کرشن نے
گواری اور حیرانی کے ساتھ ونود کو دیکھا۔ آپس میں
نظروں کا تبادلہ کیا اور خاموش رہے۔ ونود کی سیٹی خالی
کمرے میں ہر بول دوہرائی رہی۔ اینا بڑی متانت
سے سر ہلاتی رہی۔ گیت ختم ہو گیا۔

آسمان پر جہاں ستارے رہتے ہیں۔۔۔
وہیں جسموں کا نہیں روحوں کا ملن ہوتا ہے۔۔۔
ونود کی دھن آخری دو بولوں پر تیسری بار بدلتی تھی۔
اسی طرح دھن کے تین الگ الگ حصے صاف
پہچانے جاتے تھے۔

''بس اینا۔۔۔! پورا گیت یہی ہے۔'' ونود
نے کہا۔ ''اب تم یاد کرو۔۔۔ تم نے کیا یہی سنا
تھا؟''

''میں اب خداوند یسوع مسیح کی قسم کھا سکتی
ہوں کہ میں نے پورا گیت سنا تھا۔'' اینا نے یقین
کامل کے ساتھ کہا۔

''قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔'' کرشن بولا۔
''ہم ایسے ہی مان لیتے ہیں۔۔۔ تم اب جا سکتی ہو۔''

اب اس علاقے کی سب سے دولت مند اور
معزز ترین ہستی۔۔۔ بلیک ہوا۔۔۔ کالی چڑیل
بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ نمودار ہوئی۔۔۔ اور
ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ کرسی
خالی پڑی تھی۔ اس نے ساڑھی کے فال کو گھٹنوں تک
اونچا کر لیا تھا۔ گاؤں کے سرکردہ افراد نے افسوس
کے ساتھ امرتا کی کالی کالی سڈول، گداز سے بھری
ٹانگوں کو دیکھا۔ گو وہ کالی تھی لیکن چوں کہ جوان تھی
اس عریاں پنڈلیوں میں بڑی جاذبیت اور کشش تھی
جو دل کو گرما دینے والی تھی۔۔۔ اس کا یہ انداز ایک
فلمی رقاصہ جیسا زعم لیا ہوا تھا۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ سر ونود سراغ رساں!
کہ مجھے موسیقی میں کتنی دسترس ہے۔۔۔؟'' وہ ونود
کے سوال پر معنی خیز انداز سے مسکرائی۔

''مجھے گانے کا شوق تھا اور میں نے موسیقی کی
تعلیم و تربیت بھی حاصل کی تھی۔۔۔ اگر میرا منگیتر
ویت نام سے لوٹ آتا تو ہم شادی کر لیتے اور
ہندوستان کے ہی کسی پرفضا مقام۔۔۔ شملہ۔۔۔
میسور کے نندی ہلز۔۔۔ یا پھر کشمیر یا پھر سوئٹزرلینڈ
چلے جاتے۔۔۔ پھر دو مہینے بعد واپس آ کر اپنا
گروپ بنا لیتے۔۔۔ وہ خود گٹار بہت اچھا بجاتا تھا
اور بھی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شامل کر لیتے تاکہ
گروپ بہت ہی اعلا قسم کا بن جاتا۔۔۔ ہم اسٹیج شو
کرتے۔۔۔ شہر شہر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔۔۔
پھر ٹی وی اور فلم والے ہم سے معاہدہ کر لیتے۔۔۔
پبلک ہمارے گیتوں کی دیوانی ہوتی۔۔۔ ہمارے
کیسٹ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہارٹ

کیک کی طرح فروخت اور۔۔۔'' وہ توقف کر کے قہقہہ مار کے ہنسی۔ ''مگر ہمیشہ ایسے خواب فریب دیتے ہیں۔۔۔ وہ بڑے مکار اور دغا باز ہوتے ہیں۔۔۔ ایک یا ایک گولی۔۔۔ یا ایک خنجر۔۔۔ ان خوابوں سے رشتہ ختم کر دیتا ہے۔ میں تمہیں بتاؤں۔۔۔ میں نے کیا سنا تھا۔''

''اس نے سیٹی بجانی شروع کی۔۔۔'' ونود نے اس کی مہارت کا اعتراف کیا۔ وہ نمبر ون تھی دوسرا نمبر پرشاد کا تھا اور تیسرا خود اپنا تھا۔ ایک منٹ ختم ہو گیا۔ مس امرتا کی آنکھیں بدستور بند رہیں اور کوئی ٹوٹا ہوا خواب دیکھتی رہیں۔ یوں جیسے کوئی شکستہ آئینے کا ٹکڑا اٹھا لے اور اس میں اپنا لوٹا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرے۔ امرتا نے وہ گیت سنایا جو اس نے سنا تھا۔

آخری گواہ مچھیرا تھا جو پانی میں ڈوبی ہوئی کار دیکھ کر کرشن کو فوراً ہی اطلاع دینے چلا گیا۔

''یس سر۔۔۔! میں نے پورا گیت سنا تھا۔۔۔ میں اس وقت کشتی کھول رہا تھا۔ ہوا کا رخ موافق تھا۔۔۔ یعنی زمین سے سمندر کی طرف۔۔۔ چنانچہ آواز صاف پہنچ رہی تھی۔ مگر میں حیران اور پریشان اور ہراساں نہیں ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔''

''شکریہ۔۔۔'' ونود نے اسے ٹوک دیا۔ ''اتنا کافی ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

''کیوں۔۔۔'' ماہی گیر نے چیخ کر اور تڑخ کر کہا۔ ''تفتیش کی نگرانی کیا آپ کر رہے ہیں۔ گاؤں کے پولیس افسر کی جگہ آپ ہو گئے ہیں؟''

صورت حال یک لخت کشیدہ ہو گئی۔ بدمزگی سی ہونے لگی۔ معتبر لوگوں نے جو تقریباً اسی ماہی گیر کے ہم خیال ہو گئے تھے انہوں نے کرشن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ونود بے نیازی سے سگریٹ پیتا رہا۔ پرسکون رہا۔ اسے ان کی کوئی چنتا نہ تھی۔

کرشن نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا اور اس کے سراپا میں ایک لہر اٹھی۔

''دراصل۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے مجھے بھی مزید اب کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ جو پوچھنا تھا وہ پوچھا ہے۔'' ماہی گیر اٹھا اور احتجاج کے انداز میں واک آؤٹ کر گیا اور بڑبڑاتا گیا تھا۔

کمرے میں ایک منٹ تک ایسی خاموشی رہی جیسے وہ سب مرنے والوں کے سوگ میں رسماً چپ ہو گئے ہیں۔ پھر کرشن نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ ''اسے ہتھکڑیاں ڈال کر لے آؤ۔''

ونود نے سگریٹ کے ٹوٹے کو فرش پر ڈال کے جوتے کی ایڑھی سے مسل دیا اور کھڑا ہو گیا۔

''یہ کام میں کروں گا۔۔۔ مجھے بغیر ہتھکڑی کے خطرناک ترین مجرموں کو لانے لے جانے کا تجربہ [illegible]''

وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر باہر آ گیا۔ [illegible] افراد کی تب نظروں نے اس کا استقبال کیا۔ کوئی اسے راستہ دینے کے لیے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا ان کے چہروں پر نفرت اور غصے کی سرخی تھی۔ ونود نے دائیں جانب گھوم کر چالیس پچاس قدم کا اضافی فاصلہ طے کیا اور پھر وہ پرشاد کے پاگل خانے۔۔۔ عجائب خانے۔۔۔ یا کباڑ خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

''پرشاد کاٹھ کباڑ کے انبار ہی اپنے اوپر لپیٹے پرانے کپڑوں کا ڈھیر ڈالے پڑا تھا اور باہر کی روشنی سے اس نیم تاریک ماحول میں آنے والے کو پہلی نظر میں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ونود نے اسے کھینچ نکالا اور پیروں پر کھڑا کر دیا۔

''پرشاد۔۔۔! فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔'' ونود نے اسے جھنجھوڑ کے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب تمہاری اداکاری نہیں چلے گی۔۔۔ تمہیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تم دیوانے ہو یا وہ دیوانے ہیں جو تمہیں دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لوگ تم سے بدظن ہیں اور نفرت اور غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔'' ایک لمحے کے لیے پرشاد کی آنکھوں سے وحشت اور جنون کے تمام آثار مٹ گئے۔

''آپ کیا چاہتے ہیں۔۔۔'' وہ متانت سے

...کو اپنائیت سے دیکھنے لگا۔
''میں تمہیں لوگوں کے سامنے لے جانا چاہتا
...'' ونود نے کہا۔ ''کیوں کہ لوگ انصاف چاہتے
...''
پرشاد پھر دیوانہ بن گیا۔ ''یہ لوگ۔۔۔ لوگ
...ماردیں گے۔۔۔ نہ صرف بڑے بلکہ بچے اور لڑکیاں
...۔۔۔ سبھی پتھر مارتے ہیں مجھے۔'' وہ سہم کر
...ونود نے اسے ایک جھٹکا دیا۔ پھر اس نے
...کا بازو پکڑ کے کہا۔
''لیکن میرے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں
...کی تمہیں مارے۔۔۔ مگر میں تمہیں ساتھ لے
...نے سے پہلے تم سے کچھ پوچھوں گا۔۔۔ جو...
...ہوں اس کا سچ سچ جواب دینا۔۔۔ اگر تم نے
...جھوٹ بول کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی تو
...تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔۔۔ ٹکڑے سمجھتے ہو
...۔۔۔ ہاتھ الگ۔۔۔ پاؤں الگ۔۔۔ اور سر
...۔۔۔ اور میں تمہارا سر گاؤں کے بچوں کو دے
...دوں گا۔۔۔ فٹ بال کھیلنے کے لیے۔''
پرشاد کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑتا چلا گیا اور
...طرح کانپنے لگا۔
''بھگوان کی سوگند لے لو۔۔۔ میں قطعی جھوٹ
...بولوں گا۔'' وہ بری طرح ہکلایا۔
...منٹ کے بعد ونود نے اسے انصاف
...والوں کی عدالت میں لا کھڑا کیا۔
''مجرم حاضر ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ سب
...مذ کریں میں پرشاد سے دو چار باتیں کروں
...کہ آپ میں سے کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''
...قابل اعتراض تھی لیکن کسی میں چونکہ دم
...کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے لوگ مجبوراً خاموش
ان کے چہروں پر ناگواری ابھر آئی۔
''پرشاد۔۔۔!'' ونود نے کرسی پر بیٹھنے سے
...پرشاد کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ ''تمہیں وہ گیت یاد
...۔۔۔ چاند کا ایک شہزادہ تھا اور ایک زمین کی
...شہزادی۔'' پرشاد نے اقرار میں سر ہلایا اور دوسروں

کی طرف دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس اعتراف میں کوئی بات قابل گرفت تو نہیں۔
''تم سیٹی بہت ہی اچھی بجاتے ہو۔'' ونود نے کہا۔ ''میں نے سنی ہے۔''
پرشاد نے خوش ہو کر پھر گردن ہلائی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ ونود تعریف کرے گا۔
''اچھا۔۔۔ یہ سب لوگ تم سے سیٹی پر وہی دھن سننا چاہتے ہیں۔'' ونود نے کہا۔ ''اگر تم نے ان سب کو خوش کر دیا یہ سب تمہیں انعام بھی دیں گے۔۔۔ انعام ہم میز پر رکھے دیتے ہیں۔ تمہارا دل جو چاہے لے لینا۔'' ونود نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں کہ کیا تاثرات ہیں۔
پھر اس نے سو روپے کا ایک نوٹ میز پر رکھ دیا۔۔۔ کرشن نے کلائی کی گھڑی اتاری اور نوٹ پر رکھ دی۔ پھر کسی نے اپنا پارکر پین رکھا۔ اس میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی شامل ہو گئی۔ میز پر انعامات سج کر۔۔۔ پرشاد کو متوجہ کرنے لگے۔ ونود نے بھی پھر اپنی گھڑی رکھ دی۔ پرشاد نے بڑے اشتیاق سے اس خزانے کو دیکھا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا تو ونود نے اسے روک دیا۔
''ایسے نہیں پرشاد۔۔۔! شرط یہ ہے کہ پہلے تم سیٹی بجا کر سناؤ۔'' ونود نے کہا۔
پرشاد کا چہرہ اک دم سے اتر گیا۔ ''مجھے اس میں سے کوئی چیز پسند نہیں۔۔۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ ایک ان جانا سے خوف محسوس کر رہا تھا۔
اچھا تو تمہیں کیا چاہیے۔۔۔ بولو۔'' ونود نے کوشش جاری رکھی۔ ''دیکھو جو چاہتے ہو بتا دو دیکھو یہاں ایسی کوئی چیز ہے جو تمہیں پسند ہو۔'' پرشاد خالی خالی نظروں سے سب کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔۔۔ پھر اس کی نگاہ کرشن کی جیب پر آویزاں پانچ کونوں والے ستارے پر جم گئی جو پولیس کے سرکاری عہدے کا بیج تھا۔ ایک اعلا پولیس کا۔۔۔
''یہ۔۔۔ یہ میں لوں گا۔'' پرشاد نے انگلی اٹھا کے بیج کی طرف اشارہ کیا۔

کرشن نے بادل ناخواستہ پن کھول کر اپنا بیج الگ کیا اور میز پر دیگر انعامات کے درمیان رکھ دیا۔

''دیکھو۔۔۔ مسٹر کرشن نے تمہاری بلا چوں و چراں مان لی۔'' ونود نے کہا۔ ''یہ چمک دار ستارہ تمہیں مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ تم گیت سنا دو۔''

پرشاد نے خوش ہو کر ونود کو دیکھا۔ پھر اس کے لبوں سے وہ نغمہ بلند ہوا جو فرشتہ اجل کا پیام بن کے سنائی دیتا رہا تھا۔۔۔ پہلا بول۔۔۔ پھر دوسرا بول۔۔۔ پھر تیسرا بول۔۔۔ اور نغمہ ختم۔۔۔ خاموشی اور انتظار۔

''آگے سناؤ پرشاد۔۔۔! گیت تو ابھی پورا نہیں ہوا۔ ادھورا ہے۔'' ونود نے کہا۔

''آگے۔۔۔ آگے تو مجھے نہیں آتا۔۔۔۔''

پرشاد نے بے بسی سے کہا۔ ''جتنا آتا ہے سنا دیا۔''

''نہیں پرشاد۔۔۔! جھوٹ بولو گے تو انعام نہیں ملے گا۔۔۔۔'' ونود نے چمک دار ستارہ سنہری زنجیر کے ساتھ پنڈولر کی طرح ہلایا۔

''مگر میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہے۔۔۔ میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔'' پرشاد نے فریاد کی۔

''اچھا۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' ونود نے کہا۔ ''میں تمہیں یہ دھن پوری سناؤں گا۔۔۔ کیا اس کے بعد تم سنا سکو گے۔۔۔؟''

''میں۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ لیکن میں پوری پوری کوشش کروں گا۔'' پرشاد نے کہا۔

ونود نے ایک بار اسے پوری دھن سنائی۔۔۔ پرشاد چوتھے بول تک پہنچا اور رک گیا۔۔۔ ونود نے پھر پورا گیت سنایا۔ لیکن دوسرے حصے کی دھن مختلف تھی اور تیسرے حصے میں لے پھر بدلتی تھی۔ ونود نے اسے دو مرتبہ پوری دھن سنائی تھی۔

پرشاد ستارہ لینے کی شدید خواہش کے باوجود ونود کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کا ذہن زبان کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کا چہرہ دکھ اور مایوسی کی تصویر بن گیا۔

''سوری پرشاد۔۔۔!'' ونود نے میز پر سے ایک ایک چیز اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا کروں۔۔۔ تم انعام لینا ہی نہیں چاہتے۔''

''مجھے یہ ستارہ چاہیے۔'' پرشاد نے مغلوب لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں یہ گیت پورا نہیں سنا سکتا۔۔۔'' اس کی آنکھوں کے کناروں میں نمی کی چمک آ گئی۔ پھر وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ میں پورا گیت یاد کر کے سنا دوں گا۔ مجھے میرا انعام دے دو۔'' ونود نے نفی میں سر ہلایا اور بیج کا ستارہ کرشن کو واپس کر دیا۔

پرشاد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی قیمتی گھڑی، سو روپے کے نوٹ، قلم اور سونے کی انگوٹھیوں کو نظر اٹھا کے دیکھا بھی نہیں تھا۔

''آپ سب لوگوں نے گواہوں کے بیانات سنے۔'' ونود نے کمرے کی کشیدہ فضا میں خاموش بت بنے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

پھر اس نے لمحاتی توقف کے بعد کہا۔ ''ان سب نے ایک ہی بات کہی تھی کہ سیٹی بجانے والے نے پوری دھن سنائی تھی۔''

کسی نے اس کی بات سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی تکرار کی۔ ان پر سناٹا سا طاری رہا۔

''پرشاد کو صرف تین بول آتے ہیں آپ نے دیکھ لیا۔ ایک یار کسی نے سرخ آئل پینٹ کی خالی ٹیوب چھوڑ کے قتل کے الزام میں پرشاد کو ملوث کرنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ سیٹی بجا کے قاتل نے ہر جگہ پرشاد کی موجودگی کا تاثر پیدا کیا۔۔۔ مگر اس سے لاشعوری میں یہ غلطی ہوئی کہ وہ پورا گیت سنا تا رہا۔ جو پرشاد کو نہیں آتا۔۔۔ اور اگر اب بھی آپ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ پرشاد اداکاری کر رہا ہے اور جھوٹ بول کر بچنا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور آپ لوگ شوق سے پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیں اور بیچ چوراہے پر اس کی لاش لٹکا دیں۔''

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا اور ان کی آنکھیں پرشاد کو گھور رہی تھیں جو پیتل کے جگ مگ کرتے

ستاریے کے لیے رو رہا تھا۔ اس کی زبان جھوٹ بول سکتی تھی لیکن یہ آنسو نہیں بول سکتے تھے۔ پرشاد کی بے گناہی شبہے سے بالاتر ثابت ہو چکی تھی۔ ان کے پاس پرشاد کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوئی دلیل نہیں تھی۔

''اب تم جا سکتے ہو پرشاد۔۔۔! کرشن نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

''لیکن مسٹر کرشن۔۔۔! باہر ایک غضب ناک ہجوم کھڑا ہوا ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''کہیں وہ اشتعال میں جذباتی قدم نہ اٹھائیں۔ اس لیے بہتر ہے پرشاد کو زیرِ حراست رکھیں۔''

''زیرِ حراست رکھوں۔'' کرشن نے قدرے برہمی سے کہا۔ ''لیکن کس جرم کی پاداش میں۔ آپ جانتے ہیں کہ بے گناہ کو گرفتار کرنا بھی جرم ہے۔''

''ہاں۔۔۔ مگر کسی کی جان کی حفاظت کے لیے حراست ناگزیر ہو تو یہ جرم نہیں۔۔۔ اس لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' کرشن نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس نے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔

''میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں۔۔۔ یہ ذمے داری آپ قبول کریں۔ اس لیے کہ آپ اسے لے کر آئے ہیں۔'' ونود کھڑا ہو گیا۔ وہ پرشاد کو زیرِ حراست دفتر کے کمرے میں جسے اس نے حوالات بنا رکھا تھا اس میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے ایک طرح سے فٹ بھی تھا اور وبال بھی۔۔۔ لوگ بڑے مشتعل ہو رہے تھے۔ موقع پا کر اس کی جان بھی لے سکتے تھے اس وقت بھی وہ اس کی جان لینے کے درپے تھے۔

''میں اسے جہاں سے لایا تھا وہیں پہنچا دوں۔ اس کے بعد آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ ہر شہری کی طرح اس کی زندگی کو بھی تحفظ فراہم کریں۔''

''چلو پرشاد!'' اس نے پرشاد کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر باہر نکل آیا۔

ہجوم میں اشتعال کی ایک لہر سی اٹھی۔ نفرت اور غصے میں بھری ہوئی نگاہیں ان دونوں کو غضب ناک نظروں سے گھورنے لگیں۔

''خواتین و حضرات۔۔۔!'' ونود نے کسی مقرر کی طرح مجمع کو مخاطب کیا تو مجمع اسے ناگواری سے دیکھا تو وہ ایک لحظہ خاموش رہا۔

''اس دیوانے کو مسٹر کرشن نے بے گناہ قرار دے کر باعزت بری کر دیا ہے۔ قاتل پرشاد نہیں کوئی اور ہے۔'' اس نے کسی مقرر کی طرح مخاطب کیا۔

''دیوانہ یہ ہے یا کرشن۔۔۔'' کسی اور نے چیخ کر کہا۔ ''تم ہو یا تمہارا باپ۔۔۔ اسے سامنے لاؤ۔''

''شٹ اپ۔۔۔'' ونود نے گرج کر کہا۔ اس نے برداشت کیا۔ اس کے دل میں آیا کہ ان دونوں کا منہ توڑ دے جنہوں نے بکواس کی۔

لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ایک آدمی کے مقابلے میں مشتعل ہجوم کے جذبات بارود کا ڈھیر ہوتے ہیں جسے صرف ایک چنگاری سلگا سکتی ہے۔۔۔ اور تشدد پر آمادہ ہجوم کو تشدد ہی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس اور ہوائی فائرنگ ونود نے اپنا ریوالور نکالا اور اس نے اپنا رخ مجمع کی طرف کر دیا جو راستے میں رکاوٹ بن گیا تھا۔

''میرا راستہ چھوڑ دو۔۔۔ میں دس تک گنوں گا اور پھر درمیان میں گولی چلا دوں گا جسے خودکشی کرنا ہے وہ کھڑا رہے۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔'' ہجوم دو حصوں میں بٹ گیا۔ درمیان میں تین فٹ چوڑا راستہ صاف ہو گیا۔ ونود اور پرشاد ایک ساتھ چلتے ہوئے ان کے بیچ میں سے گزر گئے۔ جو خالی ہاتھ ہونے کے باعث بے بس ہو گئے تھے۔ پچاس قدم طے کرنے کے بعد ونود نے گالیاں سنیں۔۔۔ ایک سے ایک فحش بے ہودہ قبیح اور غلیظ چوں کہ اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا ان کی یہ گالیاں ان کے منہ پر جوتا بن کر لگیں۔ وہ اور مشتعل ہو گئے۔۔۔ چند پتھر اس کے قریب آ کر رکے۔ ان میں سے ایک بھی نہیں لگا تھا۔ وہ پرشاد کا بازو تھامے

چلتا گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔

''پرشاد۔۔۔!'' ونود نے اس کی جھونپڑی میں پہنچنے کے بعد کہا۔ ''دیکھو یہاں تمہارے لیے خطرہ ہے۔۔۔ لوگ تمہاری جان کے بدترین دشمن ہو رہے ہیں۔۔۔ کہیں اور جا سکتے ہو تو چلے جاؤ۔۔۔ کسی شہر یا گاؤں میں یا۔۔۔''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس دیوانے سے کیا کہے جو ابھی تک خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا۔

''کیا کوئی ایسی جگہ بھی جہاں تم چھپ کے رہ سکو۔۔۔ کچھ دن۔۔۔''

''مجھے وہ ستارہ چاہیے۔'' پرشاد نے بھوں کو تانتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تذکرہ کیا تھا نا۔۔۔'' وہ خواب دیکھ رہا تھا جس میں ہمیشہ کی طرح پدمنی اس کے سنگ تھی۔ اس کے سامنے ایک سفید بادل پھیلا ہوا تھا اور وہ ہاتھوں میں دھنک لیے کھڑی تھی۔

''بڑے شہر کے جاسوس۔۔۔'' وہ ہنستے ہنستے بولی۔ ''اب میں آپ کی تصویر بناؤں گی۔'' مگر سفید بادلوں سے اچانک لہو کی سرخی نمودار ہوئی۔ خون کا رنگ پھیلنے لگا۔

''پکڑ لو اسے۔۔۔ یہ دیوانہ نہیں۔۔۔ قاتل ہے قاتل۔'' آوازوں کا شور سا اٹھا۔ ''انصاف ہم کریں گے۔ دیکھیں کون روکتا ہے۔۔۔'' وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اسے اپنی سماعت پر فتور سا لگا۔ لیکن یہ فتور نہ تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ میں تو پدمنی کے ساتھ تھا۔۔۔ پھر یہ شر مچانے والے کہاں سے آ گئے۔۔۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔

اندھیرا اس کے گرد تھا مگر ونود جاگ چکا تھا۔ نیند غائب ہو چکی تھی۔ اب اس کا ذہن خواب کو حقیقت سے جدا کرنے میں مصروف تھا۔

بے شک جو کچھ میں دیکھ رہا تھا۔۔۔ خواب تھا۔ مگر پھر خواب کہیں سے ٹوٹ گیا تھا اور میرے کان سب سے پہلے جاگے تھے۔ آوازوں کا دبا دبا شور کسی خواب کا حصہ نہیں تھا۔ اس نے کھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اندھیرے میں اسے دور ہوتے ہوئے چراغ دکھائی دیے۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں ملیں اور غور سے دیکھنے لگا۔ چراغوں کی روشنی میں متحرک سائے سے نظر آ رہے تھے۔ نیچے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ونود نے آگے جھک کر دیکھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے اور اتنی رات سے کیا ہو رہا ہے۔

''اینا۔۔۔!'' اس نے پکار کے پوچھا ''یہ کون لوگ ہیں۔۔۔ کیا تم بتا سکتی ہو۔''

''لارڈ۔۔۔!'' اینا نے چیخ کر سر گھمایا اور اوپر کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا مسٹر ونود۔۔۔! میں خود بھی یہی دیکھنے گئی تھی کہ آدھی رات کو یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ مگر میں نے بیس پچیس آدمی ہی دیکھے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں اور ایک لمبی سی رسی بھی تھی۔''

ایک جست میں ونود واپس بستر تک پہنچا۔ شب خوابی کے کپڑے اس نے جسم سے چند سیکنڈ میں الگ کر دیے۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ الگ الگ کام کرنے لگے اور اس نے بیک وقت قمیص کے ساتھ پتلون پہننے کی کوشش کی۔۔۔ ناکام رہا۔ گرتے گرتے بچا۔ دو منٹ سے کم وقت میں وہ جوتے پہن کر تیار ہو چکا تھا۔۔۔ وہ بگولے کی طرح دروازے سے نکلا اور دروازہ یوں بند ہوا جیسے توپ چلتی ہے۔

آدھا زینہ اتر کے ونود کو ایک خیال نے روک لیا۔ وہ دونوں پیروں میں گھومنے کی کوشش دوبارہ گرتے گرتے بچا اور واپس اوپر پہنچا۔ اندھیرے کے باوجود اس کے ہاتھوں نے سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے دبا ہوا ریوالور نکال لیا۔ تفریح اور آرام کی غرض سے چاند نگر آتے ہوئے بھی وہ ریوالور کو چھوڑ کے نہیں آ سکا تھا۔ ریوالور اب اس کی ایسی ہی ناگزیر ضرورت بن گیا جیسے عام آدمی کے لیے قلم ہوتا ہے یا گھڑی ہوتی ہے۔۔۔ دروازہ پھر بند ہوا۔ توپ کا دوسرا گولہ چلا۔ نیچے سے اینا نے چلا کر کہا۔

''مسٹر ونود۔۔۔! اندر دروازے اتنے مضبوط

ہیں اور نہ دیواریں کہ۔۔۔"
اینا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے باہر جا چکا تھا۔ وہ پوری بات سن نہ سکا تھا۔
اندازے سے سمت کا تعین کر کے اس نے تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ اس کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی ایک فرلانگ دوڑنے کے بعد اس کا سانس پھول گیا۔ اندھیرے میں اس نے ایک شعلہ سا لپکتا دیکھا اور پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا۔ پرشاد کا گھر جل رہا تھا۔۔۔ تاریکی میں روشن ہو جانے والا ایک دیوانے کی متاع حیات کون کتر کر رہا تھا جو اس نے تمام عمر گزار کر حاصل کیا تھا [illegible] انصاف تھا۔

دیوانہ وہ ہے جسے اکثریت دیوانہ قرار دے۔ [illegible]یت کی دیوانگی پر کون انگلی اٹھا سکتا ہے۔ ونود کے [illegible] تک ایک آدمی کی جنت کو جہنم کی آگ مٹا چکی [illegible]ی اور کوڑے کے ڈھیر سے بلند ہونے والے شعلے ونود کا مذاق اڑا رہے تھے۔۔۔ استہزا کر رہے تے۔۔۔ تمسخر کر رہے تھے کہ بڑی دیر کی مہربان نے [illegible]ے آتے۔۔۔ مگر انصاف کرنے والے جا چکے [illegible] اور ونود کو دو فرلانگ دور چراغ ٹمٹماتے نظر آ رہے تھے اگر انہیں یقین ہوتا کہ مجرم بھی اس آگ [illegible]ل کر خاک ہو جائے گا تو وہ سزائے موت پر عمل کا یقین آ جانے تک کھڑے تماشا دیکھتے

ونود نے سوچا۔۔۔ جیسے پھانسی دینے والے [illegible]ت تک کھڑے رہتے ہیں جب تک ڈاکٹر [illegible] کی تصدیق نہ کر دے اور پھر مجرم کی لاش کے [illegible]ی اٹھنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ پرشاد یقیناً [illegible]س ہو کے بھاگا ہو گا اور ہجوم نے اسے گرفتار کر لیا [illegible]۔۔۔ مکان کو نذر آتش کرنے کے بعد مکین کا کام [illegible]رنے کے لیے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں [illegible]ی۔۔۔ ونود کو اینا کی بات یاد آئی تو وہ پھر [illegible]۔۔۔ دو فرلانگ لمبا راستہ دو میل سے بھی زیادہ [illegible]ن اور صبر آزما اذیت بن گیا جس کا ہر لمحہ جان لیوا تھا۔ ونود کی جسمانی قوت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔
ہجوم کے سائے لالٹین کی مدھم روشنی میں متحرک نظر آنے لگے۔ وہ سب ایک پیڑ کے نیچے جمع تھے۔۔۔ بیس پچیس نوجوان آدمی۔۔۔ ان میں سے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا اور پھانسی دینے کے انتظامات کو آخری شکل دے رہا تھا۔
ونود نے دس قدم رک کر اطمینان کا سانس لیا اور اس نے چہرے کا پسینہ پونچھا جو پانی کی طرح تر کر رہا تھا۔

وہ چند منٹ بعد پہنچتا تو اسے پرشاد کی جھولتی [illegible] مسکرا رہا تھا جیسے [illegible] گیا ہو۔ اسے شاید کوئی فریب دے کر لایا گیا تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے نہ آتا اور نہ مزے میں دکھائی دیتا۔
"کیا تمہیں کچھ چاہیے۔۔۔" جلاد کا فرض ادا کرنے والے نے بڑی نرمی سے سوال کیا۔ "اپنی کوئی آخری خواہش ہے تو بیان کر دو تا کہ پوری کی جا سکے۔" تماشا دیکھنے والوں کا غیظ و غضب ختم ہو گیا تھا۔ کیوں کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو رہے تھے۔ چنانچہ مرنے والے کے ساتھ جبر و زیادتی۔۔۔ بدکلامی۔۔۔ مار پیٹ غیر ضروری بلکہ غیر اخلاقی فعل بن گئی تھی۔ مجرم خوش سا تھا۔ نہ مزاحمت تھی نہ دفاع اور نہ فرار کی کوشش۔۔۔ اس ہجوم میں سے ایک شخص نکلا اور وہ پنڈت کے فرائض سنبھالے اور آگے بڑھ کے پرشاد سے بولا۔
"پرشاد۔۔۔! مرنے سے پہلے ایشور کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو۔۔۔ کیا تم نے ان پانچ بے گناہ افراد کو قتل کیا تھا؟"
"مجھے۔۔۔ مجھے پانی چاہیے۔" پرشاد نے نروس ہو کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
اس کی حیوانی جبلت جاگ اٹھی تھی اور وہ یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ پکنک نہیں ہے بلکہ وہ کسی انجانے خطرے سے دوچار ہے۔ کوئی تیسرا شخص چمڑے کی غلیظ ٹوپی میں پانی لانے کے لیے روانہ

ہوا۔ پھر وہ پانچ منٹ بعد لوٹ آیا۔ غالباً قریب ہی کوئی جھیل یا چشمہ موجود تھا۔

پرشاد نے ٹوپی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور لبوں سے لگالیا۔۔۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آدھے سے زیادہ پانی خود پرشاد کے جسم پر بہہ گیا اور ٹوپی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس میں بچا کھچا پانی زمین پر گر کے مٹی میں جذب ہوگیا۔

جلاد نے پھانسی کا پھندا پرشاد کی گردن میں ڈال دیا۔ لوگوں نے سانس روک لیے۔ اب صرف اسٹول گھسیٹ لینے کی دیر تھی۔

ونود درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ ریوالور کا سیفٹی کیچ وہ پہلے ہی ہٹا چکا تھا۔۔۔ فائر کی خوف ناک آواز جنگل کے سناٹے میں دستی بم کے دھماکے کی طرح گونجی اور آشیانوں میں سوئے ہوئے پرندے چیختے چلاتے پرواز کرنے لگے۔ انصاف کرنے والے یوں پیچھے ہٹ گئے تھے جیسے ونود نے ان کے سامنے ٹائم بم پھینک دیا ہو۔

''اگر کوئی بھی ذرا بھی ہلا تو بلا تامل اسے میں گولی مار دوں گا۔'' ونود نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے ایک ہاتھ سے رسی کا پھندا پرشاد کی گردن سے نکال دیا تو لوگوں کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں اور ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔

''ریوالور لے کر بہادری کا مظاہرہ کرنے آئے ہو۔۔۔'' جلاد نے ہمت کر کے کہا۔ ''کیا یہ بزدلی نہیں ہے۔ اس کے بغیر مقابلہ کر کے دیکھو۔''

''ہاں۔۔۔ ریوالور اسی لیے ہوتا ہے کہ ایک تنہا آدمی پچیس آدمیوں کا مقابلہ کر سکے۔'' ونود نے ریوالور کو لہراتے ہوئے کہا۔ ''خون کے پیاسے درندوں سے نمٹنے کے لیے یہ آلہ بہت کارگر ہے۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ جب میں نے ریوالور کسی کی جان لینے کے لیے نہیں۔۔۔ بلکہ جان بچانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ تم مجھے بزدل کا طعنہ دے رہے ہو، خود کو اور اپنے تمام آدمیوں کو دیکھو۔۔۔ قانون کو ہاتھ میں لے کر اسے پامال کر رہے ہیں۔۔۔ ایک بے گناہ اور معصوم آدمی۔۔۔ انسپکٹر اسے بے گناہ قرار دے چکے ہیں اور اسے تم لوگوں کے سامنے ثابت کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف تم لوگوں کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔۔۔ قانون کی اجازت نہیں۔۔۔ ورنہ میں تم سب کو ایک ایک کر کے سولی پر لٹکا دوں۔۔۔ پرشاد نیچے اترو اور میرے ساتھ واپس چلو۔۔۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے رہوں گا اور الٹے قدموں چلوں گا۔۔۔ تم مجھے اس طرح راستہ بتاتے جاؤ گے جیسے میں اندھا ہوں۔ تم ان بدمعاشوں سے ڈرنا نہیں۔۔۔ کسی نے تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی تو انہیں بھون دوں گا۔۔۔ صرف یہ ریوالور بھرا ہوا نہیں ہے۔۔۔ میری جیب میں سو گولیوں کا پیکٹ موجود ہے۔'' یہ آخری جملہ اس نے تماشائیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کہا تھا۔

پرشاد ہنسا۔۔۔ یہ واقعی اس کے نزدیک ایک دلچسپ ہی نہیں بلکہ سنسنی خیز اور خطرناک کھیل تھا۔ اب اسے جیسے احساس ہوا تھا۔ ونود نے نہایت محتاط انداز سے اور چوکنا ہو کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹنا شروع کیا۔۔۔ سارے لوگ اس کی نظروں کی گرفت میں تھے۔ صرف ایک شخص نے جھک کر پتھر اٹھانے کی کوشش کی مگر ونود کی سنسناتی ہوئی گولی اس کے پیروں کے پاس زمین پر لگی اور وہ شخص اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اس کا چہرہ مردے کی طرح بے حرکت ہوگیا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے خوف و دہشت جھانکنے لگی۔

پھر غلیظ، انتہائی فحش اور بے ہودہ گالیوں کا ایک طوفان آ گیا۔ ذلت۔۔۔ بے بسی، انتقام اور نفرت کے جذبات ایک دم سے بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے کبھی ایسی قبیح گالیاں نہیں سنی تھیں۔ وہ نہ صرف اسے بلکہ پولیس اور قانون اور پرشاد کو بھی دے رہے تھے۔

ونود نے ان کے اشتعال کی کوئی فکر نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہے کسی

میں اتنی مجال نہیں کہ قریب آ کر اس پر حملہ آور ہو۔ ونود بڑے اطمینان سے الٹے پاؤں اور پرشاد کی ڈھال بن کر چلتا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ دونوں اس قاتل ہجوم سے دور ہو گئے۔۔۔ وہ جوان کے ہیولے تھے انہیں اندھیرے نے نگل لیا تھا۔ نہ وہ اسے نظر آئے اور نہ وہ اُسے۔۔۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

ونود نے آدھے راستے میں پرشاد کو روک لیا جو اپنے گھر کی سمت جانا چاہتا تھا۔ وہ انصاف کرنے والے پاگل ہو چکے تھے۔ ونود نے آخری وقت میں ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ان کے نزدیک شہر سے نازل ہونے والا یہ شخص جاسوس نہیں شیطان تھا جو عین وقت پر پہنچ گیا تھا۔ پرشاد نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے ونود کی طرف دیکھا تو ونود نے کہا۔

''پرشاد۔۔۔! ادھر نہیں۔۔۔ تمہارا اب کوئی گھر نہیں۔۔۔ تم آج کی رات میرے ساتھ رہو گے۔ کل سوچیں گے کہ تمہارا کیا انتظام کیا جائے۔''

پرشاد خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں دبے دبے پاؤں ونود کے کمرے میں پہنچے۔ کیوں کہ پرشاد اینا سے خائف تھا۔

''وہ مجھے جھاڑو لے کر مارنے دوڑے گی۔'' اس نے کہا تھا۔

ونود کا خیال تھا کہ اس میں نہ غلط بیانی کی گنجائش ہے اور نہ ہی مباحثے کی۔ چنانچہ اس نے احتیاط بہتر سمجھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے پرشاد کو اپنا کمبل فرش پر بچھانے کے لیے دیا۔ پھر ریوالور کو پرشاد کی نظروں سے بچا کے تکیے کے نیچے چھپایا اور لیٹ گیا۔

صبح اٹھنے کے بعد اس کی نگاہ خالی کمبل پر گئی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ رات وہ پرشاد کے سو جانے کے بعد سویا تھا کہ کہیں وہ نیند میں نہ اٹھ کے چل پڑے یا تکیہ کے نیچے سے وہ خطرناک کھلونا نکالنے کی کوشش نہ کرے خود ونود نے اس کی نظر بچا کے چھپایا تھا۔ ایک فیصد ہی سہی۔۔۔ بہرحال امکان تھا کہ وہ دیکھ رہا ہو۔

''پرشاد!'' ونود نے اسے آواز دی۔

اور پھر اس نے غسل خانے میں جھانکا۔ مگر اسے اپنی حماقت کا احساس پریشان کرنے لگا تھا۔ یہ اس کی ذرا سی بھول کا نتیجہ تھا کہ پرشاد گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب تھا۔ اگر ونود نے دروازہ مقفل کر کے چابی اپنے پاس رکھی ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔۔۔ اب وہ دیوانہ اس بستی کے رہنے والے فرزانوں کے غول میں نہ گھر گیا ہو جو اس کی جان کے دشمن تھے اور اپنے انتقام کی آگ اس کے بے گناہ خون سے بجھانے کی ناکام کوشش کے بعد زیادہ خطرناک ہو چکے تھے اور اس کے تعاقب میں کہیں نہ کہیں چھپے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔

ونود کمرے سے نکل کر نیچے پہنچا تو اینا چھ فٹ لمبا ڈنڈے والے برش سے فرش کی صفائی میں مصروف تھی۔

''اینا۔۔۔!'' ونود نے مجرمانہ ندامت اور تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پرشاد کہاں گیا ہوا ہے۔ کیا اس نے بتایا۔''

''ہیں۔۔۔ وہ جہنم میں گیا ہے۔'' اینا ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرے ہاتھ سے اپنے برش کا ڈنڈا نیزے کی طرح تھام کر بڑے تلخ لہجے میں بولی۔

''مسٹر ونود۔۔۔ کرا آپ نے خود رہنے کے لیے کرائے پر لیا ہوا ہے۔۔۔ یہ کوئی پاگل خانہ نہیں ہے۔''

''میں نے صرف تم سے یہ پوچھا ہے کہ پرشاد کہاں ہے۔'' ونود نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''مجھے نہیں معلوم۔۔۔'' وہ بے رخی سے بولی تو اس کے چہرے پر ناگواری، تیزی اور تندی ابھر آئی۔

''میں نے صبح اٹھتے ہی اسے باورچی خانے میں چوروں کی طرح چیزیں چرا کے کھاتے پکڑا تھا۔ ایک تو اس نے رات کا بچا ہوا چکن بروسٹ جو ہاف تھا سلاد تھی اور کیچپ کے ساتھ بغیر ڈکار کے پہلے ہی ہضم کر چکا تھا۔ اس کی ہڈیاں ڈرین میں پڑی تھیں۔

ایک گلاس دودھ جو ہاف لیٹر تھا وہ پی چکا تھا۔۔۔ غضب خدا کا۔۔۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بدمعاش تین کیلے نگل گیا۔۔۔ پھر میں نے یہ ڈنڈا اٹھایا اور اس کے دو لگائے مجال ہے جو اس کے ندیدے پن میں فرق آیا ہو۔ باہر نکلتے نکلتے وہ نہ صرف تین اور غپ غپ کھا گیا بلکہ دو عدد سیب جو آدھا کلو تھے وہ اور کیلے بھی لے گیا۔‘‘

’’تو تم نے اسے مار کر باہر نکال دیا۔‘‘ ونود نے تیز و تند لہجے میں چیخ کر کہا۔ ’’کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنے دنوں کا بھوکا ہے۔۔۔ وہ کھانے ہی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ تم پر تو نہیں۔۔۔ تم پر ٹوٹ پڑتا تو تم کیا کرتیں۔۔۔!‘‘

’’اور نہیں تو کیا کرتی۔۔۔‘‘ اپنا تاثر اور احساس کیے بغیر بولی۔ ’’باقی اور جو بہت سارے پھل تھے اس کے سامنے ڈھیر کر دیتی اور اسے من مانیاں کرنے دیتی۔۔۔ میں نے اسے سو گالیاں دیں اور سو گز تک اس کے پیچھے بھاگی۔ مگر اس نے پورے ایک درجن کیلے ہڑپ کر لیے اور سیب اپنی جیب میں بھر لیے۔۔۔ وہ کوئی بھوت لگ رہا تھا۔‘‘

’’بے وقوف عورت۔۔۔‘‘ ونود نے پیر پٹخ کر کہا۔ ’’میں اس کی جان بچا کے لایا تھا۔۔۔ میں نے اسے پناہ دی تھی۔ ورنہ لوگ اسے پھانسی پر لٹکا دیتے اور تو نے اسے پھر دشمنوں کے حوالے کر دیا۔‘‘ وہ دروازے کی طرف لپکا۔

’’اچھا ہے وہ اب کے اسے پھانسی لگا دیں۔‘‘ اینا نے پیچھے چلا کر کہا۔ ’’میری جان بھی چھوٹ جائے۔۔۔ اور میری عزت پر آنچ نہ آئے۔‘‘ ونود سخت پریشان تھا کہ اب کہاں جائے اور کس سے پوچھے کہ وہ دیوانہ کہاں ہے۔ کوئی بتانے سے رہا۔ سب اس کی جان کے دشمن ہیں۔ پھر وہ کرشن کے گھر پہنچا جو سو کر اٹھا ہی تھا۔ وہ برش کرتا باہر آیا اور ونود کو اتنی سویرے دیکھ کر حیران ہوا۔

کم سے کم الفاظ میں ونود نے اسے بتایا کہ رات کو کیا ہونے والا تھا۔ جسے وہ بروقت مداخلت سے ناکام بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن صبح سویرے اینا نے سوچے سمجھے بغیر پرشاد کو مار بھگایا۔۔۔ اب پرشاد کی جان یقیناً خطرے میں ہے۔

ونود کے دل کو تھوڑی سی ڈھارس ہوئی مگر اس کا اضطراب برقرار رہا۔۔۔ کرشن کے تیار ہونے تک اور کافی لانے تک وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ سریندر اندر آیا اور ونود کو اچانک اور غیر متوقع اپنے ہاں دیکھ کر ٹھٹکا۔

پھر اس نے مختصراً کہا۔ ’’خیریت تو ہے سر۔۔۔! آج صبح صبح۔‘‘ وہ صبح کی سیر کر کے لوٹا تھا اور غالباً یہ اس کی عادت تھی۔ ونود نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور زیرِ لب مسکرایا۔ سریندر اندر چلا گیا۔ نہ جانے جالندھر جیسے شہر کی مصروفیات میں وقت کیسے نکلتا ہوگا۔ ونود نے سوچا پھر کرشن آ گیا اور وہ دونوں ایک پرانے ماڈل کی ہنگامہ خیز کار میں ایک ساتھ روانہ ہوئے۔۔۔ کسی بھی شہر میں یہ کار تماشا بن سکتی تھی۔ چاند نگر کے ماحول میں نہیں چند منٹ میں کرشن کا آفس آ گیا۔ کرشن نے پرشاد کی تلاش کے احکامات جاری کیے اور خود بھی ونود کے ساتھ چل پڑا۔ اسے بھی پرشاد کی بڑی فکر لاحق ہو رہی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد انہیں اطلاع مل گئی کہ پرشاد کہاں ہے۔۔۔ وہ سمندر کے کنارے الٹا پڑا تھا اور دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے اس کا سر غائب ہے مگر اس کا سر ریت میں دفن تھا۔۔۔ کسی نے خاصا بڑا گڑھا کھود کے سر گردن تک دبایا تھا اور اوپر بھی ریت ڈال دی تھی۔۔۔ وہ خود۔۔۔ ساکت و صامت کھڑا۔۔۔ کرشن کے ایک ماتحت کو ریت ہٹاتا دیکھتا رہا۔۔۔ وہ جو دیوانے کی دشمنی میں دیوانے ہو گئے تھے بالآخر جیت گئے تھے اور ونود جو ایک بار اس بے گناہ کو تختۂ دار سے اتار لانے میں کامیاب ہو گیا تھا ہار چکا تھا۔۔۔ کم یابی کی خوشی میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ زندگی کی لکیر تو دستِ قدرت کھینچتا ہے اور انسان اس کو عبور کر کے ایک دن بھی جی نہیں سکتا۔ جب ونود

نے پرشاد کو بچایا تو پرشاد کی زندگی کی مہلت تمام ہونے میں چند ہی گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ اگلی صبح کا آفتاب طلوع ہوتے ہی اس کے زندگی کے چراغ کو گل ہو جانا تھا۔ اب اس کے مسخ ہو جانے والے چہرے پر بے جان آنکھیں بھی اندھی ہو گئی تھیں کیوں کہ ان میں ریت بھر گئی تھی۔ چنانچہ پرشاد نہ شرمسار ہوا تھا اور نہ کسی کو شرمندہ کر رہا تھا۔

"آپ نے دیکھا مسٹر کرشن۔۔۔!" ونود نے تلخی سے کہا۔ "آپ کے قانون سے زیادہ طاقت ور جنگل کا قانون ہے جو کسی کے نظام انصاف کو تسلیم نہیں کرتا۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میزان عدل بھی قاتل کے ہاتھ میں ہے۔"

"آپ ... آپ کا مطلب ... پرشاد کو مارنے والے وہ سب ہو سکتے ہیں جو گزشتہ شب اسے پھانسی دے رہے تھے۔"

ونود نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ سب ناکامی پر مشتعل ضرور ہوں گے۔۔۔ شاید وہ پھر کوئی پروگرام بنالیں کہ اب پرشاد کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ مگر چند گھنٹے بعد وہ اتنی جلدی اور فوراً ہی یہ حرکت دوبارہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں جرات پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ پیشہ ور قاتل یا جنونی نہیں ہیں۔ عام لوگ ہیں جن کے جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے۔ اب وہ ...ت سے چھپے بیٹھے ہوں گے کیوں کہ میں نے بہت سے چہرے دیکھ لیے تھے۔ دوبارہ دیکھنے پر میں انہیں پہچان لوں گا۔ یہ اسی سفاک اور عیار قاتل کی حرکت ہے جس نے پانچ افراد کو قتل کر کے پرشاد کو مجرم بنا دیا کیوں کہ وہ دیوانہ تھا اور قاتل اسے سزائے موت دلانے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر میں نے اس کے ...ائم کو خاک میں ملا دیا۔۔۔ جب کہ آپ نے بھی اسے بے گناہی کی سند عطا کر دی تو قاتل کے لیے پرشاد کا وجود بے مصرف ہی نہیں خطرناک بھی ہو گیا۔ اس لیے اس نے چھٹا قتل کر کے قربانی کے بکرے کو بھی ...ی ڈالا۔"

"مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے۔" کرشن نے کہا۔ "اگر آپ کی بات درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل بدستور ہمارے درمیان موجود ہے۔"

"ہاں۔" ونود نے سر ہلایا۔ "اور اگر وہ اپنے اگلے شکار کا انتخاب کر چکا ہو گا تو ثابت بھی ہو جائے گا۔"

"مگر اس کا اگلا شکار کون ہو گا۔" کرشن نے بے بسی سے دریافت کیا۔ "مجھے یہاں قتل کی ان وارداتوں کے درمیان کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔۔۔ کوئی بات مشترک نظر نہیں آتی جو قتل کی وجہ بن سکے۔ آخر کوئی یہ قتل عام کیوں کر رہا ہے۔ اس کا پس منظر واضح نہیں ہے۔"

"ایک بات پر یقین رکھیں مسٹر کرشن!" ونود نے چلتے ہوئے کہا۔ "انصاف میں دیر ممکن ہے اندھیر نہیں سو دن چور کے ایک دن کوتوال کا۔"

"ونود۔۔۔! تم پاگل ہو جاؤ گے۔" پدمنی نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "گھڑی میں ٹائم دیکھو کہ کیا وقت ہوا ہے۔"

وہ نائیلون کے سیاہ لباس شب خوابی میں اپنے حسن کی تمام تر جلوہ آفرینی کے ساتھ ونود کے سامنے تھی۔

مگر ونود کی نظریں کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ پدمنی جانتی تھی کہ ونود کی آنکھیں اس کے وجود سے یقیناً باخبر ہیں مگر وہ خود ہر احساس سے محروم ہو چکا ہے۔۔۔ احساس جمال۔۔۔ چاہت کا جذبہ۔۔۔ یہ سب وقتی طور پر بے معنی ہو گئے ہیں۔ وہ نیند اور بھوک جیسی جسمانی ضروریات تک فراموش کر چکا تھا۔ ایک کمرا جہاں وہ مکمل یکسوئی کے ساتھ کام کر سکے۔

کاغذ۔۔۔ قلم۔۔۔ سکون۔۔۔ کبھی چائے یا کافی اور سگریٹ۔۔۔ مگر اس کے باوجود وہ شخص دہلی سے آرام اور تفریح اور صحت یاب ہونے کی غرض سے آیا تھا۔۔۔ ذہنی مریض بن گیا تھا۔ وہ کیا سوچ کر آیا تھا۔۔۔ کیا ذہنی مریض بننے کے لیے۔۔۔؟

''کیوں پدمنی۔۔۔۔'' وہ بار بار کہتا تھا۔ ''یہ سب قتل کیوں ہوئے۔ اب تک میری عمر اس دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر قتل کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ بے وجہ کوئی قتل نہیں کرتا پاگل بھی کسی کی جان لیتا ہے تو اپنا دشمن جان کر اور دشمنی کی کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے۔'' اس نے پدمنی کو حساب لگا کر بتایا۔

''مرنے والوں میں پہلا ایک بے ضرر بوڑھا تھا جس کے پاس دولت بھی نہیں تھی۔

دوسرا ایک شرابی تھا جسے اپنا ہوش تک نہ تھا وہ شراب کے نشے میں ہر وقت دھت رہتا تھا۔

تیسری ایک کنجوسی بڑھیا تھی جسے صرف دولت سے پیار تھا لیکن دنیا سے خالی ہاتھ گئی۔

پھر دو محبت کرنے والے مارے گئے تھے جو کسی کے دشمن نہ تھے۔

آخری آدمی اور درویش تھا یا مجذوب، دیوانہ تھا یا ہوش مند۔۔۔ یہ قتل کسی نے دولت کے لیے نہیں کیے تھے۔۔۔ قاتل وحشی جنونی نہیں تھا۔۔۔ اور وہ بے وقوف بھی تو نہیں تھا۔۔۔ بڑی ذہانت سے وہ لوگوں کو چن چن کے مار رہا تھا جو بظاہر ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق تھے۔ ایک دوسرے کو صرف اس حد تک جانتے تھے کہ وہ چاند نگر کے رہنے والے ہیں۔ مگر چاند نگر میں تو دو سو گھر تھے جن میں۔۔۔ کم از کم پانچ سو افراد تھے۔ یہ تیسرا دن تھا اور اس عرصے میں ونود نے کم سے کم پچاس وجوہات لکھی تھیں جو قتل کی محرک ہوتی ہیں اور ہر بار اسے قتل ہونے والوں کے درمیان قدر مشترک نہ ملنے سے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا اس کا قیاس غلط ثابت ہوگا۔

''تم نے سنا نہیں۔'' پدمنی نے قریب آ کر کہا۔ ''جاؤ۔۔۔ اب جاؤ۔'' ونود چونکا۔ ''ہاں۔'' وہ خفت سے مسکرایا۔ ''مجھے اب واقعی سو جانا چاہیے۔۔۔ مسز سادھنا سے زیادہ ہر روز وہ شاہ جنات کی بیٹی مجھ پر گرم ہوتی ہے کہ مسٹر۔۔۔! یہ دہلی نہیں ہے۔۔۔ یہاں شرفا آدھی رات تک باہر رہتے ہیں اور نہ جاگتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔'' اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر دیوار گیر گھڑی پر گئی۔ ''ڈھائی بج گئے۔۔۔ آج تو وہ ہرگز ہرگز در دروازہ نہیں کھولے گی۔۔۔ اور اگر دروازہ کھولا وہی ڈنڈے والا برش لے کر مجھے مار بھگانے کے لیے۔۔۔ وہ ہر کسی پر جس سے وہ تنگ آ جاتی اور بے زار ہو جاتی ہے یہی ڈنڈا اٹھا لیتی ہے۔''

پدمنی ہنس پڑی۔ ''تو۔۔۔ اگر ایسی بات ہے یہیں سو جاؤ۔۔۔ جگہ بہت ہے۔'' اپنی ہی بات پر خود ہی اس کے رخسار دہک اٹھے۔

''مگر۔۔۔ ہاں جگہ تو بہت ہے مگر۔۔۔ لوگ!'' ونود نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کون لوگ۔۔۔؟'' پدمنی نے کہا۔ ''یہ جو بے گناہوں کو پھانسی دے کر انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔۔۔ اور جن میں ایک بے ضمیر قاتل چہرے پر معصومیت کی نقاب چڑھائے بے خوفی سے گھوم رہا ہے۔۔۔ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا۔۔۔ ہمیں ان سے کیا۔۔۔ اور ان کی شرافت سے کیا اور ان کی شرافت کے معیاروں سے۔۔۔ ہمیں ان کی اس دنیا میں نہیں رہنا ہے۔''

''وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ پدمنی!'' ونود نے کم زور لہجے میں کہا۔ ''مگر وہ کیا مشل ہے۔ روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔''

''رومن تو قتل کر رہے ہیں۔'' پدمنی فخر سے بولی۔ ''انہیں بھی جو صرف محبت کرتے ہیں۔۔۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ کو اپنی نیت کے خلوص پر کوئی شک وشبہ ہے؟''

''میں نے زندگی میں اتنے خلوص سے کسی کو نہیں چاہا۔۔۔!'' ونود نے سپاٹ انداز سے کہا۔ ''یہ چاند نگر۔۔۔ دل نگر بن گیا۔۔۔ اور اب بھی ہے۔''

''تو ڈارلنگ۔۔۔! چلو چھوڑو یہ سب۔۔۔ چلو ہم دہلی لوٹ چلتے ہیں۔ ساری دنیا کے غم کون پالتا ہے۔'' پدمنی بولی۔ ''آپ بے حد جذباتی ہو رہے

ہیں۔" ونود نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔

"نہیں۔۔۔ پدمنی! اب میں اس دلدل سے نہیں نکل سکتا۔۔۔ بالفرض میں اگر بھاگ بھی گیا تو یہ بوجھ تمام عمر میرے ضمیر پر رہے گا۔۔۔ چند دن اور میری جان۔۔۔! کوئی غیب کی صدا مجھے کہتی ہے کہ صیاد اپنے جال میں آرہا ہے اور اس کے گرد حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ ایک مجرم کتنا ہی ہوشیار۔۔۔ چال باز کیوں نہ ہو وہ قانون سے بچ نہیں سکا نہ بچ سکتا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے میں یہیں سو جاؤں۔"

"ویسے تو دوسرا بیڈ روم بھی ہے مگر اس کی چابی گم ہو گئی ہے۔ کیا تم شرافت سے میرے بیڈ کے نیچے نہیں سو سکتے۔" صبح کا سورج سمندر سے ابھرا اور آسمان کی وسعت کو طے کرتا ہوا چاند نگر تک آپہنچا۔

روشنی سے پدمنی کی آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی میں دس بج رہے تھے اور ہر روز کی طرح وہ اکیلی تھی۔

"ونود ڈارلنگ۔۔۔!" اس نے پکارا۔

پھر وہ ایک انگڑائی لے کر اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرائی۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا کمرے کی نیم تاریک فضا سے روشن آسمان اور اجلی دھوپ کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔۔۔ ہوا میں بہار کی خوشبو تھی اور سرسبز درختوں کے دامن میں پھولوں کے رنگ دمک رہے تھے۔ اتنی پر آسائش دنیا میں موت کا احساس کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ ونود کا کہیں پتا نہیں تھا۔ نہ اپنے اس کمرے میں جسے وہ بڑے شہر کے جاسوس کا کمرا کہتا تھا۔۔۔ کیوں کہ پدمنی کی بنائی ہوئی تصویر وہیں رکھی تھی۔

"آخر یہ کیا بکواس ہے۔ میرے سر میں یہ خنجر۔۔۔ یہ پستول اور گولیاں کیوں بھر گئی ہیں اور میرا سر دستی بم کی طرح بنایا گیا ہے۔" اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ بے ایمان ہے۔۔۔ تمہیں دل بھی دکھانا چاہیے جس میں تمہاری صورت کا نقش نظر آتا۔"

پدمنی نے ایک سرد آہ بھری اور باورچی خانے کا رخ۔۔۔ پھر دروازہ کھول کر اس نے کسی امید کے بغیر باغ میں دیکھا۔۔۔ انتظار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ انتظار کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے اسے وہی محسوس کر سکتے ہیں جو اس کرب سے گزرتے ہیں۔ اس نے مایوسی سے سوچا تمام دن وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔۔۔ اس نے پینٹ کرنا چاہا مگر سارے رنگ ایک ہو گئے یا ہر رنگ لہو کا رنگ بن گیا۔ پھر وہ کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔۔۔ ہر طرف ایک سناٹا تھا اور نامعلوم خوف کے سائے تھے۔۔۔ پہلی بار پدمنی کو احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ حالانکہ اس گھر میں رہتے ہوئے اسے ایک برس ہو گیا تھا اور ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جس میں تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑی ہو۔ دوپہر کے بعد دستک سن کے وہ دروازے کی طرف لپکی مگر ونود کے بجائے اسے اینا کا آتش فشاں پہاڑ نظر آیا۔ وہ بلائے بغیر اندر آ گئی۔

"مس۔۔۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اپنے لیے نہ سہی۔۔۔ دوسروں کی خاطر مکان آبادی کے قریب لینا چاہیے۔ یہاں ٹیکسی نہیں ملتی۔" اس نے پرتجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک کرسی میں فٹ ہو گئی۔۔۔ "کدھر ہے وہ؟"

پدمنی شوخ انداز سے مسکرا دی۔ "غالباً تم مسٹر ونود کو پوچھ رہی ہو۔۔۔ وہ مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس میں رہتے ہیں۔"

"رہتے تھے۔۔۔" اینا نے کہا۔ "اور گیسٹ ہاؤس میں اتنا بڑا طوفان بن کے کوئی نہیں آیا تھا۔۔۔ خیر اس سے کہو کہ اپنا بستر گول کرے۔۔۔ آئندہ کوئی سراغ رساں ادھر کا رخ تو کرے۔" اس نے ایک لفافہ برآمد کیا۔ "یہ اس کے نام آیا ہے۔ میں یہی دینے آئی تھی۔"

پدمنی نے ٹیلی گرام کا لفافہ دیکھا جو غالباً مسز سادھنا پہلے ہی کھول چکی تھی۔ تار دہلی کے پولیس کے

ہیڈ کوارٹر سے آیا تھا اور اس میں ونود کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فوراً لوٹ آئے۔ اس کی بقیہ چھٹی منسوخ کی جاتی ہے۔ وہ ایک دن کی تاخیر بھی نہ کرے۔

طوالت کے علاوہ تار میں استعمال ہونے والی سخت زبان نے پدمنی کو حیران کر دیا تھا۔ کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔۔۔ تاخیر کو حکم عدولی سمجھا جائے گا۔ فون پر رابطہ نہ کیا جائے۔ کیوں کہ معاملہ سنگین ہے۔

پدمنی نے تار کو سنبھال کے رکھ دیا اور اینا کی خاطر مدارت کے لیے کافی بنانے چلی گئی۔

''لڑکی۔۔۔'' اینا نے رخصت ہوتے وقت کہا۔ ''تم نے شادی کیوں نہیں کی اب تک؟ ... حیرت ہے، یقین نہیں آتا تم شادی شدہ نہیں ہو۔''

پدمنی ہنس پڑی۔۔۔ ''بس ایسے ہی۔۔۔ خیال نہیں آیا اب تک اور نہ ہی کبھی خیال آیا۔۔۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ شادی جلدی کر لی جائے۔''

''اب خیال کرو۔۔۔ سوچو۔۔۔ تم اچھی پتنی بن سکتی ہو۔ اچھے پتی کے لیے انتظار میں عمر ضائع مت کرو۔۔۔ عمر بڑی تیزی سے گزر جاتی ہے۔۔۔ شوہر کبھی اچھے نہیں ہوتے۔۔۔ بنائے جاتے ہیں ونود میرا مطلب ہے تار۔۔۔ خیر۔''

وہ پلٹی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ ہنستے ہنستے پدمنی کا برا حال ہو گیا۔ پھر اسے تار کا خیال آیا۔ اس نے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو گویا اب ونود چلا جائے گا۔۔۔ گڈ میں بھی یہی چاہتی تھی۔۔۔ تار بروقت آیا۔

ونود رات سے کچھ دیر پہلے نمودار ہوا اور دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔

''پانی۔۔۔ چائے، کافی، ایک جام شرب اگر ہو تو۔'' اس نے چلانا شروع کیا۔ ''معلوم ہے آج میں کیسا پہاڑ کھود کے آیا ہوں۔۔۔ نہیں ایسے نہیں۔۔۔ یہ بات۔۔۔ بہت اہم ہے اور انتہائی سنگین بھی۔۔۔ سب دروازے کھڑکیاں بند کر دو۔۔۔ اور اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔۔۔ مگر پہلے کھانے کو لاؤ۔۔۔ بھوک نا قابل برداشت ہو رہی ہے۔ چوہے بہت تیزی سے دوڑ رہے ہیں۔''

''پہلے تم سکون اور اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور یہ دیکھو۔۔۔'' پدمنی نے بھنا کر کہا۔

پدمنی نے لفافہ ونود کے سامنے ڈال دیا مگر وہ اس پر نگاہ ڈالے بغیر کھڑا ہو گیا۔ ہر کھڑکی سے باہر جھانک کے اس نے اندر سے چٹخنی لگائی اور پردے برابر کیے۔ تمام دروازوں کو اندر سے مقفل کیا اور باورچی خانے سے پدمنی سے اس کی صورت اور حرکات و سکنات کو دیکھتی رہی۔ وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کس حد تک پریشان اور تشویش کا شکار اور بے چین تھا... جب وہ کھانے پینے کا سامان لے کر آئی تو وہ ایک ڈائری کے صفحے پلٹ رہا تھا پھر اس نے ہر جیب سے کاغذات نکالے اور اپنے سامنے رکھ لیے۔

''پدمنی۔۔۔! تمہیں ریوالور کا استعمال آتا ہے؟'' اس نے کافی پیتے پیتے بے خیالی میں پدمنی پر نگاہ جما کر کہا۔ ''نہیں۔''

''اچھا کل میں سکھا دوں گا۔۔۔ آدھے گھنٹے کی بات ہے۔۔۔ پھر تم اپنی حفاظت خود کر سکو گی۔''

''کیسی حفاظت۔۔۔'' پدمنی نے پریشانی سے کہا۔ ''تمہارا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔۔۔ کس سے خطرہ ہے مجھے۔۔۔؟''

''اسی قاتل سے جو اب تک چھ افراد کی زندگی کا نذرانہ لے چکا ہے۔'' ونود نے کہا۔ ''اس کا ساتواں شکار تم ہو۔''

کافی کا مگ پدمنی کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ میز کے کونے سے ٹکرایا اور ٹوٹ گیا۔ ''کیا تم پاگل ہو گئے ہو ونود!''

''یہ تم کئی بار پوچھ چکی ہو۔۔۔ دوسرے لوگوں کی طرح۔'' ونود نے برا مانے بغیر کہا۔ ''اور اس کا جواب وہی ہے یعنی کہ میرا دماغ بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہا ہے۔۔۔ میں نے وہ بنیادی بات معلوم کر

جو معمہ بنی ہوئی تھی یعنی قتل کی وجہ۔۔۔ یہ سب بلاوجہ مارے نہیں گئے ہیں۔۔۔ قاتل کا آخری ہدف تم پر اب تک اس لیے نہیں ہوسکا کہ وہ مجھ سے ڈرتا ہے اور میں یہاں موجود تھا۔۔۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں کام ختم ہونے کے بعد چلا جاؤں گا۔۔۔ پھر تم تنہا رہ جاؤ گی۔ وہ اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا ہے۔ چناں چہ وہ آخری کامیابی کے لیے دہلی بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی ضرورت نہیں کہ تم دہلی جا کے بچ جاؤ گی۔ یوں دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور تم دیکھو گی کہ شامت اعمال خود اسے تمہارے دروازے تک ... کام آئے گا ... تمہاری زندگی اس کے لیے موت کا سامان بن جائے گی۔“

اس نے رک کر سگریٹ جلائی اور ایک ہاتھ سے پدمنی کو قریب کرلیا۔

”بات تھوڑے سے انتظار کی ہے جان من۔۔۔! قاتل زیادہ دن انتظار نہیں کرسکتا۔۔۔ میں نے آج سارا دن جھک ماری ہے۔ لیکن میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔۔۔ آج صبح مجھے اچانک ایک پرانی بات یاد آ گئی۔۔۔ جب میں گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے میری ملاقات پرشاد سے ہوئی تھی اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی تھی کہ مسٹر فیشن لاش دریافت کرنے کے بعد میں شکوک کا شکار ہو ۔۔۔ میں نے گاؤں کے جنرل اسٹور کے لیے ... کے مالک سے بات کی جس نے پرشاد کا پتا ... نے کے بعد مجھے گاؤں کی تاریخ سے روشناس کرایا اور میں بڑی مشکل سی اس باتونی شخص سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوا تھا۔ آج صبح مجھے اس کی بات یاد آئی تو میں تمہیں سوتا چھوڑ کے نکل گیا۔ میں نے اس سے تفصیلی گفتگو کی اور پھر ڈسٹرکٹ آفس چلا گیا۔۔۔ بیس میل دور۔۔۔ وہاں پرانا ریکارڈ نکلوانا مسئلہ بن گیا تھا۔ مجھے مجبوراً اپنا شناختی کارڈ استعمال کرنا پڑا تھا۔ کیوں کہ کوئی تعاون پر آمادہ نہ تھا۔ کیوں کہ ریکارڈ بڑی ابتری کی حالت میں تھا۔۔۔ میں نے دھمکی دی کہ بعد میں ایف بی آئی والے آئیں گے تو ریکارڈ ہی نہیں ڈسٹرکٹ آفس بھی اٹھا کے لے جائیں گے۔ بادل ناخواستہ انہوں نے تہ خانوں کی خاک دھول میں پڑے ہوئے رجسٹر نکالے، فائلیں تلاش کیں۔۔۔ کاغذات ڈھونڈے اور میرے ساتھ بیٹھ کر دیکھے۔۔۔ چھ گھنٹے کی محنت کے بعد میں تفصیلات مرتب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اموات و پیدائش کا سارا ریکارڈ ابھی تک موجود ہے۔ حالاں کہ یہ بات سولہ سو نوے کی ہے۔ تقریباً پہلے کی انگریزی بھی غلامانہ دور میں جو تھی وہ بھی ... تھی جو آج ہے۔ مثلاً ایس کی جگہ ایف پڑھا جاتا تھا۔۔۔ اور گرامر کے اعتبار سے بھی وہ سرکاری عدالتی زبان بس کا سمجھنا مشکل تھا مگر آسانی یہ ہو گئی تھی کہ مجھے ایک شخص آج کی زبان میں مطلب سمجھا گیا۔۔۔ شہنشاہ ولیم سوئم نے کہیں چاند تارا چندا کے نام کسی کارنامے پر خوش ہو کر ہندوستان میں ہی اس کے نام ایک جزیرہ بخش دیا۔۔۔ معلوم نہیں وہ فوج کا کیپٹن تھا یا کسی بحری جہاز کا۔۔۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اسے یہ انعام کیوں دیا گیا تھا۔ اس وقت زمین اور جزیرے کے درمیان تھوڑا سا سمندر حائل تھا۔ پانی کی یہ پٹی کسی نہر کی طرح تھی جو بعد میں خشک ہو گئی۔۔۔ لیکن ایک صدی قبل سونامی طوفان آیا تو پھر سمندر وجود میں آ گیا تھا۔۔۔ چاند نگری کا گاؤں اسی کیپٹن چاند تارا چندا کے نام پر ہے۔ اور گاؤں میں پچاس فیصد لوگ رہے ہیں چاند تارا چند کہلاتے ہیں تو غالباً اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے۔۔۔ خیر جزیرہ 1776 کی خانہ جنگی تک کیپٹن چاند تارا چند خاندان کی ملکیت رہا 1779 ۔ میں جب سول وار ختم ہوگئی تو اس کی ملکیت کا سوال اٹھا۔۔۔ کیا بری تہہ کے شہنشاہ ولیم سوئم کا فرمان کوئی قانونی سند ہے۔۔۔ جس کی رو سے جزیرے کو کیپٹن چاند تارا چند کی ملکیت سمجھا جائے۔۔۔ وہ شاہی فرمان چمڑے پر کسی ایسے رنگ سے لکھا گیا تھا کہ تین سو برس گزر جانے

کے باوجود آج بھی صاف اور واضح طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ چاند تارا چند کے وارثوں نے حق ملکیت کے لیے عدالت سے رجوع کیا اور پندرہ برس کی قانونی جنگ کے بعد مقدمہ جیت لیا۔

مگر شاہی فرمان منسوخ کرنے کے بعد اسے ایک ناقابل تنسیخ سرکاری حکم میں بدل دیا گیا۔۔۔ قانوناً جاگیر انگلینڈ کے بادشاہ کی عطا کردہ جاگیر نہیں بلکہ ہندوستانی حکومت کے لیے ایک طرح سے عطیہ بن گئی جس سے چاند تارا چند کے وارثوں کی پوزیشن بہت نمایاں ہوگئی۔۔۔ معلوم نہیں چاند تارا چند کے خاندان کو اس عنایت کا مستحق سمجھا بھی گیا تھا یا نہیں یا خود جزیرے کے مالک اس قدر طاقت ور اور اثر و رسوخ کے مالک تھے کہ ان کی جاگیر ان سے کوئی چھین سکا۔۔۔ کافی ہاؤس بار کے مالک نے مجھ سے ایک بات کہی تھی کہ یہاں سب ناجائز قابضین ہیں اور یہ زمین ان کے ماں باپ کی جاگیر نہیں۔۔۔ یہ بات بہت سے لوگ بھی کہتے ہیں مگر حقیقت کا علم کسی کو نہیں۔

سوا سو برس تک یہ سلسلہ بخیر و عافیت چلتا رہا۔۔۔ یعنی ایک وارث مرتا تھا تو اس کا سب سے بڑا بیٹا از خود جزیرے کا مالک بن جاتا تھا۔ پھر قدرت کے ایک اشارے سے کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ سن اٹھارہ سو بارہ میں جزیرے کا مالک شیام تارا چند تھا۔ اس نے اپنی اولاد نرینہ کی امید میں چھ لڑکیاں پیدا کیں اور ابھی حوصلہ نہیں ہارا تھا کہ ایک حادثے میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کی چھ بیٹیاں چھ مختلف افراد سے بیاہی جا چکی تھیں اب یہ شجرہ نسب ملاحظہ ہو۔

پہلی لڑکی سرلا کا ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کا بھی ایک بیٹا ہوا۔ پھر ایک لڑکی پیدا ہوگئی جس کی شادی سوراج عرف فیشن نام کے شخص سے ہوئی۔۔۔ مقتول نمبر دن مسٹر فیشن انہی کا بیٹا تھا جس کی بیوی مر چکی تھی اور جو بے اولاد تھا۔

دوسری لڑکی مالنی کا سلسلہ بھی ایسے ہی چلا اور یکے بعد دیگرے پانچویں نسل تک ہر ایک کا وارث اکلوتا بیٹا ہی رہا۔ مقتول نمبر دو نرنجن اسی سلسلہ نسب کا آخری فرد تھا جو بے اولاد مر گیا تھا۔

تیسری لڑکی رادھا کی چوتھی نسل تک ایک ایک بیٹا زندہ رہا باقی کم عمری میں مرتے گئے۔ آخری بیٹے نے شکنتلا دیوی نام کی لڑکی سے شادی کی جو مقتول نمبر تین سے۔۔۔ اس کا شوہر ہندوستان کی ایک جنگ جو چین سے ہوئی تھی مارا گیا۔۔۔ بیٹا ویت نام کی نذر ہوا۔

چوتھی لڑکی پدھا۔۔۔ اس کی چار نسلیں یوں ہی گزریں کہ ہر ایک کو ایک ایک ہی بیٹا نصیب ہوا۔ اس خاندان کا آخری فرد مقتول نمبر چار تھا۔ جس نے ایک بار شادی کی اور دوسری بار محبت۔۔۔ مگر دنیا سے لاوارث گیا کیوں کہ اس کے ناجائز بچے کو جنم دینے والی بھی کار لے کر سمندر میں اتر گئی۔

پانچویں لڑکی تھی پونم۔۔۔ اس کی اگلی چار نسلوں کے وارث بیٹے رہے۔۔۔ پانچویں نسل میں ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام تھا سیتا۔۔۔ جو شادی سے قبل ہی مر گئی۔ موت کے اسباب بھی بتائے گئے ہیں یعنی کوئی بیماری وغیرہ۔۔۔ بیماری کیا تھی اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔

چھٹی اور آخری لڑکی کا نام شوبھا تھا۔۔۔ اس کا سلسلہ نسب تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گیا یعنی اس کا ایک بیٹا ہوا۔۔۔ اس بیٹے کی ایک بیٹی تھی جس کی شادی کوتم نام کے ایک شخص سے ہوئی مگر ایشور نے اسے اولاد سے محروم رکھا۔

ونود کاغذات کو الٹ پلٹ کے پڑھنے میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے پدمنی کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اب یہ داستان ماضی تمام ہوئی۔ تو اسے پدمنی کی حالت دیکھ کر تعجب ہوا۔۔۔ اس کا رنگ کورے لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا اور وہ پلک جھپکائے بغیر خلا میں دیکھ رہی تھی۔ ونود نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کا نرم و نازک خوب صورت ہاتھ تھاما تو وہ لاش کی طرف سرد لگا۔

''پدمنی۔۔۔! کیا بات ہے جان۔۔۔!

ہماری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!'' ونود نے کہا تو اس کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

پدمنی نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور اس خوف سے معمور سرگوشی کی۔ ''ونود۔۔۔ تم نے واقعی بڑی عرق ریزی کی۔۔۔ محنت کی۔۔۔ مگر مجھے اپنی ماں کا نام یاد ہے۔ ان کا نام سیتا تھا۔ یہ غلط ہے کہ وہ شادی سے قبل ہی طبعی موت مر گئی تھی۔ کیوں کہ اس نے اپنی مرضی سے ایک کم حیثیت آدمی کے ساتھ فرار ہو کر ان کی عزت کی ارتھی اٹھادی تھی۔ معلوم نہیں بعد میں والدین نے طبعی موت کا اندراج کرانے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے۔۔۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری ماں زندہ رہی تھی اس نے امرناتھ نام کے ایک شخص سے شادی کر لی تھی۔۔۔ میرا نام پدمنی ناتھ ہے۔۔۔ میرا باپ شادی کے دو برس بعد پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اور میری ماں مجھے گود میں لے کر گھر سے نکل گئی تھی۔۔۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ میرے باپ کو میرے نانا نے اغوا کر کے مروا دیا ہے۔ وہ بہت خردماغ، ضدی اور بدمعاش تھا۔ یہ سب باتیں میری ماں نے مجھے بتائی تھیں۔۔۔ اگر میری ماں بیوہ ہو کر ضدی پراڑی رہتی باپ کے گھر نہ لوٹتی تو وہ اسے بھی اٹھوا لیتا مگر سیتا تو اسی ضدی باپ کی بیٹی تھی۔۔۔ وہ میری اور اپنی جان بچا کے نکل آئی اور اس نے باقی زندگی گم نامی میں بسر کر گزاری۔۔۔ مرنے سے پہلے وہ سب کچھ میرے حوالے کر گئی تھی۔۔۔ اپنی شادی کی رجسٹریشن کا سرٹیفکیٹ اور میری پیدائش کا بھی سرٹیفکیٹ بعد میں اس کی موت کا بھی سرٹیفکیٹ بھی مجھے مل گیا۔۔۔ یہ سب دستاویزات میرے پاس محفوظ ہیں۔۔۔ لیکن جو کچھ تم نے بتایا وہ واقعی مجھے معلوم نہ تھا۔''

ونود اس کی صورت دیکھتا اور اس کی آنکھوں کے درمیان میں جھانکتا رہا تھا۔

''تم نے بات مجھے مکمل کرنے نہیں دی تھی۔'' وہ بولا۔ ''انہی کاغذات میں مجھے دو کاغذات ایسے ملے جو بظاہر الگ تھے لیکن غور کرنے پر میں تعلق دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک تو اس شادی کے رجسٹریشن کی سرٹیفکیٹ کی نقل تھی۔۔۔ اور دوسرا تمہاری پیدائش کا سرٹیفکیٹ تھا۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے پیش نظر تمہاری ماں نے یہ نقول ارسال کی تھیں جن کو کسی نے توجہ دیے بغیر فائل میں لگا دیا تھا۔ میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ سیتا شادی سے پہلے نہیں مری تھی اور تم ہی اس کی وارث ہو۔۔۔ مگر باقی کہانی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔۔۔ اب تم نے خود ہی داستان کے نامکمل حصے پورے کر دیے ہیں تو واقعات کی پوری تصویر سامنے ہے۔

پرشاد اس لیے مارا گیا کہ وہ قربانی کا بکرا تھا۔۔۔ باقی سب چاندنگر کے جاگیر کے قانونی وارث تھے۔ یہاں تک کہ وہ لڑکی بھی جو سمندر میں ڈوب گئی۔ ڈبو دی گئی یا پھر اس نے خودکشی کر لی۔ اپنے بطن میں ایک وارث کی پرورش کی مجرم تھی۔۔۔ اگر ان کی شادی ہو جاتی تو شوہر کو بیک وقت دو عورتوں سے شادی کے جرم میں سزا ہو سکتی تھی۔ لیکن ان کی اولاد کے حق وراثت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ آخری وارث تم ہو چنانچہ قاتل کا اگلا نشانہ تم بنو گی۔۔۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے یہ بعد میں معلوم ہو گا۔ اس کی سازش بے نقاب ہو گئی ہے اور اب تم ہی وہ دانہ دوام ہو جس پر اس کی گرفتاری کا انحصار ہے۔۔۔ آئندہ چند روز تم اکیلی رہو گی۔۔۔ اکیلی یوں کہ میں رات کسی وقت تم سے اجازت لوں گا۔ اس طرح کہ وہ چھپ کر دیکھ رہا ہو تو اسے یقین آجائے کہ تم اکیلی رہ گئی ہو۔ میں دس منٹ کے اندر اندر گھوم کر پچھلی طرف سے اندر آجاؤں گا۔ پھر تم آرام سے بے فکر ہو کر سو جانا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔

''لیکن ونود۔۔۔! تمہیں واپس جانا ہے۔'' پدمنی نے تار والا لفافہ پھر اٹھایا۔ ''یہ دیکھو۔''

ونود کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہونے لگی۔۔۔ تار بھیجنے والا محکمہ کا سربراہ تھا۔۔۔ مگر وہ بہت مہذب

اور شائستہ آدمی تھا۔۔۔ونود کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا اور اس نے بے حد اصرار کے ساتھ ونود کو صحت کی بحالی کے لیے رخصت پر بھیجا تھا۔۔۔یہ کہہ کر کے قیامت آجاتی ہے تو آجائے لیکن تم فکر نہ کرنا۔۔۔اور پھر ایسا کون سا سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔یا حکم عدولی کا کوئی سوال نہ تھا مگر یوں زبردستی اسے کوئی بلا نہیں سکتا تھا۔۔۔وہ تار دے سکتا تھا کہ لعنت تمہاری نوکری پر میں اپنا استعفا دیتا ہوں مگر یہ بات کہنے کے لیے بھی تار دینا ضروری تھا۔

اسٹیشن پر واقع تار گھر پہنچنے کا مطلب تھا وہ پدمنی کو کم سے کم پون گھنٹے کے لیے تنہا چھوڑ جائے یا اسے رات کے وقت جنگل میں سے گزار کے ساتھ لے جائے۔ موجودہ حالات میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔اس نے جواب کو صبح پر ملتوی کیا اور اپنا کی پروا کیے بغیر پھر وہیں سو گیا۔

صبح اس نے پدمنی کو ریوالور کا استعمال سکھایا اور سائیلینسر لگا کے جنگل میں فائرنگ کی مشق کراتا رہا۔ پھر میگزین میں گولیاں بھر کے اس نے ریوالور پدمنی کے حوالے کر دیا اور پھر اس سے کہا۔

"ضرورت پڑنے پر نتائج کی پروا کیے بغیر فائر کر دینا۔۔۔تذبذب کی قطعی گنجائش نہیں ہوگی کیوں کہ دشمن بہت چالاک اور عیار بھی ہے۔۔۔اور مسلسل چھ قتل کرنے کے بعد وہ ایک خون آشام درندہ بن چکا ہے جسے کامیابی کے غرور نے ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی بخش دیا ہے۔اپنے دفاع میں قتل کرنا کوئی جرم نہیں۔۔۔بس گولی چلانے سے پہلے یہ دیکھ لینا کہ نشانہ میرا دل تو نہیں ہے۔۔۔"

پدمنی خوف زدہ ہونے کے باوجود مسکرائی۔

"اور تم اب خالی ہاتھ اپنی حفاظت کیسے کرو گے۔۔۔"

"اول تو میرا دشمن کوئی نہیں اور مجھے اپنی نہیں تمہاری حفاظت کرنی ہے۔" ونود نے ہاتھ اٹھایا اور ہتھیلی کو کھڑا کر کے ہوا میں فائر کیا۔"اور خالی ہاتھ ہونے کے باوجود میں اتنا کمزور اور بے بس نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔۔۔یا دشمن سمجھنے کی غلطی کرے گا۔۔۔

اب میں ریلوے اسٹیشن تک جا رہا ہوں۔۔۔حکم عدولی کرنے یعنی تار کا جواب دینے کے لیے۔۔۔سوری۔۔۔پدمنی کی محبت اور اس کی جوانی، حسن اور شباب آنے نہیں دیتی۔" وہ شوخی سے بولا۔

پدمنی سرخ ہو گئی۔حیا نے اسے اور حسین بنا دیا اور چہرے پر ایک دل آویز نکھار آ گیا۔اس کے دل میں آیا کہ اسے ہونٹوں میں جذب کر لے۔۔۔اس نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا۔اس لیے کہ بات بہت آگے بڑھ جاتی۔اس نے دل پر بڑا جبر کیا۔ پدمنی مصنوعی خفگی سے دیکھنے لگی۔پدمنی نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا اور وہ دوڑ کر نکل گیا۔بچوں کی طرح قہقہہ مار کے اس نے دور سے پدمنی کی طرف دیکھا جو اسے ہاتھ ہلا رہی تھی۔آج اسے یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ وہ بہت عرصے بعد دل کھول کر ہنسا ہے۔اس نے ہوائی بوسہ اس کی طرف اچھال دیا۔

خیر۔۔۔اب یہ چکر ختم ہو تو لعنت چاند نگر کی جاگیر پر۔۔۔سب سے بڑی جاگیر عشق کی ہے۔۔۔پدمنی کا عشق جس پر کسی کی اجارہ داری ہے تو میری۔۔۔ریلوے اسٹیشن پہنچنے تک وہ آنے والے دنوں کے تصور میں گم رہا اور خود ہی مسکراتا گیا۔

اسٹیشن پر وہ کیبن بند پڑا تھا جو ٹیلی گراف آفس بھی تھا۔ وہ کچھ دیر احمقوں کی طرح سر کھجاتا رہا کہ۔۔۔اب حکم عدولی کیسے کی جائے۔پھر معاً اس کی نگاہ مخالف سمت اٹھی۔۔۔اس نے ڈیڑھ ٹانگ والے اسٹیشن ماسٹر کو عقبی حصے جنگل جیسے باغ سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ یہاں سب کچھ تھا۔۔۔لائن مین۔۔۔بکنگ کلرک۔۔۔ٹکٹ چیکر۔۔۔اور ٹیلی گراف مشین کا آپریٹر۔۔۔اس نے بے حد معذرت سے ونود کی طرف دیکھا۔

"کب سے کھڑے ہیں آپ۔۔۔مجھے بے حد افسوس ہے کل صبح سے یہاں کوئی نہیں۔۔۔ممکن ہے آپ کے علاوہ لوگ آ کے چلے گئے ہوں۔ اب وہ میری شکایت کریں گے۔مگر میں کیا کروں۔۔۔میں نے کہا تھا کہ دیہانت ہو گیا ہے۔

صرف ایک دن کے لیے اس کی آخری رسومات میں جانا ہے مگر اوپر والے نے کوئی آدمی نہیں بھیجا۔۔۔اس لیے میں تالا ڈال کر چلا گیا۔''

''میں شکایت نہیں کروں گا۔'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس تار کا جواب دینا ہے جو کل آیا تھا۔۔۔''

''کل۔۔۔'' اس نے حیرانی سے لفافہ لے لیا۔ ''میں تو پرسوں شام ہی کو چلا گیا تھا۔۔۔کل شام۔۔۔کیسے آ گیا۔۔۔اور میں ابھی صبح پہنچا ہوں۔''

پھر اس نے غور سے تار کا مضمون پڑھا۔۔۔اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال گہرا ہو گیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس نے [illegible] آفس کا قفل کھولا۔ اندر فرش پر تار کے خالی فارم بکھرے پڑے ہوئے تھے۔۔۔ٹاپ رائٹر کھلا رکھا ہوا تھا۔۔۔میز کی درازیں آدھی اندر تھیں اور آدھی باہر تھیں۔ اس نے کمرے کی تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ پھر ونود کی طرف دیکھا۔

''کوئی یہاں آیا تھا۔ کسی نے شرارت کی ہے۔۔۔ تار دہلی سے ہے۔۔۔کوڈ نمبر کہاں ہے۔۔۔اس میں۔'' وہ بولا۔

''میں سمجھ گیا۔۔۔'' ونود نے تار کا لفافہ واپس لیا۔ ''دیکھو اگر کوئی نقصان نہیں ہوا ہے تو اس میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ ورنہ خواہ مخواہ تفتیش کا شروع ہو جائے گا۔ بات بہت آگے بڑھ جائے گی پریشانی تمہیں ہوگی۔''

''نقصان یہاں کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ ہر چیز اپنی موجود ہے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن میں آپ کے مشورے اور تعاون کا شکر گزار ہوں۔'' ونود کا ذہن اب بھی خیالات کی یلغار کا شکار تھا مگر خیالات کی نوعیت بدل گئی تھی۔۔۔ مسز سادھنا کے گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک وہ اپنا لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان پیک کرنے کے بعد اپنی میزبان کو مطلع کیا کہ وہ رات کی گاڑی سے واپس جا رہا ہے۔ ''گڈ لک مسٹر ونود!'' مسز سادھنا نے کہا۔ 'امید ہے تم پھر آؤ گے۔''

''آپ کے یہاں آنے کے بعد گڑبڑ تو بہت پھیلی مسٹر ونود۔۔۔!'' اینا نے تھوڑا سا افسردہ ہو کر کہا۔ ''آپ بہت اچھے آدمی تھے۔۔۔ ہر بات تو میں نے اس لڑکی یعنی مس پدمنی کو بھی بتا دی پھر بھی سمجھتی ہے کہ تصویریں بنا کر عمر گزاری جا سکتی ہے۔۔۔وہ جا رہی ہے نا۔۔۔؟''

''مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے اس سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔'' ونود نے انجان بن کے کہا۔ ''یہ اس کی اپنی مرضی ہے اور میں اسے مجبور کرنے سے رہا۔۔۔ وہ چوں کہ یہاں پہلے سے تھی۔۔۔ ابھی سے لگی کہ اس کا دل یہاں لگ گیا ہے۔ میرا اس کا کیا سمبندھ ہے جو ساتھ چلے گی۔''

''یہی تو آپ مردوں میں بڑی خرابی ہوتی ہے۔۔۔!'' اینا نے اپنی سابقہ رائے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

باقی باتیں کہنا فضول سمجھا۔ کیوں کہ ونود بہر حال تنہا جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔ پھر پرشاد یاد آیا جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد تھا۔۔۔ ایک راز تھا جو اس کے من کے گوشوں میں دفن تھا۔۔۔ وہ قدرت کے معاملے میں دیوانہ نہیں تھا۔۔۔ وہ کچھ راتیں کیسے بھول سکتی تھی۔ ایک رات جب گیسٹ میں کوئی نہیں تھا۔ مالکن اوپر کے کمرے میں تھی۔ اس رات سخت حبس اور گرمی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح نہا اور بال خشک کر کے فرش پر دری بچھا کے لیٹ گئی۔ آخری ایام کا چاند تھا جو بادلوں کے پیچھے جاتا اور نکل آتا۔ اس نے کپڑے ایک طرف ڈال دیے تھے۔ اسے بڑے زور کی نیند آ رہی تھی۔ پھر اک دم سے بارش شروع ہو گئی۔ مون سون جو تھا۔۔۔ وہ گہری نیند میں غرق تھی کہ اس نے محسوس کیا کہ کسی مرد نے اسے نیند کی حالت میں بے بس کر دیا اور فائدہ اٹھا رہا ہے۔۔۔ وہ ناگ بن کر ڈس رہا ہے۔۔۔ اس پر ایسا

نشہ طاری ہوا کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنے آپ کو اس ناگ کے حوالے کر دیا۔ اسے لگا تھا کہ اس کی زندگی میں سہاگ رات آئی ہے۔ جب بجلی چمکی تو اس نے ناگ کو دیکھا۔ یہ پرشاد تھا اسے اس سے پرشاد دیوانہ نہیں۔۔۔ نفرت انگیز نہیں لگا۔۔۔ اس لیے کہ وہ مرد تھا۔ آج تک کسی مرد نے اسے توجہ بھری نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ پہلا مرد تھا جس کی محبت بھری سرگوشیاں تھیں اس کے کانوں میں امرت گھول رہی تھیں۔۔۔ اس نے کہا تھا کہ ''اینا۔۔۔! تم شہزادی ہو تم گیت ہو۔۔۔'' وہ پو پھٹنے تک رہا تھا۔ پھر ایسی مدہوشی چھا گئی تھی وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ صبح بے دار ہوئی تو اس پر پرانی شراب کا سا نشہ طاری تھا جب وہ تھکن اتارنے اور جوڑ جوڑ دور کرنے کے لیے اور کافی پینے کے لیے کچن میں گئی تو دیکھا کہ پرشاد کچن بھی لوٹ گیا ہے۔ رات کا بچا کھانا۔۔۔ آدھا کلو دودھ۔۔۔ بارہ کیلے اور کافی بھی بنا کے پی کے گیا ہے۔۔۔ اس روز اسے پرشاد کی یہ حرکت ناگوار نہیں لگی تھی۔ بلکہ وہ اس کی خاطر مدارت بھی کرتی تھی۔ چائے کافی بنا کر پلاتی انڈے بھی ابالتی یہ محبت تھی جس نے ملن کا سلسلہ ایسا دراز کیا کہ دراز ہوتا گیا۔ اپنا بھی کیا کرتی محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہو جاتی ہے لیکن پرشاد کا اس پر اور کچن پر ضرورت سے زیادہ ہاتھ صاف کرنا زہر لگا تھا۔ اس لیے ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ کیوں کہ مالکن نے پوچھا تھا کہ یہ کون اتنا سارا کھانا اور تمام پھل ہڑپ کر لیتا ہے۔۔۔ کھا جاتا ہے۔۔۔ پھر اس نے مالکن سے کہا تھا کہ اسے پرشاد پر شک ہے۔ وہ شاید راتوں رات چوری چھپے آتا ہے اور کچن صاف کر جاتا ہے۔۔۔ اس نے پہلے تو پرشاد کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ باز نہیں آیا۔ اس لیے کہ اسے ایسا کھانا اور پھل کہاں اور کیسے نصیب ہوتے۔۔۔ وہ دن بھر کا بھوکا ہوتا۔۔۔ ہوٹلوں کا کھانا کبھی بچتا نہ بچتا۔۔۔ وہ چوری کرتا تو اس سے شکم میری نہیں ہوتی تھی۔۔۔ وہ مالکن کو کیسے بتاتی کہ وہ پرشاد سے محبت کرنے لگی ہے اور پرشاد حد سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو وہ اسے جھاڑو اور ڈنڈے سے مارنے لگی۔ گھر کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔ سہاگ راتوں کا یہ جذباتی سلسلہ بند ہو گیا۔ جب پرشاد دو ایک مرتبہ خوب پٹا اور اس کی بری طرح گت بنی اس نے آمد و رفت بند کر دی۔۔۔ لیکن اینا ایک عورت پرشاد کی محبت اور قرب چاہتی تھی لیکن ان کے درمیان نفرت اور غصے کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ کیوں کہ پرشاد کچن سے زیادہ دل چسپی لیتا تھا۔ کیوں اب اسے اینا میں کوئی کشش نظر نہیں آتی۔۔۔ وہ دستر خوان سے خوب سیر ہو چکا تھا۔ لیکن اینا کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور اس نے پرشاد کو بہت سمجھایا کہ وہ کچن سے چوری کر کے کھانا اور پھل نہ لے جایا کرے۔ لیکن پرشاد کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔

ونود دوپہر کے بعد کافی ہاؤس اور بار میں بیٹھا مالک سے باتیں کرتا رہا تھا۔۔۔ بار کا مالک مقامی ریڈیو اسٹیشن کی طرح تھا۔۔۔ ونود جانتا تھا کہ جو بات یہاں کہی جائے گی بہت جلد گاؤں میں سب کو معلوم ہو جائے گی۔

''تو مسٹر ونود۔۔۔! یہ جو چھ آدمی قتل ہو چکے ہیں۔۔۔ بلاوجہ ہی مارے گئے۔۔۔ نو سر۔۔۔! میرا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔۔۔ کہ یہ پولیس کی نااہلی ہے۔۔۔ کرشن اب بوڑھا ہو گیا ہے۔۔۔ ہمیں کسی جوان آدمی کی ضرورت ہے۔۔۔ سریندر کیسا رہے گا۔'' وہ بولا۔

''وہ نوجوان ہے۔۔۔ باپ کے تجربے سے فائدہ اٹھائے گا تو یقیناً بہتر رہے گا۔'' ونود نے کہا۔

''شاید وہ قاتل کا سراغ لگا لے۔۔۔ ویسے مجھے ذاتی طور پر امید نہیں۔۔۔ قاتل نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔۔۔ اور اب پرشاد کے مرنے کے بعد کوئی نئی واردات بھی نہیں ہوئی ہے۔''

''کیا اس کا مطلب ہے قاتل وہی تھا۔۔۔'' مالک نے برادرانہ تجسس کے ساتھ پوچھا۔ ''آپ کی

ے تو پہلے مختلف تھی۔''

''ہاں۔۔۔ مگر ہر آدمی بعض اوقات غلط رائے قائم کرسکتا ہے۔'' ونود نے اعتراف کیا۔ ''خود مسٹر کرشن بھی قائل ہو گئے تھے۔ مگر۔۔۔ خیر ایشور کرے سلسلہ ختم ہو جائے۔۔۔ پرشاد بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ اگر یہ سب اس نے کیا تھا اسے اس کی سزا بھی مل گئی۔ جو جیسا کرتا ہے بھرتا بھی ہے اچھا اجازت دیں گڈ بائی۔''

''گڈ بائی۔۔۔ مسٹر ونود۔۔۔!'' بار کے مالک نے کہا۔ ''اگرچہ بعض لوگ آپ سے خوش نہیں ہیں مگر میں ان میں شامل نہیں ہوں۔۔۔ میں دوبارہ ملاقات کا انتظار کروں گا۔۔۔ ایک آخری کپ کافی یا جام۔۔۔ میری طرف سے۔'' بار کے مالک نے دو جام تیار کیے اور بھرے گلاس ٹکرائے اور خالی کر دیے۔

ونود بار سے نکلا اور کرشن کے آفس جا پہنچا جہاں سریندر بھی موجود تھا۔۔۔ اس نے کچھ کہے بغیر کار سامنے رکھ دیا۔

''تو گویا آپ جا رہے ہیں۔'' کرشن نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''کب روانگی ہے؟''

''آج رات ہی۔۔۔'' ونود نے قطعی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ڈیوٹی از ڈیوٹی۔۔۔ مجھے افسوس ہے میری موجودگی میں حالات انتہائی ناخوش گوار ہے۔۔۔ اور میں آپ کی کوئی مدد نہ کرسکا۔۔۔ لیکن اکیلے نہیں ہیں۔۔۔ سریندر آپ کے ساتھ ہے۔۔۔ جوان آدمی زیادہ پرعزم ہوتا ہے اور اس کی جوانی آپ کا تجربہ کرے گا تو یقیناً کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔۔۔ اور آپ اس کیس میں بھی قاتل کا سراغ لگا لو گے۔۔۔'' اس تعریف پر سریندر کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ونود نے باری باری دونوں سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور واپس چل پڑا۔ سورج غروب ہونے کے بعد اپنا اور مسز سادھنا اور اپنا نے الوداع کہا۔ متعدد دیگر افراد نے اسے اپنا سوٹ کیس اٹھائے اسٹیشن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ جن میں سریندر اور کافی ہاؤس کا مالک بھی شامل تھا۔۔۔ سریندر اس بار ہی میں بیٹھا تھا اور ان دونوں نے بیک وقت ہاتھ ہلایا۔۔۔ ریلوے اسٹیشن پر ڈیڑھ ٹانگ کی انتظامیہ کے سربراہ نے بھی اسے بڑی عقیدت سے ٹکٹ پیش کیا اور کچھ معذرت کے ساتھ قیمت وصول کی کہ یہ تو بہرحال سرکار کی جیب میں جائے گی ورنہ کوئی بات نہ تھی۔۔۔ جب گاڑی آئی تو تب بھی وہ موجود تھا۔۔۔ اس کے علاوہ کوئی چھپ کر دیکھ رہا تھا تو اس نے بھی وجود کو گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا۔ اس کی ایک مجرم کی سی نگرانی ہو رہی تھی۔

تاہم ٹرین کے چلنے سے پہلے اسے دوسری طرف سے اترتے ہوئے صرف ایک ڈبے کے مسافروں نے دیکھا۔۔۔ مگر ونود نے ان کی کوئی پروا نہیں کی کہ انہوں نے کیا سوچا سمجھا ہوگا۔۔۔ گاڑی کا پردہ درمیان میں تھا اور وہ اس کی اوٹ میں نکل جانا چاہتا تھا۔۔۔ ٹرین کے گم ہونے تک ونود بھی جنگل میں گم ہو چکا تھا اور قطعی غیر مصروف راستے سے پدمنی کے گھر کی سمت دوڑ رہا تھا۔۔۔ جھاڑیوں سے الجھتا اور درختوں سے بچ کے نکلتا وہ اندازے کے مطابق بھاگتا گیا۔ جب اسے پدمنی کا گھر نظر آیا تو اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔۔۔ جعلی تار بنا کے ونود کو رخصت کرنے کا انتظام کرنے والا یقیناً مطمئن ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔۔۔ اب ایک کم زور عورت کیا کرے گی جو ویرانے میں تنہا رہتی ہو اور برش چلانے کے سوا کچھ نہ جانتی ہو۔۔۔ نہ خنجر، نہ پستول، نہ بندوق وہ اطمینان سے اپنا کام کرے گا۔۔۔ ابھی تو پدمنی جاگ رہی ہوگی۔۔۔ بھرا ہوا ریوالور اس کے پاس ہے۔ خطرہ اگر ہوگا تو اس کے سو جانے کے بعد۔

پدمنی کے خواب گاہ کی کھڑکی بند تھی لیکن شیشوں سے مدھم سا اجالا جھانک رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پردہ ڈالے بیٹھی ہے۔۔۔ ونود نے سوٹ کیس نیچے رکھا اور اپنا کوٹ اتار کے سوٹ کیس پر ڈال

دیا۔۔۔ پھر اس نے ٹائی کھولی اور پتلون کے پائنچے جرابوں میں اڑس لیے۔ سگریٹ کی طلب شدید تھی مگر اندھیرے میں ایک ننھا سا شعلہ بھی اس کی موجودگی کا راز فاش کر دیتا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔

وہ گھوم پھر کے ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں سے وہ بیک وقت خواب گاہ کی کھڑکی پر اور گھر کے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ ایک بار پدمنی نے پردہ ہٹا کے کھڑکی کھولی اور باہر جھانکا۔۔۔ پھر روشنی گل ہو گئی۔۔۔ ونود نے گھڑی کے روشن ڈائل میں وقت دیکھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ پدمنی پریشان تو ہو گی کہ ونود بتائے بغیر کہاں غائب ہو گیا اور شاید اب تک انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو گی۔۔۔ اس کے آستانہ حسن پر حاضری نہ دینا خلاف معمول بات تھی۔۔۔ چناں چہ صبح وہ مسز سادھنا سے معلوم کرنے ضرور جائے گی۔۔۔ ونود کے لیے تھوڑی سی پریشانی کی بات تھی۔۔۔ اگر اس کا منصوبہ ناکام رہا اور قاتل آج رات ہی اس کے پھیلائے جال میں گرفتار ہونے نہ آیا تو وہ اگلا دن کہاں چھپ کر گزارے گا۔۔۔؟ وہ آج کی رات ہر قیمت پر ضرور آئے گا۔۔۔ پرشاد کی موت کے بعد اس نے ایک ہفتہ موقع ملنے کے انتظار میں گزارا۔۔۔ اور جب اس کے لیے مزید انتظار مشکل ہو گیا تو اس نے جعلی تار بھیج کر ونود کا پتا کاٹ دیا۔۔۔ وہ بے حد محتاط تھا۔۔۔ اور آخری مرحلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا لیکن تار دینے کی حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔۔۔ یا پھر وقت اس کے لیے اہم تھا۔۔۔ وہ ونود کی چھٹی ختم ہونے تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا ایک مقررہ وقت میں کرنا تھا۔۔۔ یہ بات وہ خود ہی بتا سکتا تھا کہ وقت کی معیاد کتنی تھی اور اس کا خونی مشن کون سے مقاصد کے لیے تھا۔ ونود نے مکمل خاموشی میں اچانک ابھرنے والی آوازسنی۔۔۔ جنگل کے کونے کونے میں جھینگر رونے لگے تھے۔ ونود تو ہم پرست آدمی کبھی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جھینگر روتے نہیں گاتے ہیں اور یہ آواز اپنی بے حد طویل مونچھوں پر ٹانگوں کی رگڑ سے پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ وائلن کی ایجاد جھینگر ہی سے منسوب ہے مگر ان حقائق سے آگاہی کے باوجود اسے اینا کی بات یاد آئی۔۔۔ کوئی دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔۔۔ یہ بات مضحکہ خیز ضرور تھی مگر اینا کا عقیدہ مسٹر فیشن کی موت کے بعد یقیناً زیادہ راسخ ہوا ہو گا۔۔۔ کیا آج کی بھی کوئی روح عالم فانی سے کوچ کرے گی۔۔۔ کس کی روح۔۔۔ وہ ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن پیدا ہونے والے احمقانہ خیال پر لعنت بھیجی۔۔۔ پھٹکارا۔۔۔ پھر وہ ایستادہ کھڑا ہو گیا۔۔۔ جنگل کے سکوت اچانک محال ہو گیا۔ سارے جھینگروں نے بیک وقت چپ سادھ لی۔۔۔ ونود چوکنا ہو گیا۔۔۔ جھینگر ایک حقیر سا کیڑا ہے جسے فراغت اور فرصت میسر آئے تو اپنا وائلن بجانے کا شوق پورا کرتا ہے اور معلوم نہیں یہ ان کی بولی ہے جسے وہ خود سمجھتے ہیں یا محض ایک آواز جس کی فریکوئنسی بہت زیادہ ہوتی ہے۔۔۔ لیکن ان کی خاموشی بہر حال ایک ایک بات کی خبر دیتی تھی۔۔۔ کوئی ان کی خلوت میں خلل ڈالنے آ گیا ہے۔۔۔ کوئی حیوان جس کی موجودگی انہیں خوف زدہ کر سکتی ہے۔۔۔ جنگل کا حیوان ناطق۔۔۔ ونود کا پورا وجود ہوشیار ہو گیا۔

وہ دم سادھے گوش بر آواز کھڑا رہا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ دور سے آنے والی ایک آواز بھی اسے بہت ہی قریب لگی۔۔۔ کوئی خشک ٹہنی چٹخی تھی۔ غالباً پیروں کے نیچے آ کر۔۔۔ پھر خشک پتے چرچرائے۔۔۔ صرف ایک بار۔

ونود اس سمت اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک مبہم سا گہرا سایہ متحرک سایہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا ہے۔۔۔ چند سیکنڈ بعد جب وہ سایہ درختوں کے تنے کی طرح ساکت ہو گیا تو ونود نے اپنی آنکھیں

ہیں۔۔۔کیا فریب نظر تھا۔۔۔مگر سایہ پھر متحرک ہوا اور پلک جھپکتے میں دیوار پر سے گھر کے اندر اتر گیا۔

پھر ونود نے اپنے دل میں اس کی مہارت کا اعتراف کیا اور آگے بڑھا۔۔۔دوڑنے سے اس کا راز فاش ہوسکتا اور ونود قاتل کو خبردار ہونے کا یا فرار ہونے کا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔۔۔اس نے بیس قدم کا فاصلہ پوری احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے طے کیا۔۔۔تین منٹ کے بعد وہ بھی اندر کود گیا۔ گھر کے اندر پرانے کلاک نے دو بجے کا اعلان کیا تو وہ حیران رہ گیا۔۔۔گویا وہ تین گھنٹے سے زیادہ انتظار کرتا رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے کا دروازہ کھلا دکھائی دیا۔۔۔وہ چیتے کی طرح چلتا گیا جو اپنے شکار کو تعاقب کی خبر نہیں دیتا۔۔۔اور اچانک جا پڑتا کہ شکار کو دم لینے کی مہلت نہیں ملتی۔۔۔گھپ اندھیرے کے باوجود اس نے ہال میں کسی چیز سے ٹھوکر نہیں کھائی۔ سابقہ تجربے کی آنکھ سے وہ ہر چیز کو وہیں دیکھ رہا تھا جہاں وہ تھی۔۔۔پھر زینہ آ گیا جس کے تختے پرانے اور ڈھیلے ہوچکے تھے۔

ونود کے کانوں میں ایک مانوس آواز آئی۔۔۔یہ کھٹکا جو پدمنی کے بیڈروم کا دروازہ کھولنے سے ہوتا تھا۔ وہ احتیاط کو بھول کر دو دو تین تین زینے ایک وقت میں طے کرتا اوپر کی طرف بھاگا۔۔۔بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ونود کی آنکھیں اب اندھیرے میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ پدمنی پر جھکا ہوا تھا۔ پدمنی اپنے جسم کو پٹخ رہی تھی مگر اس کی گرفت سے نجات کی جدوجہد بے سود ثابت ہورہی تھی۔۔۔وہ قد آور صحت مند مرد تھا جس کی طاقت کا مقابلہ کرنا پدمنی جیسی نازک لڑکی کے لیے ناممکن تھا۔ اس کے حلق سے غرغراہٹ بلند ہورہی تھی۔ وہ ونود کی آہٹ سن کر چوکنا ہوگیا تھا۔۔۔اس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے پلٹا۔

”تم۔۔۔تم۔۔۔اب بچ کے نہیں جا سکتے۔۔۔خبیث!“ ونود نے چیخ کر کہا۔

پھر وہ اپنے دشمن پر جا پڑا۔۔۔وہ دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔۔۔پہلے ہی راؤنڈ میں ونود کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کسی بھی طرح کمزور نہیں۔۔۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ونود کی کمر کے گرد آہنی حلقے کی طرح لپیٹ لیا تھا اور ونود کا سانس رکنے لگا تھا۔۔۔اندھیرے میں وہ دونوں دوبارہ اوپر سے نیچے ہوئے اور ایک شوکیس الٹ کر چور چور ہو گیا۔۔۔پھر ایک ٹیبل لیمپ گرا۔ ونود کی لات لگنے سے ایک کرسی دیوار پر جا لگی۔ ان کے درمیان زور آزمائی اور مقابلہ جاری رہا۔

”پدمنی۔۔۔! پدمنی۔۔۔!“ ونود نے چلا کر کہا۔ ”لائٹ۔۔۔جلدی سے لائٹ آن کردو۔“

مگر اسے پدمنی سے کوئی جواب نہیں ملا۔۔۔وہ جواب کیا دیتی۔۔۔وہ بے حس وحرکت خاموش پڑی رہی۔۔۔ونود کا سینہ کٹ گیا۔ اس کا دل فریاد کرنے لگا۔۔۔اپنا لہو آپ پینے لگا۔۔۔کیا وہ مرچکی ہے! وہ تمہارے ریوالور سے۔۔۔تمہاری سراغ رسانی کے تجربے اور تمہاری خود اعتمادی کے باوجود مرچکی ہے۔۔۔کوئی بھی اس کی حفاظت نہیں کرسکا۔۔۔

ونود کا خون رگوں میں ابلنے لگا۔۔۔اس نے اپنی کہنی قاتل کے سینے پر ماری۔ وہ اس چوٹ کی تاب نہ لا کر کراہا اور ذرا سی دیر کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ونود سمجھ گیا کہ وہ کیوں خاموش ہے۔۔۔! وہ اپنی آواز شناخت کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا مگر اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔اندھیرے میں بھی اس کی صورت کے نقوش واضح ہوگئے تھے۔ اس نے موقع پاتے ہی خود کو الگ کیا اور اپنا ایک ہاتھ اٹھایا مگر قاتل تڑپ کر نکل گیا۔

ونود نے اندازہ کرلیا تھا کہ اس کی ضرب مہلک ثابت ہوئی ہے۔ اس نے اٹھتے ہی ونود پر حملہ کیا مگر ونود نے اسے اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ پھر وہ سوئچ بورڈ کی طرف لپکا۔ بٹن دبانے کے بعد بھی اندھیرا باقی رہا۔۔۔قاتل نے نیچے سے مین سوئچ آف کردیا

تھا۔۔۔ یہ مہلت مختصر تھی جو ونود نے جلانے کی ناکام کوشش میں ضایع کر دی تھی۔۔۔ وہ روشنی میں دوسرا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔۔ ایک یہ کہ قاتل بے نقاب ہو جانے کے بعد ذہنی طور پر یہ سمجھ لے کہ اب اس کے لیے بچ نکلنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں اور اب یہ زندگی اور موت کی بازی ہے جس میں صرف جیتنے والا زندہ رہ سکتا ہے۔۔۔ دوسرے وہ روشنی میں اپنے خالی ہاتھوں کو جوڈو کے داؤ آزمانے کے لیے بہتر اور موثر طور پر استعمال کر سکتا تھا۔۔۔ حوصلہ افزا بات یہ ہوئی کہ ونود نے پدمنی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز سنی اور اس کا حوصلہ دو چند ہو گیا۔ اسے لگا کہ زندگی پدمنی کو نہیں بلکہ اسے ملی ہے۔۔۔ اس کی روح کی شانتی جس نے اسے ایک نیا انسان بنا دیا تھا۔

اس وقت قاتل نے جو دیوار سے ٹکرا کے وقتی طور پر مفلوج ہو گیا تھا۔ جنگلی بھینسے کی طرح اس پر حملہ کیا۔۔۔ ونود مقابلے کے لیے تیار ہوا ہی تھا مگر تیزی سے اس کی طرف آنے والا یک لخت رخ بدل کے دروازے کی طرف دوڑا اور بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔ ونود بھونچکا رہ گیا۔ پھر وہ کوندا بن کر پدمنی کے بستر کی طرف لپکا۔ اسے امید تھی کہ پدمنی نے اس کی ہدایت کے مطابق ریوالور تکیے کے نیچے رکھا ہوگا۔

''پدمنی۔۔۔! پدمنی۔۔۔! میں ابھی آتا ہوں۔۔۔ تم پریشان اور خوف زدہ نہ ہو۔''

اس نے ریوالور ہاتھ میں آتے ہی کہا اور سرعت سے باہر بھاگا۔ پدمنی نے جواب نہیں دیا تھا مگر وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ بالکل خیریت سے ہے۔۔۔ قاتل لکڑی کے تختوں پر دھم دھم اترتا جا رہا تھا اور ونود نے کمرے سے باہر آتے ہی دیکھا کہ وہ نیچے پہنچ چکا ہے۔۔۔ اس نے بالکونی سے نشانہ لے کر فائر کیا۔۔۔ کلک۔۔۔ ہلکی سی آواز آئی۔ کلک۔۔۔ کلک۔۔۔ ریوالور خالی تھا۔۔۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر ریوالور کو گھما کر پھینکا۔ مگر ریوالور دروازے سے ٹکرایا اور فرش پر گر گیا۔۔۔ وہ زینے کی طرف دوڑا۔۔۔ قاتل اب دروازہ کھول کر جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ونود نے اندر آنے کے بعد بند کر دیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔'' ونود نے چلا کر کہا۔ ''مگر تم اب بچ کر نہیں جا سکتے۔''

مگر قاتل جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔۔۔ ونود کے زینہ طے کرنے اور دروازے سے باہر آنے تک وہ پچاس قدم دور جا چکا تھا۔ ونود اس کے پیچھے لپکا۔۔۔ قاتل بلا کا تیز رفتار تھا۔۔۔ ونود نے محسوس کیا کہ وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔۔۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ جنگل کے گھنے درختوں کے اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔ ''خیر۔'' ونود نے ہانپتے ہوئے سوچا۔ یہ وقتی ناکامی ہے۔۔۔ اب وہ بچ کر عدم آباد ہی جا سکتا تھا۔۔۔ دنیا میں اس کے لیے کہیں پناہ نہیں تھی۔۔۔ پھر وہ واپس دوڑنے لگا۔ اب اسے پدمنی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔۔۔ کہیں چالاک قاتل دوسری جانب سے گھوم کر پھر گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔ دشمن پر بھروسا کرنا پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ ریوالور کا خالی ملنا بڑی غیر متوقع اور حیرت انگیز بات تھی۔ پدمنی یہ بے وقوفی نہیں کر سکتی تھی کہ خالی ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر اطمینان سے سو جائے۔۔۔ اسے ریوالور خالی کرنا بھی آتا کہاں ہے۔۔۔ یہ حرکت قاتل کی ہو سکتی ہے جس نے جعلی تار دینے کے بعد دن میں کسی وقت ریوالور خالی کر دیا ہوگا کہ وہ رات کو آئے تو خطرے کی کوئی بات نہ ہو۔۔۔ شاید اس وقت پدمنی گھر میں نہیں ہوگی اور قاتل کو حسب توقع ریوالور تکیے کے نیچے مل گیا ہو گا۔۔۔ قاتل کو یہ بات بھی معلوم نہیں ہوگی ریوالور ونود کا ہے ورنہ وہ اس سے پدمنی کا کام تمام کر دیتا۔۔۔ الزام تو شاید ونود پر نہ ہوتا مگر پدمنی مر جاتی تو زندگی بھر اسے اپنی حماقت کا خیال پریشان کرتا اور اس کے لیے جینا محال اور اذیت ناک ہو جاتا۔۔۔ اس نے پدمنی کو اپنی حفاظت کے لیے ریوالور دیا تھا

مگر پدمنی اس ریوالور کی حفاظت نہ کر سکی کیوں کہ وہ مصور تھی۔ کوئی پیشہ ور قاتل، سراغ رساں یا پولیس مین نہیں جو سب کچھ بھول سکتا مگر ریوالور نہیں بھول سکتا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے پدمنی کو زینے سے اترتے دیکھا۔۔۔ اس کے ہاتھ میں شمع دان تھا جس پر ایک موم بتی نصب تھی۔۔۔ ایک لمحے کے لیے ونود اس تصویر سین سے مبہوت ہو کر رہ گیا۔۔۔ موم بتی کا ننھا سا شعلہ اس کے رخ روشن کو منور کر رہا تھا۔۔۔ اجالے کے اس حصار میں وہ کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی جس نے بادلوں کا لباس پہن رکھا ہو۔۔۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لیے ہوئے تھی۔۔۔ ونود تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے پدمنی کو سنبھال لیا۔ پدمنی کا پرشباب گداز جسم اس کے بازوؤں کے حلقے میں لرزنے لگا

''تم۔۔۔ تم۔۔۔ تم کہاں تھے۔'' وہ بڑی مشکل سے بولی۔ ''طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے مجھے ڈسنے لگے تھے۔''

''میں جان بوجھ کر نہیں آیا تھا۔'' ونود نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں دراصل قاتل کو موقع دینا چاہتا تھا کہ تمہیں تنہا سمجھ کر آئے اور میں باہر موجود تھا تمہاری حفاظت اور نگرانی کے لیے۔۔۔ میں نے اسے آتے دیکھ لیا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ بچ کر نکل گیا۔''

''چلو جانے دو۔۔۔'' پدمنی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہی کیا کم ہے ہم دونوں زندہ ہیں۔۔۔ بس اب یہاں سے نکل چلو۔۔۔ دہلی۔۔۔ اور اگر اس کے وہاں بھی پہنچنے کا خطرہ ہے تو بنگلور۔۔۔ مدراس۔۔۔ کولکتا۔۔۔ اندرون ملک۔۔۔''

وہ ونود کے سہارے اوپر چلنے لگی۔

''ہم بہت جلد چلے جائیں گے جان من۔۔۔!'' ونود نے کہا۔ ''اب ڈرنے اور خوف زدہ اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ کیوں کہ اب وہ میری گرفت میں ہے۔۔۔ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ میں اسے قانون کے حوالے کر دوں گا۔۔۔ اب اسے کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ پھر تم جہاں کہو گی ہم چلے جائیں گے۔۔۔ جہاں بھی جائیں گے سکون اور اطمینان سے زندگی گزاریں گے

نیچے کلاک نے تین گھنٹے بجائے۔۔۔ اس نے پدمنی کے بال اور لباس کو درست کیا۔۔۔ قاتل نے اس کے ساتھ دست درازی بھی کی تھی اور پدمنی نے قاتل کی خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا تھا۔ ونود نے پھر اسے بستر پر لٹا دیا۔ تلاش کر کے اس کے لیے سکون اور گولیاں کھلا دیں۔۔۔ اور اس کے بستر کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس کے سو جانے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ جلد ہی گہری نیند سو گئی۔ لیکن ونود ہاتھ میں بھرا ریوالور لیے جاگتا رہا۔ دشمن کا کیا بھروسا تھا۔ اس لیے بھی وہ اسے پہچان چکا تھا۔ قاتل اس بات کی کوشش کرے گا اسی اور پدمنی کو موت کی نیند سلا دے۔ شناخت اور قانون کی گرفت سے بچنے کی یہی صورت تھی۔ ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے گا۔ پدمنی سو رہی تھی۔ پلکوں کے دریچے آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ جانے کن خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر معصومیت کی دل آویزی تھی۔۔۔ وہ اس لیے جاگ نہیں رہا تھا کہ پدمنی کا حسن و شباب جاگ رہا تھا بلکہ قاتل شب خون نہ مار دے۔ اسے ہر قیمت پر پدمنی کی زندگی عزیز تھی۔ اپنی سلامتی سے کہیں زیادہ۔۔۔ اس نے رات آنکھوں پر کاٹ دی۔ لیکن بڑے سکون اور اطمینان اور غور سے اور قریب سے پدمنی کو دیکھتا رہا۔

افق پر صبح کاذب کا دھندلکا پھیلنے لگا۔۔۔ جب ونود نے کرشن کے دروازے پر دستک دی تو وہ چند لمحوں کے بعد آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے ایک بھی جماہی لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اتنی صبح اور کوئی نہیں آ سکتا۔۔۔'' وہ بولا ''اور آپ کے آنے کے بعد

خیریت کا سوال غیر ضروری لگتا ہے۔''

''میں آپ کو آخری بار پریشان اور سویرے سویرے زحمت دینے آیا ہوں۔'' ونود نے متانت سے کہا۔ ''سریندر کہاں ہے؟''

''سریندر۔۔۔'' کرشن چونکا۔ ''معلوم نہیں۔۔۔ عجیب اتفاق ہے کہ مجھے اس کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش آ گئی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ موجود نہیں۔۔۔ آدھی رات کے وقت وہ عموماً کہیں نہیں جاتا۔۔۔ ابھی آتے ہوئے میں نے پھر جھانک کر دیکھا تھا۔۔۔ وہ غائب ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔''

[illegible] نے سوچا یہ شاید اس کا وہم ہو۔۔۔

''آپ کا خیال درست ہے۔۔۔ وہ یقیناً کسی چکر میں پڑ گیا ہے۔'' ونود نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ اس وقت میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔''

''انکار میں کیسے کر سکتا ہوں۔۔۔؟ میری یہ جرات۔'' کرشن نے طنز سے کہا۔ ''لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ آخر ہوا کیا ہے؟''

''مس پدمنی پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔'' ونود بتانے لگا۔ ''لیکن یہ پہلا اتفاق ہے کہ قاتل ناکام رہا۔۔۔ وہ اب جنگل میں روپوش ہے۔''

''آل رائٹ۔۔۔'' کرشن نے خوش دلی سے کہا۔ ''میں دو منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔'' وہ اندر غائب ہو گیا اور وہ واقعی دو منٹ میں لوٹ آیا۔

''کسی نے مس پدمنی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔'' ونود نے کرشن کے ساتھ کار میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''میری بروقت مداخلت سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔۔۔ آپ نے اس کا چہرہ تو دیکھ لیا ہوگا۔۔۔''

کرشن نے حیرانی سے ونود کو دیکھا جو جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں بول رہا تھا اور کرشن کی طرف دیکھنے کے بجائے سیدھا اپنے سامنے پھیلتے ہوئے سرمئی اجالے کو دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔ میں نے اسے بہت قریب سے بہت اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔'' ونود اسی بے حس لہجے میں بولا۔ ''اور مقابلے کے دوران چند چیزیں بھی میرے ہاتھ آ گئیں۔۔۔ جیکٹ کا ایک بٹن۔۔۔ ایک قلم۔۔۔ پرس شاید گر گیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا اور وہ فرار وقت بدحواسی کی کیفیت میں چھوڑ گیا تھا۔

''پھر یہ تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ تم اسے پہچان لو گے نا۔۔۔'' کرشن نے بڑے جوش سے کہا۔

''ہاں۔۔۔ پہچان تو آپ بھی لیں گے۔'' ونود نے پہلی بار کرشن کو دیکھا۔ ''مسئلہ پہچان لینے کے بعد پیدا ہوگا۔ اسے گرفتار کرنے کا۔''

''کیوں۔۔۔ اگر وہ مجرم ہے تو اسے گرفتار کرنا میرا فرض ہے۔۔۔ اس میں مسئلہ کیا۔۔۔؟''

''بعض اوقات فرض کی ادائیگی کی راہ میں ایک نہیں بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔'' ونود نے کہا۔ ''مسائل یا مجبوریاں۔۔۔ جو چاہے کہہ لو۔۔۔ مصلحت کے تقاضے۔۔۔ جذباتی رشتے۔''

''آپ نے غلط کہا مسٹر ونود۔۔۔!'' کرشن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''پولیس مین صرف پولیس مین ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔۔۔ وہ دہلی جیسے بڑے شہر کا ہو یا چاند نگر جیسے چھوٹے سے گاؤں کا۔۔۔ فرض شناسی کی آزمائش کے مرحلے بھی کبھی نہ کبھی پولیس مین کی زندگی میں آتے ہی ہیں۔۔۔ پولیس مین بننے سے پہلے بھی میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا کبھی میرے لیے ایسا ہی مرحلہ پیدا ہوا تو میں اس سے کامران گزاروں گا۔۔۔ مجھ سے بہت پہلے بہت سے لوگوں نے اپنی اور اپنے پیاروں کی اور خون کے رشتوں کی قربانی دینے کی ان گنت روایات قائم کی ہیں۔۔۔ کیا میں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کا اہل ہوں۔۔۔ اور جواب تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھ میں یہ ہمت ہے۔۔۔ اگر جواب نفی میں آتا تو میں اس پیشے سے دستبردار ہو جاتا جس میں اپنی ذات کچھ نہیں۔۔۔ جو کچھ ہے۔۔۔ وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کا تحفظ ہے۔۔۔ ہر پیشہ بڑا تقدس آمیز ہے۔۔۔ قانون کا بول بالا کرنے والا۔''

''مجھے آپ کی باتوں سے ریاکاری کی بو نہیں ...'' ونود نے کہا۔ ''آپ کا لہجہ آپ کی نیت کی صداقت کا آئینہ دار ہے مسٹر کرشن! مگر اس کے باوجود مجھے احساس ہے کہ آپ ایک جوان اکلوتے بیٹے کے باپ ہیں۔۔۔ اور یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ آپ جیسے باپ کا بیٹا قاتل ہے۔''

غیر ارادی طور پر کرشن کا پاؤں ایکسیلیٹر سے ہٹ گیا۔ کار نے ایک جھٹکا لیا اور انجن بند ہو گیا۔ مقدمہ کرشن کے ذہن پر گرنے والی بجلی کا تھا جس نے اسے مفلوج کر دیا تھا اور اس کے جسم کی ساری طاقت سلب کر لی تھی۔

''آپ جانتے ہیں کہ میں کوئی بات اس وقت تک نہیں کہتا جب تک میں خود قائل نہ ہو جاؤں اور مجھے یہ یقین نہ ہو کہ میں دوسروں کو بھی قائل کر سکوں گا۔'' ونود نے کہا۔ ''اور یہ تو اتنی بڑی بات ہے کہ آسانی سے کہیں بھی نہیں جا سکتی۔۔۔''

مکمل خاموشی میں وقت کا ایک ایک لمحہ کرشن کو چیلنج کرتا ہوا گزرنے لگا۔۔۔ آپ کو اپنا عہد یاد ہے۔۔۔ آپ کو اپنے وہ الفاظ یاد ہیں جو آپ نے ابھی چند منٹ پہلے بڑے غرور کے ساتھ کہے تھے۔۔۔ آپ کو وہ الفاظ بھی پندرہ برس قبل اپنی بیوی جیون سے کہے تھے اس وقت جب وہ مر رہی تھی۔۔۔ میں سریندر کو ماں بن کر پالوں گا۔۔۔ اس کے سوا میرا ہے بھی کون۔۔۔ اب اس عہد کا کیا ہوا گا۔ سریندر اب آپ کا بیٹا نہیں رہا نہ آپ اس کی ماں ہو اور نہ اس کے باپ ہیں۔۔۔ آپ صرف پولیس مین اور وہ صرف ایک قاتل ہے۔۔۔ شاید وہ قتل جس کے دامن پر چھ بے گناہوں کا لہو ہے۔۔۔ فرض شناسی کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے مسٹر کرشن!''

''اگر قاتل واقعی سریندر ہو گا تو آپ دیکھ لیں گے اسے گرفتار کرتے ہوئے میرے ہاتھوں میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئے گی۔'' کرشن نے پھر کار اسٹارٹ کرتے ہوئے سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

''آپ کے لیے بیٹے کو گرفتار کرنا آسان تو ہے اس سے حقیقت کا اعتراف کرانا بھی آسان ہو گا۔'' ونود نے کہا۔ ''لیکن پہلے تو اسے تلاش کرنے کا مرحلہ ہے۔۔۔ میں نے اسے جنگل میں گم ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بعد میں جنگل سے نکل کر کہیں فرار ہو گیا ہو۔''

کرشن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ سے زیادہ میں اسے سمجھتا ہوں۔'' اس نے کار کو سڑک کے ایک طرف روک لیا۔

''یہ بات ہے تو آپ مجھے ایک بات سمجھائیں۔'' ونود نے کہا۔ ''وہ چاندنگر کے قانونی وارثوں تک کیوں کر رہا تھا؟''

ونود نے اپنی بات ختم کر کے کرشن کی طرف دیکھا۔ اس سوال نے کرشن کے اعتماد کی کھوکھلی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔۔۔ شاید ابھی تک وہ اس امید سے خود کو فریب دے کر مطمئن رکھنے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ بعض الزام عائد کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے۔۔۔ محض ایک قلم۔۔۔ یا ایک بٹن یا پرس از خود ثابت نہیں کر سکتے کہ پدمنی پر قاتلانہ حملہ کرنے والا سریندر تھا۔۔۔ سریندر کا پدمنی سے میل ملاپ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہنے لگے تھے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے بہتر رفیق حیات نہیں مل سکتا۔۔۔ چناں چہ سریندر کی کچھ چیزیں اگر پدمنی کے گھر مل گئی ہیں تو کیا ہوا۔۔۔ اس سے صرف یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ سریندر رات کو اس گھر میں تھا۔۔۔ مگر اب یہ امید یک لخت سراب ثابت ہو گئی تھی۔

ونود جو بڑے شہر کا بڑا اور ماہر سراغ رساں تھا۔۔۔ سب کچھ پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔۔۔ کرشن کو پھانسی کا پھندا جوان بیٹے کی گردن میں صاف نظر آنے لگا تھا۔۔۔ وہ پولیس مین جو بڑے اعتماد سے فرض شناسی کی ایک اور روایت قائم کرنے کا دعوا کر رہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔۔۔ ونود کے سامنے صرف ایک باپ جو اپنے اکلوتے بیٹے سے محرومی کے خیال

سے دہشت زدہ لرزہ بر اندام بیٹھا تھا۔ ایشور نے پہلے اسے شریک حیات سے محروم کیا تھا اور اس نے بڑے صبر و استقامت کے ساتھ تنہائی کے سفر کا عذاب اٹھا لیا تھا مگر اس کے بڑھاپے کی لاٹھی بھی تقدیر کے بے رحم ہاتھ چھین رہے تھے ذرا سوچ رہا تھا کہ اب وہ کس کے سہارے جائے گا۔ جینے کی آرزو کے لیے کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔۔۔ آدمی صرف اپنے لیے کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

خاموشی کا وقفہ نزع کے کرب کی طرح طویل ہوتا گیا۔ بالآخر ونود نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''آئی ایم سوری کرشن!'' کرشن چونکا۔ اس نے ماتھے پر سے پسینہ رومال سے خشک کیا۔

''کوئی۔۔۔ کوئی بات نہیں مسٹر ونود۔۔۔! یہ مقدر کے کھیل ہیں۔۔۔ آپ کیا کچھ معلوم کر چکے ہیں۔۔۔'' ونود نے کم سے کم الفاظ میں کرشن کو وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے پدمنی کو بتایا تھا۔

کرشن اپنا سر اسٹیرنگ رکھے بڑے غور سے سنتا رہا۔۔۔ ونود کو اپنی بے رحمی پر شرم آئی۔۔۔ کاش! یہ سب کچھ کسی اور نے کرشن کو بتایا ہوتا۔ کاش! وہ چاند نگر ہی نہ آیا ہوتا۔۔۔ اِدھر اُدھر ہونے والے متعدد جرائم کی خبروں کے ساتھ وہ اخبار ہی میں اس خبر کو بھی سرسری طور پر پڑھ لیتا اور بھول جاتا۔ اسے ایسا صدمہ نہ ہوتا۔ اس دنیا میں کیسے کیسے جرائم ہوتے ہیں۔ مجرم قانون کے ہتھے نہیں چڑھتے ہیں۔

''میں آپ کی ذہانت اور آپ کی محنت کا اعتراف کرتا ہوں۔'' کرشن نے سر اٹھا کے کہا۔ ''آپ کی معلومات میں قدرے اضافہ بھی کر دیتا ہوں ویسے تو یہ بات کبھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ۔۔۔ اور تفتیش کے دوران آپ کو اپنے سوال کا جواب مل ہی جاتا کہ سریندر نے یہ قتل عام کیوں کیے۔۔۔ مجرم تو میں بھی ہوں کہ شبہ ہونے کے باوجود میں نے کسی پر اس کا اظہار نہیں کیا اور تفتیش کو صحیح سمت فراہم نہیں کی۔۔۔ میں فرشتہ نہیں۔۔۔ وہ آدمی ہوں جو خطا کا پتلا ہے اور اپنی فطری کم زوریوں سے نہیں لڑ سکتا۔۔۔ آپ نے ابھی بیتا کی ایک بیٹی کا ذکر کیا تھا جس کا شجرہ نسب تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گیا تھا۔ کیوں کہ آخری وارث لاولد تھا۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایشور نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے ایک لڑکے کو قانونی طور پر گود لے لیا اور اسے بیٹا بنا لیا تھا۔۔۔ میرا اصل باپ پرکاش کرشن تھا۔۔۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ وہ کس عمر میں مجھے یتیم کر گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ ماں مجھے جنم دیتے وقت مر گئی تھی۔ چنانچہ میں نے ہوش سنبھالا چاند تارا چند کے گھر میں تھا اور میرا نام کرشن نہیں پرکاش تارا چند ہو چکا تھا۔۔۔ جوان ہونے تک مجھے حقائق کا علم بھی ہو چکا تھا اور مجھے قانونی بیٹا بنانے والوں نے مجھ سے جذباتی محبت نہ سہی قانونی محبت بھی نہیں کی تھی۔۔۔ شاید سوتیلے بیٹوں کو بھی نفرت کے ساتھ تھوڑا سا پیار مل جاتا ہے۔۔۔ کبھی حقیقی ماں کا کبھی حقیقی باپ۔۔۔ مگر مجھے صرف نفرت ملی۔۔۔ ترس اور رحم کے جذبات کی خیرات۔۔۔ حقارت نظر اور ذلت و رسوائی۔۔۔ طعنے اور تلخ اور کڑوی اور زہر آلود باتیں کہ۔۔۔ منحوس نے اپنی زندگی کے لیے ماں کی جان لے لی۔۔۔ پھر باپ کو کھا گیا اب۔۔۔ خیر ان باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ۔۔۔ مختصر یہ کہ میرے قانونی ماں باپ بھی مر گئے تو میں نے نفرت کے اس طوق کو گلے سے اتار پھینکا۔۔۔ میں نے پھر اپنا نام وہی کر لیا جو میرا اصل نام تھا۔۔۔ یعنی کرشن۔۔۔ چالیس برس کے بعد کوئی گواہ نہیں رہا کہ میں بھی چاند تارا چند سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ بیٹا بھی سریندر تارا چند نہیں۔۔۔ سریندر کرشن۔۔۔ مگر نام کی تبدیلی سے قانونی حیثیت نہیں بدلی۔۔۔ وہ چاند تارا چند فیملی کا ایک وارث تھا ان سب کی طرح جو اس کے ہاتھوں مارے گئے۔۔۔ اب چاند نگر کا واحد قانونی وارث ہے۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔

''میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔۔۔ آؤ اب مجرم کی گرفتاری میں میری مدد کرو۔۔۔ میرے ساتھ رہو تا کہ میرے قدم

...یں۔"

وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔۔۔ونود دوسری طرف سے باہر آیا۔۔۔ایک ساتھ کھڑے ہو کر دونوں نے اپنی سامنے پھیلے ہوئے جنگل کو دیکھا اور ریوالور نکال لیے۔ بائیں جانب سمندر سے ایک لال سورج طلوع ہو رہا تھا اور صبح کا آغاز اپنے مسرت نغموں سے کرنے والے پرندے آج جیسے سہمے ہوئے تھے۔

''مسٹر کرشن!'' ونود نے کہا۔ ''یہ بہتر ہوتا اگر کسی اور کو بھی ساتھ لے لیتے۔۔۔یہ جنگل بہت بڑا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہوگا۔۔۔۔'' کرشن نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''جب وہ چھوٹا سا تھا تو اکثر جنگل میں گم ہو جاتا اور تلاش کرنے پر وہ ہی بات پر ملتا تھا۔۔۔میں آپ کو اندازے کے لیے بتا دیتا ہوں۔۔۔ایک طرف آپ جائیں۔۔۔اور دوسری طرف میں خود جاؤں گا۔۔۔اور ونود۔۔۔!'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

ونود پوری احتیاط سے کرشن کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھا۔ سورج کی دھوپ کا رنگ اب سنہرا سا ہو گیا تھا۔ آشیانوں سے نکلنے والے طیور دانے کے لیے پرواز کر چکے تھے۔۔۔اور جنگل میں سناٹا لوٹ آیا تھا جس میں کبھی کبھی کسی کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ پر پیچ راستہ درختوں کے درمیان بل کھاتا بڑھتا جا رہا تھا۔ جہاں بھی کچا راستہ دو حصوں میں بٹ جاتا تھا تو وہ ہدایت مطابق دائیں یا بائیں مڑ جاتا تھا۔ اس کی نگاہ اس نشان تلاش کر رہی تھی جو سائبان کی طرح تھی۔

ابھی وہ بمشکل میل بھر کا راستہ طے کرنے کے بعد ایک درخت پر سے کوئی بھاری بھرکم وجود اس پر گرا۔ وہ سنبھل نہ سکا۔۔۔ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اس بوجھ کے نیچے دب گیا۔۔۔

سریندر کے ہاتھوں نے ونود کی گردن کو جکڑ لیا۔ پھر اس نے ونود کا سر زمین پر دے مارا۔ ونود کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں رنگین تارے جھلملانے لگے اور اس کا سانس رکنے لگا۔

زندہ رہنے کی آرزو نے ونود کو ایک وحشیانہ قوت عطا کر دی اور اس نے نیچے سے سریندر کے پیٹ میں مکا دے مارا مگر سریندر کی قوت برقرار رہی۔ ونود کے ہاتھ میں ٹٹولنے سے ایک پتھر آ گیا۔ اس نے ہاتھ گھما کے پتھر کو سریندر کے سر پر مارنا چاہا مگر ضرب کی شدت اتنی نہ تھی کہ اس سے سریندر کا سر پھٹ جاتا۔ تاہم ایک لمحے کے لیے سریندر چکرا گیا اور اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔۔۔ ونود نے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور سریندر کے گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اتنی مہلت اس کے لیے کافی تھی مگر اس نے سریندر کو جوڈو کا وار کرنے کی پوزیشن لیتے دیکھا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ مقابلہ سخت ہے اور دشمن آسانی سے زیر ہونے والا نہیں ہے۔'' سریندر کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ اور سفاک چمک تھی۔ خون کی وہ پیاس جو بھوکے درندے کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ۔۔۔اس منزل تک آ جانے کے بعد میں صرف ایک آدمی کے باعث ناکامی قبول کر لوں گا۔۔۔۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''میرے لیے صرف ایک راستہ کھلا رہ گیا ہے کہ مسٹر ونود! تمہیں ماروں اور اس سنسار سے نیست و نابود کر دوں۔۔۔''

''تم اس کے باوجود چاند نگر کے وارث نہ بن سکو گے۔'' ونود نے چوکس رہتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا باپ بھی اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے۔''

''اس کی فکر نہ کریں آپ۔۔۔! وہ میرا باپ ہے دشمن نہیں۔۔۔ وہ بھی چاند نگر کا مالک ہے۔''

سریندر نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

ونود نے اسے حملہ کرنے کا موقع دیے بغیر جست لگائی مگر سریندر نے بڑی مستعدی سے خود کو بچایا اور ونود کے ایک فلائنگ کک رسید کی مگر ونود نے اس کی ٹانگیں کھینچ لیں اور قلابازی کھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ سریندر نے دوبارہ فلائنگ کک مارنی چاہی۔ ونود نے پھر اس کی ٹانگیں کھینچ لیں اور وہ اپنے ہی زور میں دور جا گرا۔ پلک جھپکتے میں اس نے ونود کا ریوالور اٹھا لیا۔ ونود اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ سریندر کچھ دیر اپنی سانس کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔

''آپ نے خودکشی نہ کی ہوتی تو اچھا تھا مسٹر ونود۔۔۔ میں آپ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ میں نے اس لیے آپ کو واپس بھیجنے کی کوشش بھی کی تھی۔۔۔ آپ چلے گئے ہوتے تو زندہ رہتے۔۔۔ اگر آپ میری جگہ آپ بھی تقدیر کی اس پیش کش کو ہر قیمت پر قبول کرتے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے سریندر۔۔۔!'' ونود نے کہا۔ ''اس جزیرے کے تمہیں زیادہ سے زیادہ دو کروڑ روپے ملیں گے۔''

سریندر مسکرایا۔۔۔ کیا دو کروڑ روپے بھی کم ہوتے ہیں۔۔۔ دو کروڑ سے دس کروڑ بنائے جا سکتے ہیں۔۔۔ مگر جالندھر میں نائلون سے سر کھپانے والا کلرک اس کے خواب تک نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ میں اب کلرک نہیں ہوں۔ چاند نگر کا مالک ہوں سودا کرنا میرا کام ہے حکومت کو اس زمین کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ دفاعی نقطہ نظر سے اس جزیرے کی جغرافیائی پوزیشن کو مثالی قرار دیا گیا ہے اور ماہرین نے کہا ہے کہ پانچ کروڑ تک میں بھی یہ زمین خرید لی جائے تو معلوم نہیں یہاں کیا ہوگا۔۔۔ کوئی جوہری تجربہ یا کوئی ریسرچ کا کام۔۔۔ لیکن میں نے ٹاپ سیکرٹ فائل میں پورا نوٹ پڑھ لیا تھا۔۔۔ میں پانچ کروڑ کا مالک بن چکا ہوں مسٹر ونود۔۔۔!''

''ابھی نہیں سریندر۔۔۔!'' بائیں جانب سے کرشن کی آواز آئی۔ ''ابھی تو میں زندہ ہوں۔۔۔ میرے بعد واقعی تم مالک بن جاؤ گے۔۔۔'' سریندر کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہو گیا اور آنکھوں سے وحشت جھانکنے لگی۔

''آپ درمیان میں نہ پڑیں پتا جی۔۔۔'' اس نے گھوم کر دیکھے بغیر کہا۔

''میں تمہیں چاند نگر کے انسپکٹر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ ریوالور ڈال دو۔'' کرشن نے تحکمانہ سخت اور خشک لہجے میں اس سے کہا۔

''اچھی بات ہے پتا جی۔۔۔!'' سریندر نے ریوالور اٹھایا۔ ''بس ایک منٹ۔۔۔ میں ریوالور ڈال دوں گا۔''

''سریندر۔۔۔!'' کرشن چلایا۔ ''میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

سریندر کا ہاتھ رک گیا۔ ''آپ مجھے شوٹ کر دیں گے۔۔۔'' وہ ہنسا۔ ''نہیں پتا جی۔۔۔ آپ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔۔۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔۔۔ آپ خود کو شوٹ کر سکتے ہیں مگر مجھے نہیں۔''

اس نے پھر ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ ونود غوطہ گیا۔۔۔ بیک وقت دو فائر ہوئے اور ونود سریندر کو پیٹ پکڑ کر زمین پر گرتے دیکھا ا ریوالور جھٹکے سے دور جا گرا تھا۔۔۔ ونود نے جھ کر ریوالور کو اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔

کرشن ایک درخت کی اوٹ سے نمودار ہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ خواب میں چلنے وا طرح پلک جھپکائے سریندر کی طرف دیکھتا ہوا سریندر کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل گر اپنے بیٹے پر جھک گیا۔۔۔ جس کی آنکھوں میں یقینی کا سارا کرب سمٹ آیا تھا۔

''سریندر۔۔۔! سریندر۔۔۔! تم یہ کیوں بھول گئے تھے کہ تمہارا باپ پولیس ہے۔''

آپ۔۔۔ آپ نے مجھے۔۔۔ زندہ رہنے کا ایک موقع دیا ہوتا پتاجی۔۔۔'' وہ انگلی اٹھا کے بولا۔ ''تو آپ بھی میری طرح غلامی کا یہ طوق اتار کے پھینک سکتے تھے۔۔۔ یہ کیسی وفاداری۔۔۔ کیسی فرض شناسی ہے پتاجی۔۔۔ اتنی معمولی۔۔۔ سی تن خواہ کے لیے۔۔۔ مٹھی بھر روپوں کے لیے آپ۔۔۔ آپ نے یہ نہیں سوچا۔۔۔ کہ میرے بعد کیا ہوگا۔۔۔ حکومت نے کیا۔۔۔ کیا دیا تھا آخر۔۔۔ آپ کو۔۔۔ ساری عمر کا حساب جوڑیے۔۔۔ کیا پانچ کروڑ کا آدھا۔۔۔ آدھے کا آدھا۔۔۔ بنتا ہے۔ آپ نے گھاٹے کا سودا کیا ہے پتاجی! آپ نے سب کچھ گنوا دیا۔۔۔ چاند نگر کی جاگیر۔۔۔ اپنا بیٹا!''

کرشن کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خاموشی سے ان جھریوں میں بہتے رہے جو عمر کے ساتھ اس کے چہرے پر پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو بے بسی سے مرتا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اس جنگل سے گاؤں بہت دور تھا اور سریندر کے جسم سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنا بے سود تھا۔ اگر اسے بچانے کا سامان ہوتا تب بھی کیا تھا۔۔۔ اندگی کا انجام بہر حال موت تھی۔ وہ موت جو اس سے زیادہ پر عذاب انتظار کے بعد تختہ دار پر آتی ہے۔۔۔ جب رحم کی آخری اپیل پھر مسترد ہو جاتی۔

''آئی ایم سوری۔۔۔ بیٹے! مجھے معاف کر دینا۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی۔۔۔ بات پانچ کروڑ کی نہیں۔۔۔ تم جیسے وارثوں کے خون کی تھی۔ اور ایک پاگل کے لہو کی تھی۔۔۔ پھر سب مل کر مجبور کر دیا مجھے۔۔۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ۔۔۔ لیکن ان سب کا مقابلہ میں اکیلا کیسے کرتا۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا کیوں کہ اس کا بہادر بیٹا اس کا عذر سنے بغیر مر گیا تھا۔ اس نے اپنا ستارہ جیب پر سے الگ کیا اور بیٹے کی لاش پر رکھ دیا۔

''اس سے زیادہ حکومت مجھ سے نہیں لے سکتی بیٹے! یہ آخری چیز تھی جو میں نے خود ہی حکومت کے حوالے کر دی ہے۔'' وہ خود فراموشی کے عالم میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

ونود ویران پلیٹ فارم پر ساکت و صامت کھڑا ہوا تھا۔ اس کے مقابل میں وہ کچا راستہ تھا جس پر چل کر وہ چاند نگر پہنچا تھا۔۔۔ اس راستے پر وہ پہلی بار ایک دیوانے سے ملا تھا جسے چاند نگر کے شہزادے اور زمین کی شہزادی کی کہانی پوری نہیں آتی تھی۔۔۔ جسے معلوم نہیں تھا کہ شہزادی نے ایک دن کیا کہا تھا۔۔۔ وہ جگہ اب بھی ونود کے سامنے تھی۔۔۔ ونود کے تصور میں وہ گھر کے چراغ سے نہیں انصاف کرنے والوں کی آتش انتقام سے آگ لگی اور جس نے ایک انمول خزانے کو راکھ کر دیا۔۔۔ اس خزانے میں کیا نہیں تھا۔۔۔ مسرت تو ایک جذبہ ہے جو رنگین کانچ کے ٹکڑے میں بھی رہتا ہے اور کوہ نور ہیرے میں بھی۔۔۔ جو دیوانے کی جھگی میں بھی رہتا ہے۔۔۔ جس شان سے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے محل میں بھی۔۔۔

چاند نگر اب کسی کا نہیں تھا۔ ایک کیپٹن کو عطا ہونے والی جاگیر کے سارے وارث اس کی مٹی میں دفن ہو چکے تھے۔ اب حکومت جو چاہے کرے۔۔۔ اسے پانچ کروڑ کیا اس پاگل کو پانچ روپے بھی نہیں دینے پڑیں گے جو چاند نگر کا مالک ہے اور جو پہلے اس بستی کا انسپکٹر تھا مگر اب گاؤں سے باہر ایک غار میں برہنہ تنہا رہتا ہے اور کسی کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں۔

''ونود۔۔۔!'' پدمنی نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ ''گاڑی آ گئی ہے۔'' ونود نے سر ہلایا اور دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے۔

بارہویں قسط

چمگادڑ

ایم اے راحت

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کا شکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔

عمران ڈائجسٹ کا پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ

موہنی نے کہا ''گویا ہمارا دوسرا اندازہ درست نکلا۔''

میں نے سوالیہ نگاہوں سے موہنی کو دیکھا تو وہ بولی۔

''ابدال شاہ نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ وہ ہمارے ملک کے ایٹمی راز لیے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے اور کچھ لوگ اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

''ہاں موہنی ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''پھر تو وہ شخص ذرا بھی قابل رحم نہیں ہوا، بلکہ اب ہمیں اس بات پر افسوس کرنا پڑے گا کہ اس طرح ہم نے اس کی بے لوث مدد کیوں کی۔''

''کر بھی کیا سکتے تھے۔''

''لیکن وہ آئے گا۔ اس نے ہم پر اعتماد کر کے یہ کاغذات ہمارے حوالے کر دیے ہیں وہ سوچ بھی نہیں سکتا ہوگا کہ ہم ان سے اس طرح واقفیت حاصل کر لیں گے۔''

''یہ بریف کیس اجنبی ہاتھوں میں جائے تو اسے توڑے بغیر کھولنا ممکن نہیں ہے، بس ایک بار یہ میرے ہاتھوں سے گزر گیا تھا اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کہاں اور کیسے غالباً اسے بنانے والی کمپنی نے اسے ایک ہی انداز میں بنایا ہے، اس لیے میں اسے کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔''

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''یہ سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں موہنی!''

''تھوڑا سا انتظار اور اس کے بعد۔۔۔''

''ہاں اس کے بعد کہو۔''

''اگر تم سفارت خانے سے تعلقات قائم کرو گے اور اس بریف کیس کے بارے میں اسے بتاؤ گے تو ہماری اپنی شخصیت سامنے آئے گی۔''

''میں سمجھتا ہوں ایسا ہوگا۔'' میں آہستہ سے کہا۔

''ایک بات اور۔۔۔'' موہنی بولی۔

''ہاں کہو۔۔۔

''ابدال شاہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور اس نے یہ فائل کسی اعتماد کی بنا پر ہی ہمارے حوالے کر دی ہے۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ اس نے یہ سوچا ہوگا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہ بریف کیس کیس کھول نہیں سکتے۔ اگر کوشش بھی کریں تو اس میں ناکام رہیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فرض کرو، اگر ہم یہ بریف کیس کھول بھی لیتے ہیں تو ان کاغذات کے بارے میں بھلا کیا جان سکیں گے۔ اسے یہ اعتماد ہوگا اور چونکہ وہ فائل کے لیے دوڑا چلا آئے گا۔ اس لیے اس بات کے مکمل امکانات ہیں کہ وہ ہم تک دوبارہ پہنچے۔ فرض کرو ایسا ہوا تو کیا کرو گے۔''

''بات اصل میں یہ ہے کہ موہنی کہ معاملہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے چاہے وہ کیسی شخصیت کا مالک ہو۔ اسے کم از کم اس بات کا جواب دینا ہوگا کہ یہ فائل اس کے پاس کہاں سے پہنچی اور اس کی حقیقت کیا ہے۔'' موہنی ہنسنے لگی، پھر بولی۔

''اگر اس کی جگہ میں ہوتی تو بڑے اطمینان سے تمہیں مطمئن کر سکتی تھی۔''

''کیسے۔۔۔'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں تم سے کہتی کہ چونکہ میرے سسرال والے جرائم پیشہ لوگ ہیں اور وہ ہر قسم کے کام کیا کرتے ہیں میں نے یہ فائل یا یہ بریف کیس ان سے حاصل کیا ہے۔ اس لیے کہ میں انہیں اس کے ذریعے بلیک میل کر سکوں اور وہ مجھے یہاں سے نکل جانے کی ضمانت دیں، ورنہ بریف کیس انہیں نہیں مل سکتا۔''

میں نے حیران نگاہوں سے موہنی کو دیکھا اور کہا۔

''واقعی یہ تو ہو سکتا ہے اور ہمیں تسلیم بھی کرنا پڑے گا۔''

''لیکن جس طرح وہ لوگ اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور جس طرح وہ انہیں جل دے کر نکل گیا اس سے یہ بات بالکل نہیں مانی جا سکتی کہ ایسی کوئی بات ہے، یقینی طور پر ندیم میں دعوے سے کہہ

ں ہوں کہ وہ پراسرار شخص کسی اور ہی حیثیت کا حامل ہو۔

''بہت اچھا اب ایک بات بتاؤ کیا ہم اس اس آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' مونی نے جواب دیا۔

''تو پھر کیا، کیا جائے؟''

''تم سوچو ندیم!''

''ہم یوں کرتے ہیں کہ ہم یہ فائل بدل دیتے ہیں۔'' میں نے کہا اور مونی سنسنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ پرخیال انداز میں گردن ہلا رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''مناسب تجویز ہے فائل بدل دی جائے اور بریف کیس کو بند کر دیں، اس کے بعد ظاہر ہے کہ وہ ہمارے پاس آئے گا، بریف کیس تو ہم جوں کا توں اس کے حوالے کر دیں گے اور اس سے اس کے بارے میں سوالات کریں گے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ کوئی جھوٹی کہانی سناتا ہے تو کم از کم یہ فائل ہمارے قبضے میں آ گئی ہے اور ہم اپنے ملک کے یہ راز کسی غیر کے ہاتھوں میں نہیں جانے دیں گے۔ یہ تو بعد میں سوچیں گے کہ ہمیں اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔''

پھر اس کے بعد ہم نے اس پر عمل کیا۔ ایک فائل میں سادہ کاغذات لگائے گئے اور اس کی ترتیب درست کر کے اسے بریف کیس میں رکھا گیا اور میں نے بریف کیس اسی انداز میں بند کر کے اسے بریف کیس میں رکھا گیا اور میں نے بریف کیس اسی انداز میں بند کر کے اس پر سے اپنے ہاتھوں کے نشانات مٹا دیے۔ پھر اسے ایک ایسی الماری میں رکھ دیا کہ اگر کوئی گھر کی تلاشی لینا چاہے تو بریف کیس اسے حاصل ہو جائے۔ البتہ وہ فائل ہم نے ایک انتہائی محفوظ جگہ پہنچا دی۔ یہ سرونٹ کوارٹر کی چھت کا ایک حصہ تھا۔ جو محفوظ ترین جگہ ہی جا سکتی تھی اور وہاں کسی کا وہم بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس کام سے مطمئن ہونے کے بعد ہم لوگ نہ جانے کتنی دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے تھے۔ دوسرا دن، تیسرا دن اور چوتھا دن بھی گزر گیا۔ ہماری مصروفیات کوئی خاص نہیں تھیں۔ ویسے ان دنوں میں ہم نے گھر پر رہ کر زیادہ وقت ابدال شاہ کے انتظار میں ہی گزارا تھا اور اب ہمیں مایوسی ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت تو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا ہے اور نکل گیا ہے۔ لیکن اگر اس نے اپنے پیچھے اتنے خطرناک لوگ لگا رکھے ہیں تو ممکن ہے وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس طرح سے وہ زندگی سے محروم ہو جائے۔ میں تھوڑی سی کشمکش کا شکار تھا۔ اپنے وطن کے یہ قیمتی راز وطن تک واپس پہنچانا میرا فرض تھا، لیکن طریقہ کار سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

پانچویں رات بھی ہم نے اس کا انتظار کیا اور دیر تک اس کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ پھر تمام ضروریات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے بیڈروم میں پہنچ گئے۔ مونی میرے قریب لیٹ کر سو گئی۔ میں خاصی دیر تک جاگتا رہا تھا اور اپنے ذہن میں ماضی کی یادیں دہراتا رہا تھا۔ بہت سے خیالات دل میں آتے تھے۔ گم شدہ یادداشت کے دوران نہ جانے کیا کیا واقعات پیش آتے رہے ہوں گے، لیکن ان واقعات کا راز دار کوئی نہیں تھا۔ ہوں گے بہت سے، لیکن اب وہ میرے لیے اور میں ان کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ پھر نیند آ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔

دوسری صبح جب جاگا تو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ موسم اور ماحول وقت کا احساس یقینی طور پر دلا دیتا ہے۔ ہم لوگ بہت زیادہ دیر تک سونے کے عادی نہیں تھے اور صبح کو جلد جاگ کر اپنی اس خوب صورت رہائش گاہ میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ وقت بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر مونی کو دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی سو رہی ہوگی، لیکن وہ جاگ گئی تھی اور اس کی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ میں چونک

پڑا، یہ معمول کے خلاف تھا۔ ہمارے درمیان معاہدہ تھا، ایک جاگے تو اس وقت تک مسہری سے نہیں اٹھے گا جب تک دوسرے کو بھی نہ جگا لے۔ پھر مونی میرے بغیر اٹھ کر کیسے یہاں سے چلی گئی۔ میں چونک کر اٹھ گیا۔ دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ذہن کو اور جھٹکا لگا، ساڑھے نو بج رہے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ اتنی دیر تک سونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شاید یہاں آنے کے بعد آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ رات کو جس وقت بھی سوتے صبح کو ہمیشہ وقت پر ہی آنکھ کھلتی تھی۔ لیکن اس وقت آج کیا ہوا۔ پھر اچانک ہی ایک اور عجیب سا احساس ہوا، ذہن پر ایک ناگوار سی بو مسلط تھی اور مجھ جیسا آدمی اس بو کو با آسانی پہچان سکتا تھا۔ ایک خاص قسم کی خواب آور گیس کی بو تھی جس کے ذریعے بے ہوش کیا جا سکتا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد اس کے شدید اثرات دماغ پر ہوا کرتے ہیں۔ ذہن نے کسی خاص بات کے ہونے کا نعرہ لگایا اور میں نے مسہری سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ پہلے واش روم دیکھا اور اس کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور باہر پہنچتے ہی ایک اور ذہنی جھٹکا لگا۔ راہ داری میں رات کو جاگنے والے دونوں ملازم مڑے تڑے پڑے ہوئے تھے۔ راہ داری کے چکنے فرش پر انہوں نے گھٹنوں میں سر دے رکھا تھا اور بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میرے دل کی حالت خراب ہونے لگی۔ کچھ ہو گیا ذہن نے نعرہ لگایا۔ جھک کر ملازموں کو دیکھا تو وہ زندہ تھے اور شاید خواب آور گیس کے زیر اثر ابھی ہوش میں نہیں آ سکے تھے۔ انہیں وہیں چھوڑ کر میں عمارت کے تمام حصوں میں بھاگ دوڑ کرنے لگا اور میرا دل خون ہوتا رہا۔ گیٹ کے چوکیدار تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں ان کی نسبت جلدی ہوش میں آ گیا تھا۔

صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ میری اس رہائش گاہ میں کسی بھی طریقے سے گیس کا استعمال کر کے یہاں موجود تمام لوگوں کو بے ہوش کر دیا گیا ہے، لیکن مونی کے بارے میں کیا سوچوں اب چونکہ اس عمارت کا ایک ایک گوشہ تلاش کر لیا تھا اور مونی کا کہیں وجود نہیں ملا تھا۔ اس لیے صرف یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے مونی کو اغوا کر لیا ہے مکمل یقین کرنے کے لیے ایک بار پھر اپنی خواب گاہ میں واپس آیا۔ مسہری کے پاس مونی کے سلیپر پڑے ہوئے تھے اور اس بات سے پورا پورا یقین ہو جاتا تھا کہ بے ہوشی کے بعد مونی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ دل دھک سے ہو گیا تھا۔ اب کسی اور چیز کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ مونی ایک بار پھر مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ مگر وہ کون تھے جنہوں نے یہ عمل کیا اور کیوں یہ سوال اس لیے ذہن میں پیدا ہوا تھا کہ ذہن ابھی تک اس خواب آور گیس کے زیر اثر تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ دماغ کی کیفیت درست ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ کون اور کیوں کا جواب خود میرے ذہن میں آ گیا۔ میں نے برق رفتاری سے اس الماری کی طرف چھلانگ لگائی۔ جس میں وہ بریف رکھا گیا تھا۔ الماری کھول کر دیکھا تو بریف کیس غائب تھا۔ مسئلہ وہی تھا۔ یعنی بریف کیس کے لیے وہ لوگ میرے پاس پہنچے، کیا ہی عجیب بات ہے انسانی ہمدردی بھی بعض اوقات کس قدر ہولناک ثابت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ تمام باتیں میرے ذہن میں واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے کار روک کر میرے کاغذات دیکھے تھے اور لازمی بات ہے کہ کار کے رجسٹریشن سے انہوں نے میری رہائش گاہ کا پتا لگا لیا۔ مجھے زبردست نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ویسے مجھے اصل کاغذات کے بارے میں یقین تھا کہ ان تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مونی کے اس طرح مشکل میں پھنس جانے سے دل و دماغ پر جو اثرات مرتب ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ لمحات کے لیے مجھے بالکل نڈھال کر دیا۔ یہ کیا بات ہے۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو دنیا سے الگ تھلگ ہو کر ساری عمر مشکلات میں گزار کر اپنوں سے دور وطن کی بے اعتنائی کا شکار اس تنہا گوشے میں اپنی زندگی کے سفر کو آگے بڑھانے کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔ لیکن مشکل حالات نے

میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان لوگوں نے ایک بار پھر مجھے چھیڑ دیا۔ مجھے اپنی تقدیر پر ہنسی آ گئی۔ کیا انوکھی تقدیر پائی ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات کی ترتیب کی جائے تو ایک عجیب وغریب کہانی تشکیل پاتی ہے۔ ایک ناقابل یقین کہانی، اپنا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں بالکل پازیٹو ذہن سے پیار کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ کسی بے گناہ کو میرے ہاتھوں نقصان نہ ہونے پائے۔ لیکن اندر سے آواز آئی کہ اپنے آپ کو ساکت کرنے کا خیال دل سے نکالتے ہوئے تو وقت نے تمہیں پھر اسی راستے پر لا ڈالا ہے۔ اس راستے کو ترک نہ کرو۔ میں نے دل میں سوچا کہ ٹھیک ہے کہ میں ان راستوں کو ترک نہ کروں۔ مجھے سکون کی زندگی بھی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ اب سکون حاصل کرنے کی کوشش میں میرے دل کو داغ لگتے رہیں گے۔ یہ داغ میرے لیے اس زندگی سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ جدوجہد کر کے اپنے آپ کو مصروف تو رکھ سکتا تھا۔ سکون سے بیٹھوں تو مشکلوں میں گرفتار ہو جاؤں اور یہ مشکلیں میرے لیے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ بہت سے خیالات دل میں آتے رہے اور وجود میں جنون بڑھتا رہا۔ یقینی طور پر اب مجھے مصروف عمل ہونا پڑے گا۔ ایزی ہارڈ نے الیاس بیگ کو ایک طرح سے میرا ہمزاد بنا دیا تھا۔ لیکن مجھے اس ہمزاد کی ضرورت نہیں تھی۔ بے چارہ میرے برابر تو وسائل نہیں رکھتا ہوگا۔ وہ تو قانون کے دائرے میں رہ کر مقامی طور پر ہی میرے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس لیے پولیس سے مدد لینا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں تو اپنی بالکل تشہیر نہیں چاہتا تھا اور پولیس سے رابطہ قائم کیا جائے تو ہزار جھگڑے سامنے آئیں گے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الیاس بیگ کو بھی میں نے اپنی لہرست سے نکال دیا۔ جو کچھ کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ اسی طرح جس طرح شہزاد آج تک اپنی زندگی کے منصوبوں پر عمل کرتا آیا ہے۔ دل کو تقویت دی بس مونی کا خیال تھا۔ ایک بار پھر مشکلات میں جا پھنسی ہے۔ پتا نہیں بے چاری کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہوگا۔ اس بار مل گئی تو اسے پیش کش کروں گا کہ مونی زندگی کے صبح وشام بہت دیکھ لیے۔ تمہاری مجھ سے علیحدگی ہی مناسب ہے۔ میری وجہ سے تم کس قدر خوار ہوئی ہو، مشکلات ہی مشکلات اٹھاتی رہی ہو، زندگی کا منصوبہ بناتے ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں۔ شاید قدرت کو میری اور تمہاری یک جائی منظور نہیں ہے خود کو مجھ سے علیحدہ کر لو اور سکون کی زندگی گزارو، لیکن پھر بھی یہ سب مونی کو گالی محسوس ہوا، اس نے اب تک میرے لیے جو قربانیاں دی ہیں کیا ان کے جواب میں اس سے یہ الفاظ کہے جا سکتے ہیں۔ یہ تو ایک بہت ہی کمینہ ہوگا۔ ایک بار پھر خود ہنس پڑا، وہ ہے کہاں جو میں اس کے بارے میں اتنے سارے فیصلے کر رہا ہوں۔ وہ تو بے چاری نہ جانے کس عالم میں ہوگی۔ غسل خانے میں جا کر غسل کیا، غسل سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کسی ملازم نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی، باتھ روم سے باہر نکل آیا، ملازم حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''صاحب پتا نہیں کیا ہوا ہے؟''

''کیوں کیا بات ہے؟''

''صاحب ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔''

''یاد ہے کیسے؟''

''بالکل یاد نہیں صاحب! میں تو اپنے کمرے میں سو رہا تھا، اب آنکھ کھلی تو خیال ہوا کہ دن خاصا چڑھ آیا ہے۔ صاحب چوکیدار بھی بے ہوش ہے۔ دوسرے ملازم ہوش میں آ گئے ہیں۔ لیکن وہ بھی یہ ہی کہتے ہیں کہ وہ ابھی ابھی ہوش میں آئے ہیں۔''

''جاؤ پہلے نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرو، اس کے بعد میرے لیے ناشتا لاؤ'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ملازم باہر نکل گیا تھا۔ پھر تقریباً تمام ہی ملازموں سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے ان کے بارے میں پوچھا، ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ مونی کو موجود نہ پا کر وہ بھی حیران تھے۔ لیکن جب میں ان سے ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں

کر رہا تھا تو وہ بھی مجھ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پائے اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن میں خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھا ہی سوچتا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ذہن میں اور بھی بہت سے خیالات آئے۔ اب میں اپنی اس کیفیت سے نکل آیا تھا اور جانتا تھا کہ بلا عمل زندگی کا آغاز کرنے کے لیے غم کے احساس میں ڈوبے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ عقل بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہے کہ وہ لوگ فائل بھی لے گئے اور مونی کو شاید وہ ایسے کسی مقصد کے تحت لے گئے ہیں کہ میری زبان بند رکھیں یا پھر مجھ سے کچھ اور معلومات حاصل کریں۔ ورنہ بریف کیس لے جاتے۔ اس وقت ان کے ذہن میں یہ خیال نہیں ہوگا کہ اس بریف کیس میں جعلی کاغذات یا سفید کاغذات ہیں۔ ایک اور حیرت کی بات تھی کہ یہ لوگ اس طرح بے ہوش کر کے مجھے بھی لے جاسکتے تھے۔ پھر مونی کو ہی لے جانے پر اکتفا کیوں، بہرحال ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن اس بات کا یقین تھا کہ وہ ٹیلی فون پر مجھ سے کاغذات کے بارے میں رابطہ قائم کریں گے اور اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ میں یہیں پر محدود ہوں۔ ملازموں کو میں نے ہدایت کر دی کہ اگر کوئی مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو اس کو روکا نہ جائے اور مجھ تک پہنچا دیا جائے یا اگر رات کو کوئی پوشیدہ طور پر اس عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے بھی نہ روکا جائے اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں اطلاع دینے کی جائے۔ میرے ان الفاظوں پر ملازموں کے چہروں پر حیرت کے نقوش ابھر آئے تھے۔ غالباً انہوں نے سوچا تھا کہ صاحب کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہیں، لیکن میں کسی کی بھی سوچ پر پابندی نہیں لگا سکتا تھا۔

پورا دن پریشانی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ رات بھی اسی طرح بے سکون گزری تھی۔ ٹیلی فون سے آس تھی، لیکن اس کی گھنٹی بج کر نہیں دے رہی تھی۔ کسی نے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ دوسری صبح بے نور اور اداس تھی۔ مونی کا خیال آیا تو دل سے ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ آہ بے چاری نہ جانے کس عالم میں ہوگی اور کیا سوچ رہی ہوگی۔

تقریباً ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ میں اپنی خواب گاہ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا کہ مجھے باہر آہٹ محسوس ہوئی۔ ملازم آجا رہے تھے۔ ہوسکتا ہے کوئی ادھر کسی کام سے نکل آیا ہو۔ میں منتظر رہا، پھر دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا، لیکن جو اندر داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر میں حیرت سے چونک پڑا، یہ ابدال شاہ تھا۔ ایک عمدہ لباس میں ملبوس چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی۔ اندر داخل ہوا، بیڈ روم میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''معافی چاہتا ہوں مسٹر ندیم! میں آپ کی اس کوٹھی میں گیٹ سے نہیں داخل ہوا، بلکہ دیوار پھلانگ کر اندر آیا ہوں۔ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔''

میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا تو وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں آپ مجھ سے بے حد ناراض ہوں گے اور نہ جانے میرے بارے میں کیا، کیا خیالات آپ کے دل میں آچکے ہوں گے، بیٹھ سکتا ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو وہ بیٹھ گیا، پھر مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''زمانہ قدیم سے نمک حلالی کا ایک تصور ذہنوں میں رکھا گیا اور یہ کہا جاتا ہے کہ جس کا نمک کھاؤ اس سے وفادار ہو۔ پھر میرا مسئلہ تو بالکل مختلف ہے۔ میں نے آپ کا نمک ہی نہیں کھایا، بلکہ آپ نے جس طرح میری بے کسی اور بے بسی کے عالم میں مدد کی ہے۔ وہ احسان عظیم تو مجھے کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ لیکن ندیم صاحب کبھی کبھی انسان اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ وہ فطرتاً برا نہیں ہوتا۔ اس کے خون میں خرابی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی ذمہ داریاں اور اس کے فرائض اس سے اس کی ذات چھین لیتے ہیں اور وہ صرف ایک فرد رہ جاتا ہے۔ براہ کرم سب سے پہلے اپنے دل میں میرے لیے نرمی پیدا کیجیے اور مجھے

معاف کر دیجیے گا۔ وہ ایسی ہی مجبوری تھی کہ مجھے خاموشی سے آپ کے پاس سے جانا پڑا تھا۔''

''اب آپ کیسے ہیں مسٹر ابدال شاہ!''

''میں ٹھیک ہوں۔ خدا کا شکر ہے، لیکن میری مشکلات جوں کی توں ہیں۔''

''آپ کی مسز اور ان کے بھائی کیا ابھی تک آپ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا اور اس نے افسردہ انداز میں گردن ہلا دی۔

''آپ جانتے ہیں کہ وہ ایک جھوٹی کہانی تھی تو پھر آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہے ہیں۔'' ابدال شاہ آہستہ سے بولا۔

''نہیں میں آپ کو شرمندہ نہیں کر رہا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب آپ کون سی جھوٹی کہانی مجھے سنانے والے ہیں؟''

''کہہ لیجیے، آپ کو اس کا حق ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کہانی تو سنایئے آگے۔''

''نہیں کوئی کہانی نہیں، میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ اخلاق، محبت، رواداری اور لاتعداد انسانی عمل انسان کی ذات سے منسلک ہوتے ہیں، لیکن بات جب ان کی ذات کی نہ ہو تو پھر یہ سب کچھ بے کار ہے۔''

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''براہ کرم! وہ بریف کیس مجھے واپس کر دیجیے گا۔ میں اسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''وہ بریف کیس اب میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''جی۔۔۔'' وہ چونک پڑا۔

''ہاں اسے یہاں سے حاصل کر لیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے میری گاڑی کے کاغذات دیکھے تھے، مجھے روک کر میرے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس سے انہیں میری رہائش گاہ کا پتا چل گیا تھا۔ ایک رات کو وہ لوگ میری رہائش گاہ میں داخل ہوئے ملازموں کو، مجھے اور میری بیوی کو ایک خواب آور گیس سے بے ہوش کیا، میرے گھر کی تلاشی لی اور بریف کیس یہاں سے لے گئے۔

''لل۔۔۔ لے گئے۔'' وہ وحشت زدہ انداز میں بولا

''آہ۔۔۔! یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا، مسٹر آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ کسی حد تک جذباتی ہو گیا تھا۔ میں اس کی صورت دیکھنے لگا، پھر میں نے کہا۔

''کیا تھا اس بریف کیس میں؟''

''بکواس مت کرو مجھے بتاؤ وہ بریف کیس کہاں ہے۔'' اس کی آنکھوں میں دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

''میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے مائی ڈیر ابدال شاہ اگر تمہارا یہی نام ہے شاید تم خود جھوٹی کہانیاں گھڑ گھڑ کے اس قدر جھوٹے ہو گئے ہو کہ اب تمہیں کسی کو جھوٹا کہنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔''

''مجھے فضول کہانیاں نہ سناؤ، بریس کیس بتاؤں کہاں ہے۔'' اس نے کہا اور اچانک جیب سے پستول نکال لیا۔ پستول کا رخ میری جانب کر کے وہ بولا۔

''اور میری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ مسٹر ندیم! وہ بریف کیس میرے حوالے کر دو اس میں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا اور نرم لہجے میں کہا۔

''بریف کیس میرے پاس نہیں ہے ابدال شاہ۔۔۔! تم جانتے ہو مجھے اپنے مطلب کی چیزوں کی تلاش نہیں ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوں، صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میں نے تمہاری مدد کی تھی۔ بریف کیس کا مسئلہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔ تم چلے گئے میں نے تمہیں تلاش نہیں کیا۔ تم دوبارہ ملے اور ایک ذمہ

داری مجھے سونپ گئے۔ میں نے اس وقت بھی تمہارے بارے میں کسی غلط انداز میں نہیں سوچا، کیا تمہارا۔۔۔''

''دیکھو۔۔۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ بریف کیس کہاں ہے مجھے یہ بتاؤ۔''

''فرض کرو اگر میں تمہیں بریف کیس دے دوں تو کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ اس بریف کیس میں کیا ہے؟'' میرا لہجہ بدل گیا۔

''یہ سب بعد کی بات ہے۔ مجھے بریف کیس چاہیے۔ اتھو وقت نہیں ضائع کرو۔ تمہارے حق میں نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''مثلاً۔۔۔''

''مثلاً یہ کہ میں تمہیں گولی مار دوں گا اور جو بھی میرے سامنے آئے گا میں اسے قتل کر دوں گا اور اس کے بعد بریف کیس تلاش کر کے یہاں سے لے جاؤں گا۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں اپنی جگہ سے اٹھا اور الماری کے قریب پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے میرے عقب میں آیا تھا اور یہ ہی میں چاہتا تھا، اگر وہ وہیں مجھے پستول سے کور کیے کھڑا رہتا تو شاید مجھے دقت ہوتی۔ لیکن وہ بھی شدت جذبات سے اندھا ہو رہا تھا۔ میرے قریب الماری کے پیچھے پہنچا، میں نے الماری کے خانوں میں جھک کر اندر ہاتھ ڈالا اور وہ پرتجسس انداز میں خود بھی جھک گیا۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک لات پیچھے سے اس کی پنڈلی پر ماری اور جیسے ہی وہ تھوڑا سا پیچھے ہوا، میں نے اس کے پستول پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا، میں نے ٹھوکر مار کر اسے مسہری کے نیچے پہنچا دیا اور اس کا جو ہاتھ پکڑے ہوا تھا، اسے کندھے پر رکھ کر اسے اٹھا کر زمین پر دے پٹخا۔ اس کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اتنی پھرتی سے یہ عمل کر سکتا ہوں، لیکن وہ برق رفتاری سے اٹھا۔ تھوڑا سا جنگ و جدل کا بھی ماہر تھا۔ فوراً ہی اس نے پلٹ کر مجھ پر فلائنگ کک استعمال کی۔ جیسے ہی اس کی ٹانگیں میرے قریب پہنچیں میں نے جھکائی دے کر اس کی دونوں ٹانگوں کو اپنی بغل میں دبا لیا اور پوری قوت سے گھوم کر اسے زمین پر گرا کر ٹانگیں موڑ دیں۔ اس کے حلق سے ایک ہلکی سی کراہ نکلی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو بھرپور قوت کے ساتھ ایک دوسرے پر رکھ کر انہیں دبایا تو وہ بری طرح کراہنے لگا، میں نے ٹانگیں چھوڑ دیں، گریبان سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ پھر ایک دم آگے بڑھ کر اسے کمر سے پکڑ کر رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میں نے کئی بار اسے دیوار سے ٹکرایا اور اس کے بعد گھما کر ایک بار پھر زمین پر دے مارا۔ مجھ پر بھی جنون سوار تھا۔ بہرحال میں نے اس کی خوب اچھی طرح مرمت کی اور وہ نڈھال ہو گیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ میں نے اسے ایک بار پھر گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے ایک اور تھپڑ رسید کر دیا اور دیوار سے لگا دیا۔ پھر میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ پستول کے علاوہ اس کے پاس صرف ایک پرس برآمد ہوا، جس میں کچھ کرنسی کاغذات وغیرہ تھے، میں نے وہ پرس اس کی جیب میں ڈال دیا اور اس بار گریبان سے پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا اور دوسرے جھٹکے میں، میں نے اسے اٹھا کر مسہری پر پھینک دیا۔ وہ بری طرح نڈھال ہو چکا تھا اور اپنے حواس کو قابو میں رکھنے کے لیے بار بار آنکھوں کو بند کر کے کھول رہا تھا اور سر جھٹک رہا تھا۔ میں نے جھک کر مسہری کے نیچے سے پستول نکالا۔ اس کا چیمبر چیک کیا اور پھر اسے جیب میں ڈال کر تھوڑے فاصلے پر پڑی ہوئی اس کرسی پر جا بیٹھا جس پر میں تھوڑی دیر پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مسہری پر بری طرح اپنے بدن کو جھٹکے دے رہا تھا۔ میں نے اسے سرد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ بریف کیس تلاش کرنے والے جب یہاں داخل ہوئے تھے تو انہوں نے ایک خواب آور

گیس استعمال کی تھی۔ جس سے میرے گھر کے تمام ملازم بے ہوش ہوگئے تھے۔ اسی بے ہوشی کے عالم میں وہ لوگ اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے اسی الماری سے بریف کیس حاصل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی میری بیوی کو بھی اٹھا کر لے گئے اور آج اسے گم ہوئے بہت وقت گزر چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان لوگوں نے یہ خاموشی کیوں اختیار کررکھی ہے۔ بریف کیس اگر انہیں مطلوب تھا تو اس کے ساتھ ساتھ وہ میری بیوی کو کیوں لے گئے اور اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، لیکن تم شاید اس بات کا صحیح جواب دے سکو۔''

وہ حیرانی سے اٹھ کر مسہری پر بیٹھ گیا، پھر وحشت زدہ انداز میں بولا۔

''وہ۔۔۔ وہ مسز ندیم کو بھی لے گئے۔ آہ! وہ تو بہت اچھی خاتون تھیں، لیکن۔۔۔''

''اس کے بعد اگر تم نے یہ کہا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں تو شاید اپنی زندگی کے بدترین نقصان سے دوچار ہوجاؤ۔'' اس نے ایک جھرجھری سی لی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''مسٹر ندیم! آپ مارشل آرٹس کے ماہر ہیں۔''

''اور کیا تم یہ مناسب سوال کررہے ہو۔ تم صرف اپنی ذات تک سوچ رہے ہو۔ حالانکہ تھوڑی دیر قبل تم نے یہ کہا تھا کہ تم نے اپنی ذات کو ترک کرکے اپنے فرض سے انصاف کیا ہے، کیا تمہارا فرض یہ ہی کہتا ہے کہ جو تمہارا محسن ہوا اس پر تم پستول نکال لو۔ میں اب بھی تم سے یہ ہی کہہ رہا ہوں کہ ایک پرسکون زندگی تھی ہماری، اس وقت ہم اپنے اس ٹرالر میں ایک پرسکون وقت گزار رہے تھے، جب وہاں کچھ ہنگامہ خیزی نظر آئی اور میں نے ان دو افراد کو دیکھا جن میں ایک انتہائی طاقت ور اور قومی ہیکل آدمی تھا اور دوسرا اس سے ذرا مختلف وہ مجھ سے الجھے تو میں نے ان کی اچھی خاصی مرمت کردی۔ وہ تو فرار ہوگئے، لیکن واپسی پہ مجھے تم ٹرالر کے نیچے ملے۔ یہ سب کچھ میرے لیے باعث دلچسپی نہیں تھا۔ بعد کی کہانی تو تمہیں معلوم ہے میں نہیں جانتا تھا کہ اس بریف کیس میں کیا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں مجھے اپنی بیوی سے محروم ہونا پڑا اور میں نہیں جانتا کہ وہ کس حال میں ہے اور وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے میری بیوی کو قتل کرکے کہیں پھینک دیا ہو۔ سمجھ رہے ہو نا تم مائی ڈیر! اب میں تمہیں ابدال شاہ کہہ کر مخاطب نہیں کروں گا، کیونکہ تم ایک جھوٹے اور فریبی انسان ہو، دغاباز، مکار اور نمک حرام ہو سمجھ رہے ہو نا میری بات، اٹھو مجھ پر حملہ کرو، تاکہ میں اپنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔''

اس کے چہرے پر سخت شرمندگی نظر آرہی تھی۔ اس نے گردن سینے پر جھکالی اور دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے لباس میں جذب ہورہے تھے، کچھ لمحوں کے بعد اس نے سر اٹھایا اور آستین سے خون صاف کرتے ہوئے بولا۔

''بھلا ان حالات کے بعد تم سے معافی مانگنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن اس کی تلافی اس شکل میں کرسکتا ہوں اور وہ شکل یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں ساری تفصیل بتادوں۔ حالانکہ ہم لوگوں کو ہدایت ہے کہ اگر ہم پر اتنا ہی برا وقت آپڑے تو ہم یہ زہریلا کیپسول کھا کر اپنی زندگی ختم کرلیں اور کسی کو اس بارے میں نہ بتائیں۔'' اس نے اپنی قمیص کے کالر کو الٹ کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ جس کا تھوڑا سا حصہ ابھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''تم چاہو تو اس کیپسول کو نکال کر دیکھ سکتے ہو۔ یہ آخری وقت کی بات ہے اور ہم بالکل مایوسی کے عالم میں اسے استعمال کرتے ہیں صرف اس لیے کہ ہم اپنی زبان کھولنے کے لیے مجبور نہ کردیے جائیں۔ لیکن میں اپنی حماقتوں کے ازالے کے لیے تمہیں وہ بتانا چاہتا ہوں جو حقیقت ہے اور اس بات کا تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا اور یہ درخواست بھی کرتا ہوں کہ میری اس کہانی کو غلط نہ

سمجھنا۔

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

”یہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق کون سے ملک سے ہے، ابدال شاہ ہی میرا اصل نام ہے، میرے پرس میں تم میرا کارڈ دیکھ سکتے ہو۔ میرا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے ہے اور میں ایک سیکرٹ ایجنٹ ہوں کچھ عرصے پہلے وکٹر گوم نامی ایک خطرناک آدمی ہمارے وطن پہنچا تھا۔ اس کا تعلق اسرائیلی سیکرٹ سروس سے ہے۔ اس نے وہاں ایک وسیع جال پھیلا کر کچھ لوگوں کو اپنے شکنجے میں کسا اور اس کے بعد ہمارے ایک انتہائی اہم راز کو لے اڑا، وہ راز یوں سمجھ لو کہ ہمارے وطن کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمہیں علم ہے کہ ہمارا چھوٹا سا ملک لاتعداد بڑے دشمنوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم دنیا بھر میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ۔ ان لوگوں کے لیے بڑا تکلیف دہ مرحلہ ہے اور بہت سی قومیں مل کر یہ سوچ رہی ہیں کہ ہم ایک مکمل ایٹمی قوت ہیں یا نہیں۔ اگر اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنی برتری کا اعلان کر سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سے خوف زدہ ہے، نا صرف وہ بلکہ اسرائیل بھی، کیونکہ وہ لوگ یہ جانتے ہیں ہم اگر ایک مکمل ایٹمی طاقت بن گئے تو اپنے چھوٹے سے وجود کے باوجود بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر سکتے ہیں۔ مسٹر ندیم اور کچھ نہیں تو کم از کم آپ کا نام ندیم ہے۔ آپ جہاں سے بھی تعلق رکھتے ہیں، وہ ایک الگ بات ہے، لیکن یہ نام ہمارا ہے۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں اور اس احساس کو دل سے نہیں نکال پا رہا کہ میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ہے۔ درحقیقت میں بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے ایک بہترین سزا ملی ہے اور میں اپنے آپ کو اس سزا کا مستحق سمجھتا ہوں اور شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ خوش بھی ہوں، کیونکہ اپنی دانست میں، میں اپنے آپ کو بہت تیس مار خان سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت میں اپنی شکست کا اعتراف کر رہا ہوں مجھے آسانی سے زیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میں اپنی شکست کا اعتراف کر رہا ہوں مجھے آسانی سے زیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن تم یہ کر چکے ہو۔ بس یہ سارا معاملہ ہے۔ میں اور میری ایک ٹیم ہے جو وکٹر گوم کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہے اور یہاں ہم نے انہیں گھیر لیا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ ہم وکٹر گوم کے ٹھکانے تک جا پہنچے اور میں نے وہ فائل حاصل کر لی، جسے وکٹر گوم ہمارے وطن سے چرا کر لایا تھا، لیکن تم یہ بات جانتے ہو کہ بہرحال یہ ہمارا وطن نہیں ہے۔ وکٹر گوم کو یہاں کچھ خصوصی مراعات حاصل ہو گئیں، جس کی وجہ سے ہم لوگ یہ فائل لے کر یہاں سے ابھی تک نہیں نکل سکے ہیں اور ہمارے لیے اسے پوشیدہ رکھنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ اس وقت میں اس فائل سمیت وہیں ایک ٹرالر میں مقیم تھا اور ہم انتظار کر رہے تھے کہ ہمارے لیے حالات بہتر ہوں تو ہم یہاں سے نکل جائیں۔ لیکن ان لوگوں نے اس طرح ناکہ بندی کر رکھی تھی کہ ہماری ہر کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی اور ہم بمشکل تمام اپنے آپ کو چھپائے چھپائے پھر رہے تھے۔ ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا کہ ہم یہاں سے نکل جائیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے شاید کسی بھی شکل میں مقامی حکومت کی مدد بھی حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے وقت بہت تنگ ہو گیا ہے۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم جس طرح بھی ممکن ہو سکے، یہاں سے نکل جائیں اور پھر فائل کی حفاظت کرتے ہوئے مجھے دوبارہ تم تک پہنچنا پڑا، اس وقت ان لوگوں نے مجھے بری طرح گھیر لیا تھا۔ جب اتفاقیہ طور پر تم مجھے دوبارہ نظر آ گئے اور میں نے فائل تمہارے حوالے کر دی مائی ڈیر مسٹر ندیم۔ میں بہت مطمئن ہو گیا تھا کہ فائل ایک محفوظ جگہ پہنچ چکی ہے اور اس کے بعد میں ان لوگوں کو مسلسل ڈاج دیتا رہا تھا۔

اگر میری اس حرکت پر معافی کی کوئی گنجائش ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ ورنہ ایک غلیظ آدمی کی حیثیت

سے مجھے یاد کرنا۔ جہاں تک مسز ندیم کا تعلق ہے تو میں اس وقت تک یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا جب تک کہ مسز ندیم کو دوبارہ ان سے حاصل کر کے تمہارے پاس نہ پہنچا دوں۔ اگر اس سلسلے میں میری زندگی بھی چلی جائے تو مجھے فکر نہ ہوگی۔ بات اپنے فرض کی تھی میں نے، یہ ایک حقیقت ہے کہ میں فرض کو اپنی زندگی سے کہیں زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں اور میں نے اپنی ذات کو اپنے فرض پر قربان کر دیا ہے۔ لیکن اس فرض کے ساتھ ساتھ ہی اب ایک اور فرض بھی مجھ پر عائد ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ مسز ندیم کو تمہارے پاس واپس پہنچاؤں۔ وہ بہت اچھی خاتون تھیں اور میں انہیں پورے اعتماد کے ساتھ ایک بہن کا درجہ دے سکتا ہوں۔ میں پھر ایک بار تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھے معاف کیا جائے تو خاموشی سے مجھے گولی مار دو، کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں اس وقت یہاں موجود ہوں اور اگر مجھے موقع دو تو پھر یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔''

اس کی باتوں نے مجھے کافی نارمل کر دیا تھا جو کچھ اس نے کہا تھا۔ اس کا حملہ اسے میں دے چکا تھا، لیکن اب جو کچھ اس نے بتایا تھا، اس نے میرے ذہن میں ایک بار پھر وطن کی یاد تازہ کر دی۔ اپنے وطن کے لیے تو میں نے زندگی بھر صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسرائیلی ایجنٹ میرے وطن کے خلاف کام کریں اور میں خاموش بیٹھا رہوں، لیکن اسے جو کچھ بھی کہنا تھا سوچ سمجھ کر کہنا تھا۔ میں نے حالات پر غور کیا، پھر اس سے کہا۔

''ابدال شاہ۔۔۔! یہ ہی ہے تمہارا نام؟''

''ہاں۔''

''شاہ تمہاری ٹیم کے کتنے افراد یہاں آئے ہوئے ہیں؟''

''ہم پانچ ہیں۔''

''باقی چار تمہارے ماتحت ہیں یا تم ان کے تحت ہو؟''

''میں اس گروپ کا انچارج ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تمہیں یہاں گھیر لیا گیا ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا مقامی پولیس نے اب تک تم سے کچھ باز پرس کی ہے یا تمہارے خلاف کوئی ایسا عمل جس سے تمہیں مجرم قرار دیا گیا ہو؟''

''نہیں ہم لوگ یہاں باقاعدہ مکمل کاغذات کے ساتھ پہنچے ہیں۔ لیکن خفیہ طور پر اگر اسرائیلی ایجنٹوں نے مقامی انتظامیہ کی مدد حاصل کر لی ہو تو ہم نہیں کہہ سکتے۔''

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب یہ کہ ہمیں ہر جگہ سے یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ کچھ لوگوں کی تلاش کی جا رہی ہے لیکن کیوں اس کا کوئی جواب ہمیں نہیں حاصل ہو سکا۔''

''ہونہہ! صرف انگلینڈ میں یہ کیفیت ہے یا اور بھی جگہوں پر۔''

''نہیں ہم صرف یہاں کی بات کر رہے ہیں۔''

''تو اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔'' اس نے غمگین لہجے میں کہا۔

''وہ چاروں ماتحت کہاں ہیں؟''

''میں نے انہیں محفوظ کر دیا ہے اور تنہا ہی یہ کام کر رہا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر میں مارا جاؤں تو کم از کم وہ ہماری حکومت کو صحیح تفصیل سے آگاہ تو کر دیں۔ میں انہیں چھپائے ہوئے ہوں اور ایسا کوئی عمل نہیں کر رہا جس سے وہ منظر عام پر آ سکیں، اور اس وقت وہ شاید وکٹر گوم کی نگاہوں سے بھی محفوظ ہیں۔ میں نے انہیں بالکل ہی الگ تھلگ کر دیا ہے اور اس معاملے میں انہیں ملوث نہیں کرنا چاہتا کیونکہ صورت حال بڑی سنگین ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اب مجھے آپ یہ بتائیے ابدال شاہ کاغذات تو اب ان کے پاس پہنچ گئے۔ اب آپ کیا کریں گے۔۔۔'' وہ سوچتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''بات اصل میں یہ نہیں ہے کہ میں اس مشن میں ناکام ہوگیا۔ اصل میں کام کرنے کے دوران کبھی کبھی ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ ناکامی ایسی ہے کہ جس نے میرے سینے میں آگ لگادی ہے آپ نہیں سمجھ سکتے مسٹر ندیم کہ وکٹر گوم سے وہ کاغذات حاصل کرنا ایسا ناممکن عمل تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، میں کامیابی حاصل کر کے ناکامی سے دوچار ہوا ہوں وکٹر گوم دیوانہ ہوگیا ہے اور اس کے ساتھی پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ مجھے اتنی گولیاں ماردیں کہ میرے پورے بدن میں سوراخ ہوجائیں تو مجھے اس کا دکھ نہیں ہوگا جتنا دکھ مجھے ان کاغذات کے نکل جانے سے ہوا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کہاں میری غلطی ہے۔ اصل میں ہم لوگ ایسے مشکل حالات کا شکار ہوگئے تھے کہ ہمارے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ میں اس فائل کو کسی محفوظ جگہ پہنچانا چاہتا تھا، لیکن پتا نہیں وکٹر گوم کوئی جادوئی قوت رکھتا ہے یا کس حیثیت کا مالک ہے وہ مسلسل میرے پیچھے لگا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یہ کاغذات کہاں پوشیدہ کروں اور اب۔ اب۔'' اس کی آواز رندھ گئی چند لمحات خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''میں فیصلہ کرچکا ہوں کہ میں اپنے وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ ایک ناکام شخصیت کی حیثیت سے میں اپنے وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ میں خودکشی کرلوں گا اور واقعی مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رہا ہے۔'' وہ انتہائی جذباتی ہوگیا تھا اور میں اس کے چہرے سے اس کی کیفیات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ بہرحال کافی دیر تک اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی، پھر بولا۔

''اور اب۔۔۔ اب میں اس شریف عورت کے لیے غم زدہ ہوں۔ مجھے مشورہ دو۔۔۔ ندیم مجھے مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری ذہنی کیفیت درست نہیں ہوگی۔ تم بلاوجہ ہی اس مشکل کا شکار ہوگئے۔ میرے دوست مجھے معاف کردینا۔ اس کے لیے اگر میری زندگی کی قیمت پر بھی مسز ندیم واپس مل سکیں تو باخدا مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کاغذات دوبارہ حاصل کرنے کے بعد بھی آپ انہیں یہاں سے منتقل کرنے میں ناکام رہیں گے۔''

''میں نہیں جانتا کہ وقت میرے ساتھ یہ مذاق کیوں کررہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک طرح سے میں ایک مشکل صورت حال میں گھر گیا ہوں۔''

''آپ کے چاروں ساتھی کہاں ہیں۔'' میں نے سوال کیا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''کبھی نہیں بتاؤں گا کسی قیمت پر نہیں بتاؤں گا۔''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کو یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں تو۔۔۔''

''نہیں میں ابھی ہار نہیں مان رہا۔ وکٹر گوم کو میری تلاش تھی اور اب مجھے اس کی تلاش ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی مسز ندیم کی بھی، لیکن میرا خیال ہے کہ کاغذات کے حصول کے بعد ان کا مسز ندیم کو ساتھ رکھنا ایک عجیب سا عمل ہے۔''

''تم اب یہاں سے کہاں جاؤ گے۔'' میں نے ایک بالکل ہی الگ سوال کیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب یہ کہ جیسا تم نے کہا تمہارے ٹھکانے تو گم ہوچکے ہیں۔ تم یہاں سے کہاں جاؤ گے؟''

''کیا کہا جاسکتا ہے، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا بس۔''

''ان دنوں تمہارا قیام کہاں ہے؟''

''کہیں بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''جہاں نیند آتی ہے وہاں اپنے لیے کوئی نہ کوئی ٹھکانہ تلاش کرلیتا ہوں، ایسے گوروں کے برآمدوں میں جو بند پڑے ہوتے ہیں۔ مجھے ایسی ہی جگہوں پر رہنا پڑتا ہے۔''

''اور اگر میں تمہیں پناہ دینا چاہتا ہوں تو۔۔۔''

''یہ جگہ بھی اب مخدوش ہوچکی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب مجھے کہیں پناہ ملے گی۔''

''اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس وقت کے بعد سے تم میرے ساتھ وقت گزارو۔''

''اب تو میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''جو کچھ ہوچکا ہے، اس کے بعد بھی کیا اب اس کی گنجائش ہے۔''

''ہاں ہے۔''

''میں مزید شرمندہ نہیں ہونا چاہتا، میں نے تم پر پستول نکالا تھا اور تم نے مجھے اگر تم۔۔۔ تم۔۔۔ ڈیر ندیم تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں، کیونکہ معمولی شخص ایسا نہیں کرسکتا جیسے تم نے کیا۔''

''دیکھو۔۔۔ فی الحال اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے وہ چاروں ساتھی محفوظ رہیں تو انہیں ان کی جگہ رہنے دو، لیکن تمہیں میرے ساتھ وقت گزارنا ہوگا۔''

''مگر کیوں؟ ان تمام مشکلات سے گزرنے کے باوجود تم میرے ساتھ یہ اچھا عمل کیوں کرنا چاہتے ہو۔''

''اس کے لیے میرا وطن عزیز بھی وہی ہے جو تمہارا۔''

''پاکستانی ہو؟'' وہ چونک کر بولا۔

''ہاں۔''

''کیا واقعی؟''

''ہاں۔''

''مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتانا پسند کروگے؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس۔۔۔''

''مگر جہاں تک تمہارے بارے میں میری معلومات ہیں تو تم یہاں ایک بڑے بحیثیت انسان ہو۔''

''میرے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں تم نے؟''

''ہاں۔۔۔''

''کیوں؟''

''بس اپنے محسن کی حیثیت سے۔'' اس نے جواب دیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''بس اپنے محسن کی حیثیت سے؟'' اس نے جواب دیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''لیکن تم میرے پاس ہی قیام کروگے اور اگر تم نے اس سے انحراف کیا تو یوں سمجھ لو کہ پھر میرے اور تمہارے درمیان باقاعدہ دشمنی کا آغاز ہوجائے گا اور تم ایک اور دشمن پال لوگے۔'' وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''لیکن تمہیں تکلیف ہوگی۔ پہلے ہی میں تمہیں اتنا پریشان کرچکا ہوں اور پھر۔۔۔ پھر میں تم سے شرمندہ بھی ہوں۔''

''ہر احمقانہ خیال دل سے نکال دو اور اب تم میرے ساتھ ہی قیام کرو۔ میں تم سے سختی سے بھی یہ بات کہہ جاتا ہوں۔''

وہ سوچتا رہا، پھر اس نے کہا۔

''تعجب کی بات ہے۔ لیکن پہلے تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ میرے اور تمہارے درمیان وطن کا رشتہ بھی ہے۔''

''بس جو کچھ میں نے بتایا یا نہیں بتایا وہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن اب تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔''

اس نے گردن جھکالی، پھر آہستہ سے بولا۔

''جیسا کہ میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس لیے اور پھر وہ لوگ یہاں

تم سے ضرور رجوع کریں گے۔ پتا تو چلنا چاہیے کہ آخر مسز ندیم کو ان لوگوں نے کیوں اپنے قبضے میں کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے وہ تم سے رابطہ قائم کریں۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور پھر چونک کر بولا۔

''تو کیا تم نے میری بات مان لی ہے؟''

''ہاں میرے دوست تمہارا اگر حکم ہے تو میں اس سے انکار نہیں کرسکتا۔''

تب میں اس کے لیے ایک محفوظ کمرے میں انتظام کردیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جگہ اس حساب سے غیر محفوظ ہے کہ وہ لوگ یہاں تک پہنچ سکے ہیں اور ان کے لیے دوبارہ یہاں پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔ الیاس بیگ سے کہہ کر یہاں انتہائی معقول انتظامات کرواسکتا تھا۔ لیکن وہ بھی ابھی غیر مناسب تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم کریں اور مجھے اپنا موقف بتائیں یہ اندازہ تو مجھے ہوگیا تھا کہ انہیں بریف کیس میں موجود فائل سے سادہ اوراق ملے ہوں گے اور ان کی کیفیت خراب ہوگئی ہوگی۔ بہرحال مونی کے لیے دل میں جو کیفیت تھی، اسے شاید میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکوں۔ بے چاری مونی۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں جو طوفان امڈ رہا تھا وہ یہ بھی تھا کہ بہرحال میرے وطن کا معاملہ ہے۔ اہل وطن چاہے مجھے اپنے آپ سے کتنا ہی دور کردیں۔ لیکن میں وطن کی آگ کو دل سے دور نہیں کرسکتا تھا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے وطن کے لیے وقف کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال میں نے محسوس کیا کہ ابدال شاہ بھی میرے لیے افسردہ ہے، کافی وقت گزر گیا۔ اس طرف سے حیرت انگیز، خاموشی اختیار کرلی گئی تھی۔ اس خاموشی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال ذہن کو ایک سمت کرنا ضروری تھا۔ اگر اسی طرح دکھ میں مبتلا رہا تو کام کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ اس وقت ابدال شاہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

''میرے اور آپ کے درمیان جو ایک چھوٹی سی غلط فہمی ہوگئی تھی مسٹر ندیم شاہد میں اس کے لیے اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرسکوں، آپ یقین کیجیے میں مسز ندیم کے لیے سخت غم زدہ ہوں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں، ان بدبختوں کو کاغذات مل گئے ہیں۔ اصولی طور پر انہیں مسز ندیم سے کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔ وہ انہیں کیوں رہا نہیں کردیتے۔''

''اس لیے میرے دوست کہ انہیں کاغذات نہیں مل سکے۔'' میں نے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔''

''ہاں! کاغذات انہیں نہیں مل سکے۔''

''لل۔۔۔ لیکن آپ۔۔۔ آپ کہتے ہیں۔''

''ہاں میں نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں ہے، وہ فائل لے گئے ہیں، لیکن اس بریف کیس کے اندر رکھے ہوئے فائل میں انہیں صرف سادہ پیپر ملے ہوں گے۔''

''کیوں؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اس لیے کہ اصل کاغذات اب میرے پاس ہیں۔''

وہ چکرا گیا۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، کچھ نہ بولا اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں۔۔۔ وہ کاغذات میرے پاس محفوظ ہیں۔''

''لیکن مسٹر ندیم آپ نے۔۔۔''

''ہاں ظاہر ہے میں تمہیں فوری طور پر ان کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے ان کاغذات کو اس فائل سے نکال کر سادہ کاغذ اس میں لگا دیے تھے اور بریف کیس اسی طرح رکھ دیا۔ کرسٹل بریف کیس کھولنا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔''

''لیکن۔۔۔ اف میرے خدا۔۔۔ اف۔۔۔ اف۔۔۔ اف۔'' اسے شاید بولنے کے لیے الفاظ

نہیں مل رہے تھے۔

''اور ہوسکتا ہے انہوں نے اس جنون میں مونی کو قتل کردیا ہو۔''

''آہ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں کہیں۔۔۔ لیکن میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں، مسٹر ندیم میرے ذہن سے نہ کھیلیے۔ آپ یقین کریں اب میں آپ کے دکھ کو خود سے جدا نہیں سمجھتا اور شدید افسردہ ہوں ان سارے معاملات کے لیے۔''

''افسردگی کسی چیز کا حل نہیں ہوتی۔''

''لیکن وہ کاغذات آپ میرا مطلب ہے۔''

''تھوڑا سا انتظار کرلو، وہ کاغذات تمہیں واپس مل جائیں گے اور میں کوشش کروں گا کہ تمہیں یہاں سے نکال دوں۔''

''اور پھر آپ۔۔۔؟''

''اللہ مالک ہے۔ میں آنے والے وقت کا انتظار کروں گا۔''

''تو پھر اب۔۔۔؟''

''نہیں میرا معاملہ میں خود دیکھوں گا کہ کیا کرسکتا ہوں۔ ہاں ایک بات بتاؤ تم نے سمندر کے مختصر راستے سے فرانس نکل جانے کی کوشش نہیں کی؟''

''ہر کوشش کرلی ہے ہم نے، لیکن انہیں چاروں طرف سے مستعد پایا اور ہم ان تمام کوششوں میں مکمل طور سے ناکام رہے ہیں۔''

''اگر تمہیں فرانس پہنچا دیا جائے تو؟''

''مشکل ہوگا، بالکل مشکل ہوگا۔''

''میری بات کا جواب دو ابدال شاہ اگر تمہیں فرانس پہنچا دیا جائے تو؟''

''میں تمام صورت حال سنبھال لوں گا مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

''کیوں کیا وہاں ایسے انتظامات ہیں؟''

''ہاں ہیں۔''

''کیا انتظامات؟''

''کچھ ایسے پرائیویٹ ذریعے جن سے میں اپنا یہ کام کرسکتا ہوں۔ لیکن آپ یقین کرلیں کہ۔۔۔''

''میں کسی بات پر یقین نہیں کررہا، بس تھوڑا سا مسئلہ ہے ذرا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی تمام کیفیت معلوم ہوجائے، لیکن ایک بات سنو جو قیمتی سرمایہ لے کر تم یہاں سے جاؤ گے وہ اس قدر قیمتی ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے زندگی کی بازی لگائی جاسکتی ہے۔ کیا تم اسے اطمینان سے اپنے وطن لے جاسکو گے؟''

''آخری حد تک کوششیں کروں گا۔''

''نہیں مسٹر شاہ۔۔۔! بات کوشش سے ختم نہیں ہوجاتی۔ مجھے ایک یقینی منصوبہ چاہیے جس کے تحت تم یہ کہہ سکو کہ کاغذات جو درحقیقت تمہاری میری اور ان چاروں افراد کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہیں، کیونکہ ان میں میرے وطن کا سرمایہ میرے وطن کا مستقبل چھپا ہوا تھا۔''

''یہ ایک طویل کہانی ہے اور ایسی کہ سنائی نہیں جاسکتی۔''

''لیکن آپ کے الفاظ سے وطن کی محبت کا شدید احساس ہوتا ہے۔''

''ہاں۔۔۔ میں محبِ وطن ہوں اور مادرِ وطن کو اپنی ماں کی طرح چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک تو پھر آپ۔۔۔''

''بس میں یہ ہی کہہ رہا تھا تم سے کہ تھوڑی سی معلومات حاصل کرلوں۔''

''بہرحال!'' اس کے بعد وہ خاموش ہوگیا تھا اور میں بھی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

پھر وہ فون مجھے موصول ہوا جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔ ابدال شاہ اس وقت میرے پاس ہی موجود تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، الیاس بیگ ہوسکتا ہے یا پھر وہ لوگ، میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''ہیلو!''

''ہیلو مسٹر ندیم ہم آپ کے دوست بول رہے ہیں۔''

میں نے ابدل شاہ کو اشارہ کیا اور ہاتھ کے

اشارے سے اس سے کہا کہ دوسرے کمرے میں جا کر فون سنے۔ ابدل شاہ پھرتی سے باہر نکل گیا تھا۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔

''کہو کیسے مزاج ہیں۔ ویسے سب سے پہلے تمہارے اطمینان کے لیے تمہیں یہ بتا دیا جائے کہ مسز ندیم بخیریت ہیں اور ہم ان کے ساتھ انتہائی عزت کا سلوک کر رہے ہیں کیونکہ ابھی ہمارے اور تمہارے درمیان ایسا رشتہ باقی ہے، کیا ان سے بات کرنا پسند کرو گے؟''

''اگر تم مناسب سمجھو۔''

''ہم ریسیور انہیں دے رہے ہیں اور ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

میں چند لمحے انتظار کرتا رہا، پھر مجھے موہنی کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو ندیم!''

''ہیلو موہنی۔۔۔!'' میں نے پتھریلے لہجے میں کہا۔

''ویری گڈ۔۔۔'' میں تم سے اس لہجے کی توقع رکھتی تھی۔

''تم خیریت سے ہو۔''

''ہاں! یہ مسخرے میرے ساتھ بڑا پر ادب سلوک کر رہے ہیں۔ کون ہیں، کیا ہیں، بالکل نہیں بتا سکتی اور بتا بھی سکتی تو نہ بتاتی، کیونکہ ظاہر ہے یہ اس کی اجازت نہ دیتے۔''

''موہنی! وقت ایک بار پھر ہم سے امتحان چاہتا ہے۔''

''اور ہم وقت کو ایسا بھرپور امتحان دیں گے کہ وقت بھی ششدر رہ جائے۔'' موہنی کی آواز سنائی دی۔

''شکریہ موہنی! ویسے ہم نے تو ہمیشہ ہی وقت سے سمجھوتہ کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر ہماری تقدیر میں جدائی لکھی ہے تو میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت سے تعاون کرنا چاہیے۔''

''تم بالکل بے فکر رہو۔ زندگی کے جو لمحات تمہاری قربت میں مجھے مل گئے ہیں ندیم! وہ میرے لیے ابتدا اور انتہا ہیں۔''

پھر شاید موہنی سے ریسیور چھین لیا گیا۔

''یہ تو فون پر عشقیہ گفتگو شروع ہو گئی میرے دوست! ہم تمہیں صرف تمہاری مسز کی آواز سنانا چاہتے تھے اور تم نے باقاعدہ اپنی کہانی شروع کر دی۔ خیر مسز نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ ہم کتنے شریف لوگ ہیں اور ان کے ساتھ کس قدر بہتر سلوک کر رہے ہیں۔ ویسے تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہم تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن میرے دوست یہ نہیں سمجھ آیا کہ تم اس سارے معاملے میں کیوں ملوث ہو گئے۔ تم نے واقعی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ان کاغذات سے تمہیں کیا دلچسپی ہے ہم نہیں جانتے۔ پہلے ہمیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن اب مجھے پتا چل چکا ہے کہ تم شہزاد ہو، وہ شہزاد جو بہت بڑی حیثیت کا مالک ہے یہاں بھی تم جس حیثیت سے قیام پذیر ہو اس کا ہمیں علم ہے تم ہماری معلومات کی داد ضرور دینا کہ ہم تمہارے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ تمہارا ایک نام ندیم بھی ہے۔ لیکن شہزاد جو ایک بہت عجیب و غریب شخصیت کا مالک ہے اور جس کے ساتھ اس کے اہل وطن نے بدترین سلوک کیا ہے اور وہ ایک طویل عرصے سے دربدر ہے بلکہ اسے بحالت مجبوری اپنی موت کا اعلان کرنا پڑا کیونکہ اس کے بعد اس کا وطن اسے زندگی دینے کو تیار نہیں تھا اور اپنی موت کا اعلان کرنے کے بعد تم اب یہاں لندن میں روپوش ہو، شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ انٹرپول ایک طویل عرصے سے تمہارے چکر میں لگی رہی ہے۔ بہرحال مائی ڈیئر شہزاد اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم نے بہت عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن کیوں۔ ایک ایسے ملک کے لیے تم نے اپنے لیے خطرہ مول کیوں لیا جو تمہارا دشمن ہے اس کے علاوہ مائی ڈیئر شہزاد یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم ان کاغذات کا کیا کرو گے۔ اگر تم

ان کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہو تو ہم خوشی سے تم سے اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے دوستو! کہ تم نے میرے بارے میں زبردست معلومات حاصل کی ہیں اور واقعی یہ تمہارا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن اب جب تم یہ جان چکے ہو کہ میں کون ہوں تو خود بھی بہتر سمجھتے ہو گے کہ میری بیوی مجھے واپس کر دو ورنہ اس کے بعد کیا ہو گا تم نہیں جانتے، شہزاد نے بقول تمہارے اپنے وطن سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود کو گہری نیند سلا دیا ہے کیا بہتر نہیں ہو گا کہ تم شہزاد کو نہ جگاؤ۔''

جواب میں دوسری جانب سے قہقہہ سنائی دیا تھا۔ پھر ادھر سے کہا گیا۔

''آرگنائزیشن کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا تمہاری زندگی کی خبر اس کے لیے خوش خبری نہیں ہو گی۔''

''کر سکتے ہو۔ جو دل چاہے کر سکتے ہو۔ جنگ کا آغاز کرو گے تو اس کا نتیجہ بھی بھگتنا ہو گا۔ شکست تو کسی نہ کسی کو ہونی ہی ہے تمہیں یا مجھے۔''

''تمہیں صرف تمہیں۔''

''آنے والا وقت اس کا فیصلہ کرے گا، میری طرف سے ہر طرح کی آزادی ہے۔ ویسے تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ ابدال شاہ اب میرے پاس ہے۔''

میرے ان الفاظ پر چند لمحات کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جھوٹ بول رہے ہو۔''

''گفتگو کرو۔ ابدل شاہ بات کرو ان لوگوں سے۔'' میں نے کہا۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت درست نہیں تھی بس ایک جنون سا دل و دماغ پر سوار تھا اور اس جنون کے عالم میں میں بہت کچھ فراموش کر چکا تھا۔ ابدال شاہ نے کہا۔

''ہیلو میرے دشمنو! کہو تمہارے کیسے حال ہیں۔ ویسے وکٹر گوم نے وہی کیا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ بزدل ہے اور ایک ایسی قوم کا انسان ہے، جو ہر طرح کے حربے استعمال کر سکتی ہے۔ کاغذات کی جگہ تمہیں سادہ کاغذ ملے ہوں گے اور تمہاری بہت بڑی آرزو تشنہ رہ گئی ہو گی۔ اگر تم وکٹر گوم نہیں ہو تو پھر وکٹر گوم کو یہ پیغام دے دینا کہ وہ زندگی بھر اب ان کاغذات کے لیے ترستا رہے گا۔ یہ اسے حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ میری بات مانو اس عورت کو رہا کر دو جس کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مردوں کی طرح میدان آ کر جنگ کرو اور فیصلہ کرو۔''

''بکواس مت کر کتے ایک بار تو سامنے آ جائے تو ہم تجھے مزا چکھا دیں گے۔''

''اوہو مسٹر وکٹر گوم، آپ ہی ہیں۔ میں آپ کی آواز پہچان چکا ہوں۔ آپ جیسا بزدل میرے مقابلے پر ہے اپنی قوت اور یہاں اپنے اختیارات سے کام لے کر تم نے جو کچھ کر لیا ہے بس وہی تمہاری اوقات ہے۔ لیکن تم دیکھ لو میں نے کس طرح تمہارے منہ میں ہاتھ ڈال کر وہ نکلوا لیا جو ہمارا اپنا تھا۔''

''تم بکواس بند کرو۔ میں تمہیں دیکھ لوں گا، دیکھ لوں گا تم لوگ کہاں تک جا سکتے ہو۔ ٹیلی فون اسے دو۔''

''ہاں میں بول رہا ہوں۔''

''سنو مائی ڈیئر شہزاد، یا مائی ڈیئر ندیم۔ چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے رہا ہوں میں تمہیں ہر آٹھ گھنٹے کے بعد تم سے رابطہ کیا جائے گا اور یہ پوچھا جائے گا کہ اپنے اس کتے اور کاغذات کو ہمارے حوالے کرتے ہو یا نہیں۔ چوبیس گھنٹے کے بعد تمہاری بیوی کو قتل کر دیا جائے گا۔''

''میری بیوی تو قتل ہو چکی ہے میرے دوست اور تم نے ٹیلی فون پر اس کی گفتگو بھی سنی ہو گی۔ ہم لوگوں کو وطن کے نام پر قتل ہونا ہر طرح کی موت سے

زیادہ عزیز ہے اور کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

لیکن جواب میں دوسری طرف سے ایک غرائی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ ''ہر آٹھ گھنٹے کے بعد اور تیسری بار گفتگو کر کے تمہیں تمہاری بیوی کی لاش بھجوادی جائے گی۔''

''اور اس کے بعد۔۔۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ ٹیلی فون کا ریسیور رکھنے کے بعد میں نے جلدی سے دوسرے کمرے میں جا کر ابدال شاہ کو تیار ہونے کے لیے کہا۔

''کک۔کیا مطلب۔۔۔''

''چلو ہم نکل رہے ہیں یہاں سے مجھے اسی ٹیلی فون کا انتظار تھا۔''

''لل۔۔۔لیکن۔۔؟''

''کچھ نہیں مائی ڈیئر! آؤ ہمیں تھوڑا سا فاصلہ طے کرنا ہوگا اور اس کے بعد ہمارے پاس ایک اور محفوظ جگہ ہے۔ یہ جگہ اب جتنی خطرناک ہو چکی ہے اس کا تم خود بھی اندازہ لگا چکے ہو۔'' اپنی رہائش گاہ کے عقبی حصے سے نکل کر میں چاروں طرف سے محتاط ہو کر ایک چوڑی سڑک پر پہنچا۔ وہاں سے ایک ٹیکسی کر کے ہم شہری آبادی کی جانب چل پڑے۔ میں نے پوری طرح حالات پر نگاہ رکھی تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ یہ ہی ہونا چاہیے تھا، ان لوگوں کو میرے جگہ بدلنے کا علم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ٹیکسی نے ہمیں شہری علاقے میں اتار دیا۔ پھر وہاں سے کافی دور تک ہم نے پیدل سفر کیا اس کے بعد ایک اور ٹیکسی لے کر چل پڑے تھے۔ تیسری ٹیکسی نے ہمیں ہماری منزل یعنی اس فلیٹ کے علاقے میں اتار دیا جو میرا اپنا تھا اور جس کی چابی میں نے ساتھ لے لی تھی کیونکہ عموماً یہ فلیٹ خالی ہی رہتا تھا اور ہم نے یہاں کسی ملازم کو بھی نہیں رکھا تھا تاکہ ہمارے راز خفیہ رہیں۔ میں اور ابدال شاہ لفٹ کے ذریعے اپنی منزل پر پہنچے اور پھر میں نے اپنے شان دار فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ ابدال شاہ نے حیران نگاہوں سے فلیٹ کا جائزہ لیا تھا اس کے چہرے پر تحسین کے آثار ابھر آئے تھے۔

''اتنا خوب صورت فلیٹ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''آرام سے بیٹھو۔ یہ جگہ ابھی کسی کے علم میں نہیں آئی ہوگی۔''

''پھر اب کیا پروگرام ہے۔۔'' اس نے کہا۔

''میں تم لوگوں کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ، ایک خاص آدمی ہے میرا جسے میں یہاں بلا رہا ہوں۔ ویسے یہاں بہت سے انتظامات ہیں۔ میں تمہاری تمہارے وطن بھی بات کرا سکتا ہوں۔ میرے پاس اس کا ذریعہ موجود ہے۔'' میں نے کہا۔ ایزی ہارڈ و نے جو کچھ میرے لیے فراہم کیا تھا وہ بڑا دور رس تھا اور اس کی نگاہوں نے بہت دور تک دیکھا تھا، بہر حال وہ جو چیز بھی میں اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ پھر یہاں تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد میں نے الیاس بیگ سے رابطہ قائم کیا۔

''سر!'' الیاس بیگ میری آواز پہچان کر بولا۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''حکم دیجیے کہاں حاضری دوں؟''

''فلیٹ پر آجاؤ۔''

''میں پہنچ رہا ہوں۔ کسی قسم کا کوئی مشکل مرحلہ۔''

''ابھی نہیں۔ آنے والے وقت میں ہو سکتا ہے۔''

''میں حاضر ہو رہا ہوں۔''

ٹیلی فون بند کرنے کے بعد میں نے ابدال شاہ کو دیکھا اور کہا۔

''چائے وغیرہ پینا چاہتے ہو تو خود تیار کرنا ہوگی۔''

''میں تیار کر کے لاتا ہوں۔'' وہ خوشی خوشی باہر نکل گیا۔ وہ سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا کیا عہدہ تھا میں نے اس بارے میں اس سے کوئی

سوال نہیں کیا تھا۔ نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ ویسے اس کی شخصیت سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک اچھے عہدے کا مالک ہوگا لیکن اس وقت جو صورت حال چل رہی تھی اس میں اس کے عہدے کا کوئی خیال نہیں کرسکتا تھا۔ بہرحال میں کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا، اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک خوب صورت ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی کہنے لگا۔

''بڑا شان دار کچن ہے اور یوں لگتا ہے جیسے یہاں کوئی باقاعدہ رہتا ہو ہر چیز بھری ہوئی ہے ویسے مسٹر ندیم یہ فلیٹ آپ کا اپنا ہے؟''

''ہاں۔ یہ ہمارا ہی تھا، شہری آبادی میں اگر رہنا چاہتے تھے تو یہاں آجاتے تھے۔ ویسے ہم دونوں ہی کو اس رہائش گاہ کی زندگی زیادہ پسند تھی۔'' میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اور وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں مسٹر ندیم۔'' اس نے اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی۔ چائے کے کچھ زیادہ کپ لے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ آپ نے کسی کو بلایا ہے، مہمان کے لیے بھی انتظام کرکے آیا ہوں۔''

''شکریہ اور چائے بنانے کا بھی۔'' میں نے کہا۔ وہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ لیتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''مسٹر ندیم، ذاتی سی بات ہے لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اب میرا اور آپ کا تنا گہرا تعلق ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی ہیچ نہیں ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ شاہ!''

''یہ نام جو میرے کانوں تک پہنچا ہے یعنی شہزاد اور آپ نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی کہ مجھے یہ نام سنوانا چاہتے ہوں کیا میں اس بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔'' میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا۔

''پہلے کبھی یہ نام تمہارے کانوں تک پہنچا ہے؟''

''کبھی نہیں۔''

''تو پھر اس کے بارے میں چھان بین نہ کرو۔''

''بات بے حد پرسرار ہے۔''

''ہاں ہے۔''

''اور اس نے اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور عجیب باتیں بھی کی ہیں۔ کیا وہ سچ ہیں؟''

''ہاں سچ ہیں۔''

''تو پھر مسٹر ندیم! آپ شہزاد سے ندیم کیوں بن گئے اور وہ کون سے مخالف ہیں آپ کے؟''

''شاہ یہ میرے غم کی کہانی ہے اور میں اسے بالکل نہیں کریدنا چاہتا، مجھے امید ہے کہ تم میری معذرت قبول کرو گے۔''

وہ ایک بار پھر چائے پر متوجہ ہوگیا۔ پھر بولا۔

''کاش مجھے معلوم ہو جاتی۔''

''کبھی نہ کبھی تمہیں معلوم ہو ہی جائے گی۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ایک اور سوال میرے ذہن میں مچل رہا۔''

''ہوسکتا ہے میں اس کا جواب بھی نہ دے سکوں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تمہیں یقین ہے۔''

''ہاں۔''

''تو پوچھ لو۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے کہا تھا کہ وہ کاغذات آپ کے پاس ہیں۔''

''ہاں کہا تھا۔''

''لیکن آپ انہیں ساتھ نہیں لائے یا پھر آپ نے اسے محفوظ جگہ پر چھپا دیے ہوں اور واقعی وہ جگہ بہت زیادہ محفوظ ہو۔'' وہ خود ہی بولا اور میں مسکرا دیا پھر میں نے کہا۔

''نہیں اس وقت وہ کاغذات وہیں تھے میں

انہیں ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

''اوہ آپ غلط نہیں کہہ رہے ہوں گے۔''

''نہیں اب میں ہر اس بات سے گریز کروں گا جو آپ کے لیے ناپسندیدہ ہو۔''

''وہ تمہاری امانت ہے میرے پاس اور اطمینان رکھو تمہاری ہی رہے گی۔ میں کسی بھی طرح اس پر اپنی اجارہ داری قائم نہیں کروں گا۔''

''مگر میرا خیال ہے ٹیلی فون کرنے کے بعد آپ فوراً ہی میرے پاس پہنچ گئے تھے اور آپ نے مجھے چلنے کے لیے کہا تھا۔''

''ایک مخصوص وقت تک میں نے وہ کاغذات ایک جگہ چھپائے رکھے اور اس کے بعد میں نے انہیں اپنے پاس منتقل کرلیا چونکہ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم ضرور کریں گے۔ سب کچھ میرے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہوا۔''

وہ خاموش ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد فلیٹ کی کال بیل بجی تو میں خود اٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے چلا گیا۔ الیاس بیگ نے مجھے پرادب انداز میں سلام کیا تھا۔ اس سے مصافحہ وغیرہ کرنے کے بعد میں اسے ساتھ لیے ہوئے اس کمرے میں آ گیا جہاں شاہ موجود تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا، مصافحہ کیا گیا۔ الیاس بیگ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت کے نقوش ابھرے تھے۔ لیکن میں نے فوراً ہی کہا۔

''میرا بہت ہی گہرا دوست اور یہ سمجھو اس وقت میرے لیے بڑی اہمیت کا حامل ابدال شاہ۔''

''یہ الفاظ کافی ہیں میرا نام الیاس بیگ ہے مسٹر شاہ!''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر الیاس بیگ!''

''بیٹھو تمہارے لیے چائے تیار ہے۔'' میں نے الیاس بیگ سے کہا اور شاہ نے جلدی سے چائے بنا کر اسے پیش کی جس کا الیاس بیگ نے دلی شکریہ ادا کیا تھا اور کہا تھا۔

''آپ بہت دلچسپ مہمان ہیں کہ چائے پلاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے میزبانوں کو۔'' جواب میں ابدال شاہ ہنسنے لگا تھا۔ چائے کے دوران کچھ دیر وقفہ رہا پھر میں نے کہا۔

''مسٹر الیاس بیگ ایک اہم مسئلہ درپیش ہے اور اس سلسلے میں آپ کی رائے اور آپ کا عمل درکار ہے۔''

''دل و جان سے حاضر ہوں جناب!''

''ابدال شاہ کا تعارف بس اتنا ہی کافی ہے کہ ان کا نام ابدال شاہ ہے اور یہ میرے دوست ہیں۔ تمہیں جو کام کرنا ہے وہ ان کا نہیں میرا ہے مسٹر الیاس بیگ!''

''آپ نے سر جتنا کہا اتنا کافی تھا لیکن بہرحال مجھے حکم دیجیے گا۔''

''میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا مسٹر الیاس بیگ۔ ہمارے پاس کچھ کاغذات ہیں جو میرے اپنے ملک کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کاغذات کے حصول کے لیے کچھ ایسے خطرناک ادارے اور ایجنسیاں مصروف عمل ہیں جو بے حد خطرناک ہیں۔ مسٹر ابدال کے ساتھ ان کے چار ساتھی اور ہیں جنہیں ایک محفوظ جگہ پوشیدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایجنسیاں قدم قدم پر ہمارے راستے روک رہی ہیں اور یوں سمجھ لو کہ فی الحال میں اس میں اپنے آپ کو ملوث نہیں کروں گا۔ ابدال شاہ اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کرنا ان ایجنسیوں کا سب سے اہم کام ہے۔ ابدال شاہ اس سلسلے میں زخمی بھی ہوگئے تھے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کی بنا پر بمشکل تمام ان کے پھندے سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ مطلب یہ کہ مقامی حکام کی مدد سے ان ایجنسیوں اور ان کے کارندوں نے ابدال شاہ اور ان کے ساتھیوں کے گرد ایک حصار بنا رکھا ہے اور اس حصار کو توڑنا ناممکن نظر آتا ہے۔ ان پانچ افراد کو یہاں سے نکالنا بھی ہے لیکن سب سے پہلے ہمیں ان کاغذات کو وطن واپس پہنچانے کا بندوبست کرنا ہے اور اس سلسلے میں تم سے

مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

الیاس بیگ گہرے سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

''کاغذات بذات خود اتنی اہمیت کے حامل ہیں جناب کہ انہیں اسی انداز میں وطن پہنچانا ضروری ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی غیر ملکی معاہدہ یا کوئی ایسی دستاویز جس کا ضائع ہو جانا غلط ہو جائے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔ بعض معاہدے ہوتے ہیں یا پھر کوئی ایسی دستاویز ہوتی ہے جو بذات خود اپنا بہترین وجود رکھتی ہیں اور بعض کاغذات ایسے ہوتے ہیں جو ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور اگر ان کی نقل بھی موجود رہے تو کام آ سکتی ہے۔''

میں نے سوالیہ نگاہوں سے ابدال شاہ کو دیکھا تو ابدل شاہ کسی قدر پریشان سا ہو گیا۔ کچھ لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''نہیں جناب! یہ کسی دوسرے ملک سے معاہدہ یا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ہم یہ کہیں کہ اس کی نقل ہمارے لیے کارگر نہیں ہوگی۔ یہ تو بس کچھ خاص لوگوں کا تعلق وطن عزیز سے ہی ہے۔ باہر کی کوئی چیز ان کاغذات میں نہیں ہے۔''

''گڈ یہ سوال میں نے ایک خاص مقصد کے لیے کیا تھا جیسا کہ مختصر الفاظ میں میری سمجھ میں آ سکا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ ایسے کاغذات ہیں جو کسی بھی طرح کسی نے حاصل کر لیے ہیں اور جن کا تعلق آپ کے ملک سے ہے آپ کے پاس محفوظ ہیں اور آپ انہیں وطن واپس بھجوانا چاہتے ہیں اور اس بات کا خطرہ ہے آپ کو یہاں سے نکلتے ہوئے وہ کاغذات کسی طرح غلط لوگوں کے ہاتھ بھی لگ سکتے ہیں تو شاید میں جلد بازی کر رہا ہوں لیکن تجویز تو تجویز ہوتی ہے۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ان کاغذات کو اپنے وطن فیکس کر دیں اور اس کے بعد یہاں اصل کاغذات ضائع کر دیں۔ ہاں اگر کوئی دستاویز ہے اور اس کا اسی شکل میں محفوظ رہنا ضروری ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ دوسرا کام ہو جاتا ہے۔''

مجبوری

ایک روز ممی نے ڈیڈی کو باغ سے سبزی توڑ کر لانے کو کہا، ڈیڈی کے ہاتھ میں لمبے پھل کا چاقو تھا۔ بدقسمتی سے ڈیڈی کا پیر پھسلا اور وہ اس طرح گرے کہ تیز دھار چاقو نے ان کی شہ رگ کاٹ دی۔

''اوہ، بہت ہی افسوس ناک واقعہ ہے، پھر تمہاری امی نے کیا، کیا؟''

انہوں نے مجبوراً اس روز دال پکالی تھی۔

کرکٹ کوچ

شوہر نے بیوی کے سامنے قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اپنے حمید صاحب کی بیگم بھی خوب ہیں، ہم کرکٹ کے کوچ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، ہماری گفتگو سن کر وہ یہ سمجھیں کہ کوچ کے چار پہیے ہوتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ پھر سے قہقہے لگانے لگے۔ ان کی بیوی بھی قہقہے لگانے میں شریک ہو گئی۔

دونوں میاں بیوی جب دل کھول کر ہنس چکے تو بیوی نے سرگوشی کے انداز میں شوہر سے پوچھا۔ ''کرکٹ کوچ کے کتنے پہیے ہوتے ہیں؟''

کنجوس

ایک دماغ کا ڈاکٹر ایک کنجوس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

لوگوں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''چار بار ایسا ہوا ہے کہ دماغ کے آپریشن کے بہانے آتا ہے اور ٹنڈ کروا کے بھاگ جاتا ہے۔''

میں نے حیرت سے الیاس بیگ کی شکل دیکھی۔ اتنی برق رفتاری سے ایک منصوبہ پیش کر دینا بے انتہا ذہانت کی بات تھی اور میں نے دل میں اس بات کو تسلیم کیا تھا واقعی یہ ایک بہت ہی خوب صورت تجویز تھی خود ابدال شاہ بھی حیران نظر آ رہا تھا۔ کچھ لمحے سوچتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''چونکہ مسٹر ندیم! یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو کچھ ان کاغذات میں درج ہے وہ کچھ خاص لوگوں کی اپنی تجویز اور ترتیب ہے اس کا کسی دوسرے ملک سے ظاہر ہے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر اس کا ڈپلی کیٹ بھی ہمارے پاس محفوظ رہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور اس سے لاکھ درجے بہتر کہ وہ جس شکل میں بھی ہیں کسی غلط انسان کے ہاتھ لگ جائیں آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں۔''

''تجویز آپ کے سامنے ہے اور فیصلہ آپ ہی کریں گے مسٹر شاہ!'' میں نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں یہ ایک ایسی تجویز ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے اور دوسری بات یہ کہ کیا اس طرح کیا ہوا فیکس محفوظ رہ سکے گا اور کسی اور نگاہ تک نہیں پہنچ سکے گا؟''

''جی ہاں ایسا ہی ہوگا۔''

''لیکن اس سلسلے میں ایک پیچ ہے۔''

''کیا؟''

''آپ میری پوزیشن جانتے ہیں ندیم صاحب! مجھے اس سلسلے میں ہدایات لینا ہوں گی اور ظاہر ہے کسی کو اطلاع بھی دینا ہوگی کہ اس طرح سے میں وہ کاغذات فیکس کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا انتظام میں کر دوں گا۔'' الیاس بیگ نے پھر کہا۔

''وہ کیسے؟''

''ایک ایسے ذریعے سے جسے آپ اس فیکس کا ہی ایک حصہ سمجھ لیں آپ باقاعدہ وہاں ٹیلی فون کریں گے مطلوبہ افراد سے رابطہ قائم کریں گے لیکن میں پورے اعتماد اور اطمینان سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے کسی ٹیلی فون پر یا ٹیلی فون ایکسچینج پر کسی بھی ٹرانس مشین کے ذرائع پر یہ گفتگو نہیں سنی جا سکتی۔''

''کچھ عجیب سی بات نہیں ہے۔'' ابدال شاہ نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ بے چارہ ابدال شاہ ایزی ہارڈو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور یہ بات میں جانتا تھا کہ الیاس بیگ ایزی ہارڈو کا متعین کردہ شخص ہے۔ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔

''کیوں کہ میں نے آپ پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا ہے اس لیے میں آپ کی کسی بات سے انحراف نہیں کر سکتا۔ ذاتی طور پر اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر طریقہ اس وقت اور کوئی نہیں ہے۔''

''میں ضمانت دے چکا ہوں اور الیاس بیگ تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے ایک بہتر تجویز پیش کر کے ہم لوگوں کو ذہنی سکون دیا۔''

''میرے لائق دوسری خدمت۔''

''اس کے بعد لیکن اب یہ بتایئے ابدال شاہ کہ کیا آپ اپنے ان چاروں ساتھیوں کو کس قدر محفوظ سمجھتے ہیں جتنا آپ نے اظہار کیا ہے۔''

''ہاں میں نے انہیں ایک انتہائی نفیساتی طریقے سے ایک ایسی جگہ محفوظ کیا ہے جہاں وہ کسی مشکل کا شکار نہیں ہو سکتے۔ ان کی ذمہ داری مجھ پر تھی میں نے اپنے آپ سے زیادہ انہیں تحفظ دیا ہے اور اگر آپ مجھ پر اطمینان کر سکیں تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں تاہم میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ اس وقت بندرگاہ پر مزدوروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں ہر طرح کے کاغذات فراہم کیے ہیں اور یہ کاغذات میری اپنی کاوشوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کا زیادہ تر وقت بندرگاہ پر ہی گزرتا ہے اور ایک وہ لائسنس یافتہ کمپنی کے

مزدوروں کی حیثیت سے لوڈنگ اور ان لوڈنگ کرتے ہیں۔'' الیاس بیگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی اس نے کہا۔

''ہاں یہاں یہ سب سے محفوظ طریقہ ہے مسٹر ندیم!''

''ٹھیک ہے ورنہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم انہیں بھی کسی محفوظ جگہ پہنچا آئیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''گویا بات طے ہوئی کہ اب وہ کاغذات اگر آپ کے ہاں سے اجازت مل جائے تو فیکس کیے جاسکتے ہیں۔''

''جی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے الیاس بیگ تمہاری اس موثر اور فوری تجویز کو ہم قبول کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں اس وقت تم نے بہت بڑے مسئلے کو بقول شخصے چٹکیاں بجاتے ہوئے حل کرلیا ہے۔''

''مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ اگر ادھر سے اس بات کو قبول کرلیا جائے۔''

''فکر کی بات نہیں ہے۔ مسٹر ندیم فرض کیجیے اگر وہاں سے یہ سلسلہ اس طرح ممکن نہیں ہوسکا تو ہم اس کے لیے دوسری تجویز پیش کریں گے۔'' الیاس بیگ نے کہا۔

''تو اب بتائیے کہ ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔''

''بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ میرے ساتھ ہی چلیں۔ وہ جگہ بالکل محفوظ ہے جہاں میں آپ کو لے جاؤں گا، کاغذات بھی اپنے پاس ہی رکھیں اور اس کے بعد ہم فیصلہ کرلیں گے۔''

''ٹھیک ہے ہم آپ کے ساتھ ہی چلیں گے۔''

''میں خود بھی یہی درخواست کروں گا۔'' الیاس بیگ نے کہا۔

اس کے بعد فلیٹ میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ الیاس بیگ کی کار بہت شاندار تھی۔ پہلے بھی میں اس کار کو دیکھ چکا تھا۔ ہم فلیٹ سے باہر نکلے اور کار کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ الیاس بیگ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ ابدال شاہ بار بار یہ محسوس کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ میرے اور الیاس بیگ کے درمیان کیا تعلقات ہیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ الیاس بیگ میرے سامنے ایک مودب شخصیت اختیار کرلیتا ہے اور مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑا ادب شامل ہوتا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے اور مجھے بھی اندازہ تھا کہ اس کے ذہن میں لاتعداد سوالات ہوں گے لیکن بہرحال میں نے خاموشی اختیار کی تھی۔

پھر فاصلے طے کرتے رہے اور پھر ایک خوب صورت بلڈنگ کے سامنے رک گئے۔ آج تک میں نے الیاس بیگ کے بارے میں یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ یہاں خود کس حیثیت کا حامل ہے اور کس انداز میں رہتا ہے یہ بلڈنگ دفتر کی بلڈنگ تھی جس کے سامنے الیاس بیگ نے کار روکی تھی اور اس پر ایک بہت ہی خوب صورت بورڈ لگا ہوا تھا جس پر بیگ اینڈ کو لکھا ہوا تھا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کار سے اترنے کے بعد الیاس بیگ نے اس عمارت کے مین گیٹ کی طرف جانے کے بجائے ایک بغلی سمت اختیار کی اور تھوڑی سی راہداری طے کرکے ایک لفٹ کے قریب پہنچ گیا۔ لفٹ پر لفٹ مین موجود تھا اس نے انتہائی ادب سے بٹن دبا کر دروازہ کھولا اور بیگ نے گردن ہلادی۔ لفٹ مین نیچے رک گیا۔ ہم تینوں اوپری منزل پر پہنچے اور غالباً یہ چوتھا اور آخری فلور تھا۔ وہ ہمیں لیے ہوئے اندرونی حصے میں آگیا۔ وہاں ہم نے ایک خوب صورت رہائش گاہ دیکھی جس میں سات آٹھ کمرے تھے۔ ڈرائنگ روم خاصا وسیع وعریض اور ڈیکوریٹ تھا۔ میں ایک ایک شے کو حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

پندرہویں قسط

لاوارث

غزالہ جلیل راؤ

انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو' کسی بھی ملک میں رہتا ہو' جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں' وہیں اس سے نفرت کرنے والوں کا وجود بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کو زمانے کے گرم و سرد سے بچانے والے' اس کو سایہ فراہم کرنے والے اس کے لیے جان نچھاور کرنے والے ہر جگہ' ہر علاقے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے خلاف سازشیں کرنے والے' اس کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے' اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے دوستوں کے روپ میں اس کے وجود کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ' اس کے باپ کا پتا نہیں تھا..... لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا..... اس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی..... لیکن اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی موجود تھے۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک سلسلہ وار انوکھی داستان

بہر طور نہ شیری کو یہ پوچھنے کا موقع ملا تھا اور نہ ہی بیگم صاحبہ نے اسے کچھ بتایا تھا کیونکہ وہ شام سے مسلسل مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھیں۔ عاقل بہترین تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس وہاں پہنچا تو بلاشبہ اس کی شخصیت قابل دید تھی۔ ویسے بھی خوب صورت خدوخال کا مالک تھا۔ اچھے لباس نے سونے پر سہاگے کا کام دیا تھا۔ کوئی نگاہ ایسی نہ تھی جو اس کی جانب نہ اٹھی ہو۔ بابر علی صاحب تو شیری کی اس کروفر سے یہاں موجودگی پر ہی کافی برہم نظر آنے لگے تھے۔ عاقل کو بھی دیکھا تو چونک پڑے۔ انہوں نے آہستہ سے بیگم صاحبہ کے کان میں کچھ کہا تھا اور بیگم صاحبہ نے انہیں سرد مہری سے جواب بھی دے دیا تھا۔ اب ذہنوں میں کیا تھا یہ تو اللہ ہی جانے۔ لیکن بہرطور اس کے بعد بابر علی صاحب نے ان دونوں کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ کرنل یوسف نے البتہ عاقل سے بھی تعارف حاصل کیا تھا۔ ملنسار قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک سے ہنس کر ملنے کے عادی عاقل کے بارے میں بیگم صاحبہ نے یہی بتایا کہ اپنا ہی بچہ ہے یہیں اس کوٹھی میں رہتا ہے اس سے زیادہ اور کوئی تعارف نہیں ہوسکا تھا۔ کھانے کا دور چلا۔ کرنل یوسف ہر ڈش پر ایک شعر پڑھ رہے تھے اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اردو شاعری کی کافی چھان بین کی ہے۔

البتہ ثاقب صاحب غائب تھے۔ کچھ اونگھنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ کسی ایک نکتے پر نگاہ جما دیتے تو اطراف کے ماحول کو بھول جاتے تھے اور کوئی اتنی گہری نگاہ سے ان مہمانوں کا جائزہ لے رہا ہو یا نہ لے رہا ہوں لیکن شیری ان میں سے ایک ایک کی شخصیت کو پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ماہ رخ بیگم بھی کچھ دلچسپ عادتوں کی حامل نظر آئیں، ان کی نگاہیں مسکراتی ہوئی تھیں۔ خوش اخلاق معلوم ہوتی تھیں جس سے بھی گفتگو کرتی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ماہ رخ بیگم اس پر نثار ہورہی ہوں۔ باتیں کرنے کا یہ انداز بڑا خطرناک تھا۔ بیگم گول مٹول یعنی ماہ جبین صاحبہ بھی خوش اخلاقی سے باتیں کرنے کی عادی تھیں اور ہر بات پر ہنسنا ان کی فطرت تھی۔ بظاہر بڑا ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان کی آمد کس سلسلے میں ہے۔ ان لوگوں کا خدشہ درست ہے یا نہیں۔

کھانے پر دادا ابو بھی تھے۔ تعارف کی رسم بھی ادا ہوئی تھی اور دادا ابو نے کرنل صاحب اور ان کے بیٹے سے ہاتھ ملایا۔ بیٹی اور بیگم صاحبہ سے سلام لیے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے ان سے کسی رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ ذہنی طور پر مصروف ہوں۔ کھانا ختم ہوا تو سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ بابر علی صاحب نے کرنل یوسف کو اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی اور بیگم صاحبہ ماہ جبین بیگم کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ بچوں بچیوں سے انہوں نے کہا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے سے گھلنے ملنے کی کوشش کریں۔ ویسے بھی مہمان تھے اور اس کوٹھی کے لوگ آدم بے زار نہیں تھے۔ اس لیے بدر اور قدسیہ نے بڑے ہونے کی حیثیت سے نووارد بہن بھائیوں کو دعوت دی کہ کوٹھی کے پائیں باغ میں چل کر بیٹھا جائے۔ ملازموں کو نشستیں لگانے کی ہدایات کردی گئیں۔ شیری اور عاقل نے واپسی کی اجازت مانگی تو نفیسہ فوراً بول پڑی۔

''کیوں۔۔۔ بہت زیادہ مصروفیت ہے آپ کو یا آدم بے زار ہوتے جارہے ہیں۔ آیئے لان میں بیٹھتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ایک محبت بھرا حکم تھا۔ شیری شانے ہلا کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب لان میں پڑی ہوئی رنگین کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تب نفیسہ نے کہا۔

''معزز مہمانوں! ثاقب صاحب اور ماہ رخ بیگم کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور ہم سب بڑی مسرت سے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب تک بزرگوں کے درمیان جو ملاقات رہی اس میں ادب شامل تھا لیکن اب ذرا ہمارے درمیان بے تکلفی کا ماحول پیدا ہونا چاہیے۔ تعارف کا وہ رسمی انداز جو

بزرگوں نے اختیار کیا تھا وہ بالکل نامکمل تھا۔ چنانچہ میں نئے سرے سے ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ لوگ میری بات سے متفق ہیں۔۔۔'' اس نے ثاقب صاحب کی طرف دیکھا اور ثاقب صاحب بے اختیار چونک پڑے۔

''جی۔ کچھ فرمایا آپ نے؟''

''خوب، خوب، بس صرف یہ آپ کا ہلکا سا تعارف ہے۔''

''جج۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔'' ثاقب صاحب نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور پھر چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔

''مم میں سمجھا نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہم سمجھ گئے ہیں۔'' نفیسہ بولی اور سب ہنسنے لگے۔ ثاقب صاحب ایک دم واپس آ گئے۔

''محترمہ ماہ رخ ہم لوگ بھی اپنا تعارف ایک بار پھر سے کرا دیں۔ پہلے میں شیری بھائی سے ابتدا کروں گی۔ شیری بھائی ہم سب کے بھائی ہیں۔ ہمارے محسن اور ہمارے دوست ہم سب کے لیے قابل احترام اور اس عمارت کے سب سے اہم رکن۔ آپ رشتوں کو جو بھی نام دینا پسند کریں دے لیں۔ شیری بھائی ہمارے لیے ان تمام محبتوں کا مجموعہ ہیں۔''

''آداب۔ آداب۔'' شیری نے لکھنوی انداز میں جھک کر کہا۔

''یہ عاقل صاحب ہیں میرے استاد محترم اور ہمارے خاندان کے ایک اہم رکن۔''

''استاد۔۔۔؟'' ماہ رخ نے سوالیہ نگاہوں سے نفیسہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔۔۔''

''کیا انہوں نے آپ کو پڑھایا ہے؟''

''ہاں انہوں نے مصوری کا فن مجھے دیا ہے اور میری تصویریں مقبول عام ہیں۔''

''بہت خوب بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر عاقل صاحب۔'' ماہ رخ بولی۔

''اب اس کے بعد بدر کی باری آتی ہے میرے بھائی۔ میں نفیسہ ہوں۔ یہ میری بہن انیسہ ہے اور وہ جو اس کونے میں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں ان کا نام صفدر ہے۔ یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی اکبر ہے اور ہم سب آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سب سے مل کر۔ کیوں بھائی جان۔۔۔'' ماہ رخ نے ثاقب صاحب کی طرف دیکھا۔ ثاقب صاحب اس وقت ہوش و حواس ہی میں تھے۔ جلدی سے بولے۔

''جی ہاں، مجھے بھی، مجھے بھی۔۔۔''

''ویسے آپ لوگوں کا شغل کیا رہا ہے؟''

''تعلیم کے حصول کے بعد سیر و سیاحت۔ ہم نے تقریباً آدھا یورپ دیکھ لیا ہے۔ یہاں کبھی نہیں آئے تھے بچپن ہی سے غیر ممالک میں رہے۔ ڈیڈی کا کاروبار بہت بڑا ہے۔ یقیناً آپ لوگوں کو اس بارے میں بتا دیا گیا ہوگا۔ اب یہاں تقریباً چار چھ ماہ تک آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گے اور آپ کے ساتھ اس ملک کی سیر و سیاحت کریں گے۔''

''سر آنکھوں پر۔ ہمیں آپ کی آمد سے دلی خوشی ہوئی ہے۔'' نفیسہ نے کہا۔

اس کے بعد کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں اور نئے آنے والے مہمانوں کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ ماہ رخ ایک ذہین زیرک اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔ ثاقب صاحب ذرا بودم قسم کے آدمی ہیں اور خیالات کی دنیا میں کھو جانے کے عادی ہیں۔ حالانکہ ان کے خیالات کے بارے میں ابھی تک کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔ نہ شاعری سے رغبت تھی نہ مصوری سے، بظاہر کوئی ایسا سلسلہ نہیں تھا جس کے بارے میں یہ سوچا جا سکے کہ ثاقب صاحب کسی خاص شغل کے عادی ہیں۔ بیگم صاحبہ کے ذہن میں جو احساس تھا اس کے بارے میں ابھی ان لوگوں کو کریدنا مناسب نہیں

تھا۔

ماہ رخ سے گفتگو کے دوران پتا چلا تھا کہ کرنل صاحب بہت بڑے کاروباری ہیں اور یورپ کے مختلف ملکوں میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ ان کی یہی دو اولادیں ہیں۔ جنہوں نے یورپ میں ہی تعلیم پائی ہے اور ان کی پرورش وہیں ہوئی ہے۔

''آہ یورپ۔'' شیری گہری سانس لے کر بولا اور سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''کیوں خیریت۔ آپ آہیں کیوں بھر رہے ہیں۔'' ماہ رخ نے دلچسپی سے کہا۔

''نوجوانوں کے لیے یورپ ایک ارمان ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں آپ لوگ۔'' شیری مغموم لہجے میں بولا۔

''فلسفے کی زبان ترک نہیں کی جاسکتی شیری صاحب۔'' ماہ رخ نے شیری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آہ۔۔۔! زندگی ایک فلسفہ ہی تو ہے۔ پیدائش کے بعد سب سے پہلی خواہش پیٹ بھرنے کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی خواہشات کے طوفان دلوں میں موجزن ہوجاتے ہیں اور پھر ایک ایسا دور آجاتا ہے جس میں انسان خود اپنے آپ میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس دور کی خواہشات صاف الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ یورپ کی حسین داستانیں ہم دیسیوں کے لیے ایسی دلکشی رکھتی ہے کہ بس آرزومند ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ لوگوں کی خوش بختی پر رشک آتا ہے کہ آپ ان داستانوں کے کردار ہیں۔''

''خدانا خواستہ جو داستانیں یورپ سے منسوب ہیں۔ خدانہ کرے ہمارا ان سے کوئی واسطہ ہو۔''

''اچھا۔'' شیری تحیر بھرے لہجے میں بولا۔

''ہاں شیری صاحب! حقیقت کہہ رہی ہوں۔ ہم نے وہیں تعلیم پائی، وہیں پلے بڑھے۔ لیکن گھریلو ماحول اس قسم کا تھا کہ ہم ان داستانوں کے کردار نہیں بن سکے یہ ہمارے ڈیڈی دھان پان سے چہرے پر حسین مسکراہٹ سجائے ہوئے جو آپ کو نظر آرہے ہیں نا۔۔۔ اندر سے فولاد کی طرح سخت ہیں۔ انہوں نے کچھ اصول وضع کیے ہیں اور ان اصولوں سے ہٹنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ عام حالات میں شاید ہمارے گھر میں کوئی تلخ گفتگو بھی نہ ہوئی ہو لیکن اگر ڈیڈی کی مرضی کے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھ جاتا ہے جس کی انہوں نے ممانعت کی ہو تو آپ نہیں جانتے کیسی سرد جنگ شروع ہوجاتی ہے ہمارے گھر میں۔ چنانچہ ہم اس کے عادی ہی نہیں رہے۔ یورپ میں ہمارا اپنا ایک حلقہ تھا۔ قدامت پسند لوگوں کا حلقہ سمجھ لیجیے۔ اس قدامت پسندی کا مطلب وہ یہ لیتے ہیں کہ ہر قدامت پسند کی شرافت اس کے اپنے وطن کے معیار کے مطابق ہو۔ بات صرف بزرگوں تک ہی نہیں تھی بلکہ اس کی پرکھ نوجوانوں سے بھی ہوتی۔ باقاعدہ اس کے بارے میں چھان بین کی جاتی اور اگر وہ معیار پر پورا اترتا تھا تو اسے حلقے میں شامل کرلیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم نے اپنی ایک الگ دنیا بنائی ہوئی تھی۔ ہم یورپین لباس پہنتے ہیں وہاں کی سوسائٹی میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ برائیاں جو ہماری اپنی اقدار سے ٹکراتی ہیں انہیں اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی ایسے افراد سے ہم دوستی رکھتے ہیں جو ان تمام برائیوں کو اپنائے ہوئے ہوں۔''

شیری دل چسپی سے گفتگو سن رہا تھا اور اس کی صداقت کا اندازہ ماہ رخ کے چہرے سے لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تحسین کے الفاظ ابھرے تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ابھی اسے جو کردار انجام دینا تھا اس کے لیے ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ تعجب بھرے لہجے میں بولا

''اس کا مطلب ہے کہ آپ یورپ میں رہی ہی نہیں۔''

''ہاں! جن الفاظ میں یا جن الفاظ سے یورپ کو یاد کیا جاتا ہے ان کے تحت ہم واقعی یورپ میں نہیں رہے۔ ہم نے اپنی ادبی محفل الگ بنائی ہوئی

ان۔ ہماری اپنی دل چسپیاں ذرا مختلف تھیں۔ ہم شعر و شاعری کی محافل میں حصہ لیتے تھے۔ شاعری سے مجھے یا ثاقب کو کوئی رغبت نہیں ہے لیکن ابا بدستور تشنہ ہیں اور اردو شاعری کی ٹانگ اڑائے رہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں آتا نہیں بس وطن سے لٹریچر منگواتے ہیں۔ غزل بھرہ میں قطع و برید کرنے کے ماہر ہیں اور پھر انہیں اپنے نام سے پیش کر دینا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لندن میں سارے ہی بے وقوف نہیں ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو ان محفلوں میں صرف دکھاوے کو ہی شریک ہو جاتے ہیں۔ بذات خود انہیں نہ شعر کہنے سے لگاؤ ہے نہ شعر سننے سے۔ لیکن چونکہ ادبی حلقے سے لگاؤ رکھتے ہیں اسی لیے وہ اس میں شامل رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ڈیڈی کی غزلوں، نظموں پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔'' تمام لوگوں کے ہونٹوں پر ایک دم ہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''واہ تب تو واقعی آپ لوگ ایک مثالی حیثیت کے مالک ہیں۔''

''مگر آپ یورپ کے بارے میں آئندہ کبھی آہیں نہ بھریں شیری صاحب! یورپ بڑی عجیب جگہ ہے۔ بڑے غیر انسانی ممالک ہیں یہ، آپ وہاں کی تہذیب کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہاں کے لوگ یورپ کی داستانوں کو الف لیلیٰ داستانوں کی مانند سنتے ہوں گے لیکن اس الف لیلیٰ کا پس منظر جو کچھ ہے اس پر کبھی غور کریں تو آپ کو یہ احساس ہو کہ آپ کی اپنی اقدار کتنی قیمتی ہیں۔''

''ثاقب صاحب آپ بھی تو کچھ بولیے۔ لگتا ہے یورپ میں آپ کے پیروں پر پڑی ہوئی زنجیریں آپ کی ذات کو پژمردہ کرنے کا باعث بنی ہیں۔'' شیری نے بات کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' ثاقب صاحب چونک کر بولے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

''سبحان اللہ سبحان اللہ۔ کہاں کھوئے ہوئے تھے آپ؟''

''جی کہیں نہیں۔ کہیں نہیں۔ میں۔۔۔ میں تو یہیں ہوں۔'' ثاقب نے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں ہے۔'' شیری نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

کافی دیر میں یہ نشست ختم ہوئی تھی۔ اس دوران میں شیری ان دونوں بہن بھائیوں کے بارے میں اندازہ لگا چکا تھا۔ ماہ رخ کے بارے میں اس نے جو کچھ سوچا تھا اس کے مطابق وہ شگفتہ لڑکی تھی۔ بھائی ثاقب بس لاڈلے تھے۔ یہ لفظ ان کی تمام تر شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے کافی تھا۔

جب یہ محفل برخاست ہوئی تو شیری بھی اپنی آرام گاہ میں پہنچ گیا۔ عاقل اپنی انیکسی میں چلا گیا تھا۔ اس نشست کے بارے میں ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

دوسری صبح شیری سو کر بھی نہیں جگا تھا کہ دفعتاً اس کے کمرے کا دروازہ پیٹا جانے لگا اور وہ بوکھلا کر بستر سے اٹھ گیا۔ دروازہ کھولا تو بیگم صاحبہ تھیں۔ چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں تھے۔ پر سکون سی شکل بنائے ہوئے وہ شہری کے سامنے کھڑی تھیں۔

''سوتے سے جگایا ہے نا تمہیں۔ صبح خیزی اچھی چیز ہوتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''واقعی۔ واقعی مجھے افسوس ہے۔ ویسے وقت کیا ہوا ہے۔'' شیری نے پوچھا۔

''ساڑھے آٹھ ہوئے ہیں۔''

''اوہ۔۔۔! واقعی پھر تو خاصا وقت ہو گیا۔ دراصل رات کو ہم لوگ کافی دیر تک جاگتے رہے ہیں۔ ورنہ میں بھی ساڑھے سات بجے تک اٹھ جانے کا عادی ہوں۔ خیریت تو ہے آپ کا اس وقت میرے یہاں آنا۔''

''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ذرا چہل

قدمی کو نکلی تھی۔ دل میں یہ بات بھی تھی کہ تم سے بات چیت بھی کروں گی۔ ظاہر ہے ناشتے کی میز پر سب ہی ہوتے ہیں اور تم سے بات ہوتی یا نہ ہوتی۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"کوئی خاص بات ہے۔" شیری نے پوچھا۔

"ہاں۔ رات کو میرے اور بابر علی صاحب کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔

"اوہ آیئے اندر آ جایئے۔"

"نہیں۔۔۔ اندر نہیں آؤں گی۔ بس تمہیں بتا کر واپس جا رہی ہوں۔"

"کوئی اہم بات ہے تو بتایئے۔"

"ہاں! یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بابر علی صاحب نے کہا تھا۔ ثاقب ہی وہ لڑکا ہے جسے بابر علی صاحب نے نفیسہ کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ انتخاب خاصا مضبوط ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ بے پناہ دولت مند ہیں یورپ کے بیشتر ممالک میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے اور صرف ثاقب ہی ان سب کا وارث ہے۔ چنانچہ نفیسہ کے لیے اس کے بعد اس سے بہتر رشتے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں کی اس طرح پذیرائی کی جائے کہ بالآخر یہ مسئلہ طے ہو جائے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی وغیرہ نہیں ہونی چاہیے۔"

"گڈ۔۔۔ ویری گڈ! اس کا مطلب ہے کہ ہمارا خدشہ درست نکلا۔"

"ہاں!" بیگم صاحبہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"ارے، ارے آپ کی آواز کو کیا ہو رہا ہے امی جان!" شیری نے کہا اور بیگم صاحبہ عجیب سی نگاہوں سے شیری کو دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی چھلک رہی تھی پھر انہوں نے شیری سے کہا۔

"میں ثاقب کے ساتھ نفیسہ کو کبھی منسوب نہیں ہونے دوں گی شیری یہ سوچ لو۔"

"کمال ہے امی جان! ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب تک آپ کا شیری موجود ہے آپ کو کسی قسم کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"شیری! اس سلسلے میں ممکن ہے تمہیں خا[صی] مشکلات سے گزرنا پڑے۔"

"گزر لیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اتنی لاپرواہی سے مت سوچو۔ بابر صاحب شدید جارحیت کے موڈ میں ہیں۔ میرا خیا[ل] ہے وہ اس سلسلے میں کسی کی نہیں سنیں گے۔"

"ایک بات بتایئے امی جان!"

"ہاں، ہاں کہو۔"

"آپ نے کسی قسم کے اختلاف کا اظہار [کیا] ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ تمہارے مشورے کے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ویری گڈ! یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ بڑی سمجھ داری سے کام لیا آپ نے۔ بہرحال ان لوگوں کو چت کرنا میرا کام ہے۔" شیری نے کہا۔

"دیکھو بیٹے! تم نے یہ بیج میرے سینے میں بو[یا] ہے لیکن اب یہ اتنا پروان چڑھ چکا ہے کہ اسے نکال پھینکنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ نفیسہ اور عاقب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ [کم] از کم میں اپنے ذہن میں ان دونوں کی علیحدگی کا تصور تک نہیں کر سکتی ہر قیمت پر ہمیں اس رشتے کا تحفظ کرنا ہے۔"

"آپ بالکل مطمئن رہیے امی جان! بس تمام حالات سے آگاہ کرتی رہیں باقی میں سب سنبھال لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"اللہ حافظ!" شیری نے کہا اور بیگم صاحبہ چلی گئیں۔

شیری دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر مسہری پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ بیٹھا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر غسل خانے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تیار ہو گیا تھا۔

ناشتے کی میز پر خوب ہنگامے تھے۔ مہمانوں

قہقہے ابل رہے تھے۔ درحقیقت کرنل یوسف ایسا آدمی تھے۔ جس طرح وہ اشعار کو توڑ مروڑ رہے تھے وہ قہقہہ آور تھے۔ کم از کم یہاں والوں کے لیے یہ اشعار اجنبی نہیں تھے لیکن کرنل صاحب سب پر حاوی جمائے بیٹھے تھے۔ ابھی تک کسی نے انہیں ٹوکا تھا۔ حالانکہ سب کی زبانیں مچل رہی تھیں۔ لیکن احترام لازم تھا۔

شیری سب سے بڑھ چڑھ کر کرنل صاحب کے اشعار کی داد دے رہا تھا۔ کرنل صاحب اب پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ ناشتے کے اختتام پر انہوں نے کہا۔

''بھئی شیری میاں! شعر و سخن سے تمہیں کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ یقین کرو تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

''اٹھو بھئی! کچھ اور بھی کام کرنے ہیں۔'' بابر علی صاحب برا سا منہ بنا کر بولے۔ کرنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بابر علی صاحب کے لہجے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ جبکہ باقی تمام لوگوں نے بات کو اس طرح درمیان سے کاٹ دینے کو شدت سے محسوس کیا تھا لیکن اس کا احساس شیری کے چہرے پر نہیں تھا۔

دادا ابو نے شیری سے کہا۔

''شیری کتنی دیر میں تیار ہو جاؤ گے؟''

''بس دادا ابو حکم! میں تو بالکل تیار ہوں۔ ناشتا کرنا تھا کر لیا۔''

''عاقل میاں سے بھی کہہ دو کہ وہ ''اپنا گھر'' پہنچ جائے۔''

''یہ ''اپنا گھر'' کیا ہے۔۔۔؟'' ماہ رخ نے سوال کیا اور شیری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''دلچسپ نام ہے نا؟''

''ہاں نام تو اچھا ہے مگر بات سمجھ میں نہیں آئی ہے۔''

''آجائے گی۔ آجائے گی۔ میرے خیال میں آج نہیں لیکن کل آپ کو اس کے بارے میں پوری تفصیلات بتا دی جائیں گی۔''

''سسپنس۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم کل تک کا انتظار کر لیں گے مگر یہ بتائیں کہ آپ لوگ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟''

''ہمیں وہاں بہت سے کام کرنے ہیں ماہ رخ صاحبہ!''

''واپسی کب تک ہوگی۔۔۔'' ماہ رخ نے سوال کیا اور نفیسہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بس شام تک، مصروفیت کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔''

''او کے اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگ ہماری تفریحات میں شریک نہیں ہوں گے۔'' ماہ رخ نے کہا۔

''ارے نہیں، نہیں، شیری بھائی کسی کے ملازم تھوڑی ہیں۔ ساری تفریحات میں حصہ لیں گے۔ بے فکر رہو۔ آج چلے جانے دو، رات کو بیٹھ کر تفریحی پروگرام بنائیں گے۔'' نفیسہ نے کہا اور ماہ رخ خاموش ہوگئی۔

شیری دادا ابو کے ساتھ باہر نکل گیا۔ دادا ابو خاموش اور سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ شیری نے دادا ابو کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا اور پھر اس نے انہیں ٹوک ہی دیا۔

''کیا بات ہے دادا ابو! کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔''

''نہیں نہیں۔۔۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ہی سوچ رہا تھا کہ اب ''اپنا گھر'' کا جلد از جلد افتتاح ہو جانا چاہیے۔ میں اس کام کی ابتدا کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ ویسے تمہاری ذہنی قوتوں سے مقابلہ کرنا تو ذرا مشکل کام ہی ہے۔'' دادا ابو نے ہنستے ہوئے کہا اور شیری خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دادا ابو، عاقل، شیری اور بدر ایک شان دار کار میں بیٹھے ہوئے ''اپنا گھر'' جا رہے تھے۔ چونکہ ڈرائیور کار چلا رہا تھا اس لیے راستے میں کوئی بات نہ ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد یہ ''اپنا گھر'' پہنچ گئے۔

''اپنا گھر'' میں دن رات کام ہو رہا تھا۔ پچھلے کچھ معاملات میں اچھی خاصی رقومات ہاتھ آ گئی تھیں۔ بدر اسپتال سیکشن کی جانب چل پڑا۔ دادا ابو دفتر کی جانب اور عاقل ٹہلتے ہوئے دوسرے کاموں کی نگرانی کے لیے آگے بڑھ گیا۔

تمام کام دلجوئی سے ہو رہے تھے۔ فرنیچر تقریباً تیار ہو چکا تھا پالش ہو چکا تھا۔ فرش صاف کیا جا رہا تھا۔ گویا ''اپنا گھر'' اب بالکل مکمل حالت میں تھا اور اب کوئی خاص ضروریات باقی نہیں رہی تھی۔ ہاں اس کی ضروریات کے لیے تو ابھی بے شمار معاملات تھے جو آہستہ آہستہ ہی طے ہو سکتے تھے۔ جو عمارتیں لوگوں کی رہائش گاہ کے لیے بنائی گئی تھیں۔ وہاں ضرورت کا تمام فرنیچر پہنچ چکا تھا۔ آج اس فرنیچر کا معائنہ کرنا تھا۔ چنانچہ کافی دیر تک وہ ان فلیٹوں میں گھومتے رہے۔ اس کے بعد نیچے آئے تو ایک ملازم ان کا منتظر تھا۔

''کیوں خیریت ذاکر خان کیا بات ہے۔'' شیری نے پوچھا۔

''صاحب! کوئی بی بی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کون بی بی صاحبہ۔'' شیری نے پوچھا۔

''ہم نام نہیں جانتا صاحب، پر وہ ادھر آتا رہتا ہے۔''

''اوہ، شاید آمنہ ہوگی۔'' شیری نے کہا اور عاقل ایک دم ٹھٹک گیا۔

''شیری بھائی آپ جایئے۔'' عاقل نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''آؤ یار! ہمت سے کام لو تمہیں ابھی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنا ہے۔''

''شیری بھائی! زندگی کو قریب سے دیکھنا ہے موت کو تو نہیں۔'' عاقل نے ہنستے ہوئے کہا۔ شیری اس کا بازو پکڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

''اپنا گھر'' کے عظیم الشان ویٹنگ ہال میں آمنہ قالین پر ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات تھے۔ خوب صورت ساڑھی میں ملبوس تھی اور بلاشبہ حسین نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کے چہرے پر کبیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

''ارے آمنہ صاحبہ کس وقت تشریف لائیں۔'' شیری نے پوچھا۔

''آ گئی۔ بس آپ کو اس سے کیا۔'' آمنہ نے کہا۔

''اوہ اچھا، اچھا! میں باہر چلا جاتا ہوں۔'' شیری نے کہا۔

''مذاق مت کیجیے شیری صاحب! اب مجھ پر پابندیاں بھی عائد ہونے لگیں کہ یہاں نہ جاؤ وہاں نہ جاؤ۔''

''کس نے کیں یہ پابندیاں آپ پر عائد۔''

''آپ کے ملازم نے جو آپ کو اطلاع دینے گیا تھا۔ کہنے لگا ویٹنگ ہال میں بیٹھیں اور انتظار کریں۔ میں صاحب کو یہیں بلا کر لے آتا ہوں۔''

''اوہ، کمال ہے، ویسے اچھا ہی کیا اس نے۔ تم ہمیں کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتیں ''اپنا گھر'' کوئی چھوٹی سی جگہ تو ہے نہیں۔'' شیری نے کہا۔

''اچھا طریقہ نکالا ہے تم نے بات بنانے کا۔ سنایئے عاقل صاحب آپ کیسے ہیں۔ آپ کی شکل تو دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔'' آمنہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''بس آمنہ صاحبہ! مصروفیات ہی ایسی ہیں۔ کیا بتائیں آپ کو۔'' عاقل نے کسی قدر سرد لہجے میں جواب دیا۔

''آپ یقین کریں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی ہوں، مجھے رونا آنے لگتا ہے۔''

''ارے نہیں۔ نہیں آپ روتی ہوئی اچھی نہیں لگیں گی۔'' شیری نے کہا۔

''میں آپ سے بات نہیں کر رہی شیری صاحب! عاقل سے بات کر رہی ہوں۔'' آمنہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ عاقل سے ہی باتیں کریں۔ میں آپ کو کب منع کر رہا ہوں۔'' شیری نے جواب دیا اور عاقل چونک کر شیری کو دیکھنے لگا۔ پروگرام تو یہ تھا کہ آمنہ کو اس طرح کاٹا جائے کہ اس کے حوصلے پست ہو جائیں۔ لیکن شیری اس کی پذیرائی کر رہا تھا۔ کیوں۔

آمنہ جاوید کی آمد شیری کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں تھی۔ حمیدہ بیگم کی کہانی سننے سے پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ آمنہ جاوید کو کس طرح راستے سے ہٹایا جائے لیکن مسئلہ دوسرا ہو گیا تھا۔ آمنہ جاوید، حمیدہ بیگم کی کہانی کے ساتھ ایک دوسری حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ عاقل یہ بات نہیں جانتا تھا لیکن شیری اس بات سے واقف ہو چکا تھا اور وہ عاقل کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے آمنہ جاوید کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور جب آمنہ جاوید نے اس سے ''اپنا گھر'' دیکھنے کی فرمائش کی تو وہ فوراً ہی تیار ہو گیا۔

''ہاں، ہاں، ضرور ضرور۔'' شیری نے جواب دیا اور عاقل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ''اپنا گھر'' کے مختلف حصوں کی سیر کر رہے تھے۔ آمنہ جاوید تعجب سے بولی۔

''دیکھا تو میں نے اس عمارت کو کوئی بار ہے لیکن یہ اتنی وسیع اتنی کشادہ اور اتنی عظیم الشان ہو گی۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا بس چند ہی حصوں تک محدود رہی ہوں میں۔''

''ہاں آمنہ صاحبہ! عمارت واقعی بہت شان دار ہے۔ لیکن اس تمام ہنگامہ خیزی کا مقصد کیا ہے۔ کیا ملے گا اس سے؟''

''بس دادا ابو کا شوق ہے۔ رفاہ عامہ کے لیے وہ یہ کام کر رہے ہیں۔''

''خیر یہ بات بری تو نہیں ہے لیکن تعجب خیز ضرور ہے کہ دادا ابو رفاہ عامہ کے لیے کام کر رہے ہیں اور خود ان کی کوٹھی میں رہنے والے اتنی معمولی زندگی گزار رہے ہیں جس شخص نے ان کے خاندان کو اتنی شہرت بخشی کہ تقریباً پورے ملک میں ہی نہیں بلکہ باہر کے ممالک میں بھی ان کے خاندان کو جانا جاتا ہے۔ اس کی کوئی قدر نہیں ہے، ان کے گھر میں، وہ انیکسی میں رہتا ہے۔'' آمنہ جاوید نے کہا۔

''خیر یہ ساری باتیں آپ کے سوچنے کی نہیں ہیں آمنہ جاوید! آپ سنائیے آپ کے کیسے مزاج ہیں۔ کبھی اپنے گھر بھی بلائیے ہمیں۔'' شیری نے کہا۔

''واہ، آپ مجھے کہہ رہے ہیں۔ میں تو کب سے اس کی خواہش مند ہوں۔''

''کمال ہے خواہشیں دل ہی دل میں رکھے رہنے سے کیا فائدہ، کبھی تذکرہ تو کیا ہوتا ہم سے۔'' شیری بولا۔ ایک بار پھر عاقل نے متحیرانہ نگاہوں سے شیری کو دیکھا تھا۔

''تو پھر آج شام ہی کی چائے ہمارے ساتھ ہو جائے۔''

''آج شام کی چائی نہیں کل رات کا کھانا رکھ لیجئے، کیا خیال ہے؟''

''جیسی آپ کی مرضی، آج شام کو کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، بس کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں چونکہ کل ہی آئے ہیں اس لیے پتا نہیں ان کا کیا پروگرام ہو گا۔ بہرطور ان کا کوئی بھی پروگرام ہو میں اور عاقل کل رات آپ کے ہاں کھانے پر آ رہے ہیں۔''

''بسر و چشم، میں انتظار کروں گی۔'' آمنہ نے جواب دیا۔

''آپ کے ڈیڈی سے بھی ملاقات ہو گی نا؟''

''کیوں نہیں ہو گی۔ ڈیڈی خود آپ لوگوں سے ملنے کے شائق ہیں۔ کئی بار مجھ سے کہہ چکے ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے آمنہ صاحبہ! کل شام ساڑھے سات یا آٹھ بجے تک ہم آپ کی کوٹھی تک پہنچ جائیں گے۔''

''او کے میں انتظار کروں گی۔'' آمنہ نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ چلی گئی۔ عاقل گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

''اب یہ نیا کھیل کیا ہے شیری بھائی۔۔'' اس نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''بہت ہی دلچسپ، بہت ہی پر اسرار کھیل عاقل میاں!'' شیری نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

''میں نہیں سمجھا۔''

''یار سمجھ جاؤ گے۔ ہر بات کو سمجھنے کے لیے جلدی مت کیا کرو۔'' شیری نے جواب دیا اور عاقل تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا۔

''ویسے آج کل میں الجھنوں کا شکار ہوں شیری بھائی!''

''کیوں کوئی خاص بات ہے۔''

''وہ۔۔۔ وہ دراصل نفیسہ نے کچھ ایسی باتیں کی ہیں جن سے مجھے الجھن ہوگئی ہے۔''

''نئے مہمانوں کے بارے میں۔۔'' شیری نے سوال کیا۔

''ہاں شیری بھائی! میں دراصل اپنی کم مائیگی اور اپنی حیثیت سے خوف زدہ ہوں۔ مجھے پل صراط پر چلنا ہوگا۔ شیری بھائی! ایک پودا آپ نے میرے سینے پر لگایا ہے۔ اب اسے سینچنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ میں مجبور ہو چکا ہوں شیری بھائی! اب آپ مجھے مجبوروں میں خیال کریں۔ اگر مجھے اپنی زندگی کے اس مشن میں ناکامی ہوئی تو شاید میں جی نہیں سکوں گا۔'' عاقل بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔

''واہ، واہ۔۔۔! یار دو چار فلمیں بھی دیکھ لیا کرو کبھی کم از کم رومانی ڈائیلاگ بولنے کا صحیح طریقہ تو آجائے گا۔'' شیری نے کہا اور عاقل کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''ارے ارے او احمق آدمی، یہ کیا حرکت ہے؟''

''شیری بھائی! میری زندگی کے لیے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ میں نفیسہ کو بھول نہیں سکتا۔'' عا نے شیری کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ شیری کا زور قہقہہ فضا میں گونج اٹھا تھا۔ بچوں کی طرح رو ہوئے عاقل کو دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اسے سینے لگالے۔ بڑا معصوم سا تھا یہ شخص، بالکل ہی فرش صفت۔

''کمال ہے عاقل! ابھی تک تم شیری پر بھروسا نہیں کر سکے اور کون سی زبان استعمال کروں تمہارے لیے۔''

''خدا کی قسم! بات آپ پر بھروسا کرنے کی نہیں ہے۔''

''پھر۔۔۔''

''مجھے خود پر بھروسا نہیں ہے۔ میں تو حالات کی بھول بھلیوں میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کبھی زندگی کے ان معاملات کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن۔۔۔''

''شیری نامی ایک مصیبت تمہارے گلے آپڑی اور اس نے تمہیں اس جال میں پھانس لیا۔ آنسو خشک کرلو عاقل یہ آنسو بے بسی کی علامت ہیں۔ ہم بے بس تو نہیں ہوئے۔''

''جب بھی غور کرتا ہوں شیری بھائی اس سلسلے میں بڑی اونچی اونچی دیواروں میں خود کو محصور سمجھتا ہوں۔ نفیسہ ہمیشہ مجھے ان دیواروں کی دوسری طرف نظر آتی ہے۔''

''یہ صرف تمہارے احساس کی دیواریں ہیں عاقل! وقت سے پہلے ناکامی کا تصور نقصان دہ ہوتا ہے میرے دوست! شیری کو دیکھ کر کتنی آنکھوں کی کھٹک ہے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ویسے نفیسہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس نے بابر علی اور بیگم صاحبہ کی باتیں سن لی ہیں۔''

''ثاقب کے بارے میں؟''

''ہاں۔''

''ثاقب اس قابل نہیں ہے کہ نفیسہ کا نام بھی

ے ساتھ لیا جائے۔ تم فکر مت کرو میرے
۔ ارے ہم نے تو اپنی زندگی ہی ایسے کاموں
لیے وقف کر دی ہے۔ ہم زندہ ہیں تو فکر کیسی۔"

"یہ آمنہ جاوید میرے ذہن میں بری طرح
رہی ہے۔ کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے میرے
لیے۔"

"شاباش! جتنا سوچو گے اتنی ہی مصیبتیں اپنے
اطراف محسوس کرو گے۔ آؤ یار کام کرنا ہے۔ آؤ۔"
ری نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور دونوں
آگے بڑھ گئے۔

گھر آ کر لباس وغیرہ بھی تبدیل نہیں کیا تھا
ری نے کہ جاسوس اعظم نے اندر آنے کی اجازت
مانگی اور شیری نے اکبر کو اندر بلا لیا۔ اکبر نے سلوٹ
کیا تھا۔

"ہیلو سیکرٹ آفیسر! کیا رپورٹ ہے؟"

"گرما گرم چیف! ایک کیسٹ سنانے آیا ہوں
آپ کو، کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ تمہارے کام جاری ہیں۔"

"میں ایک ذمہ دار ایجنٹ ہوں چیف! دشمن پر
نگاہ رکھنا میرا فرض ہے۔"

"گڈ کیا رپورٹ ہے؟"

"جنرل رپورٹ کی چند جھلکیاں سن لیجیے۔ بیگم
ماہ جبین غسل خانے میں پھسل گئیں۔ ان کی کان پھاڑ
دینے والی چیخ سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے
لگے تھے۔ اتفاق سے کرنل صاحب کمرے میں موجود
تھے۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کی مدد کی اور ساتھ ہی
الٹ ڈپٹ بھی۔"

"خاصی دلچسپ ہے۔ ایک منٹ۔" اکبر نے
کہا اور اپنے لباس سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لیا
اور چند لمحات کے بعد کیسٹ سے آوازیں آنا شروع
ہو گئیں۔ چیخ اور دھماکے کی آواز کافی زوردار تھی۔ اس
کے بعد کرنل یوسف صاحب کی آواز ابھری۔

"ارے۔ ارے، کیا ہوا تمہیں؟"

"کیا ہوا۔ کیا ہوا کیے جا رہے ہو۔ یہ نہیں کہ
مجھے اٹھاؤ۔ ہائے میری ہڈی ٹوٹ گئی۔"

"جی کیا فرمایا آپ نے ہڈی، عزیزہ ہڈی آپ
کے بدن میں ہے کہاں۔ ہو گی بھی بے چاری تو
گوشت کے تودوں کے نیچے اس طرح دب گئی ہے
کہ اب اس تک ضرب پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اٹھیے تو
اب مجھ غریب کی زندگی کے لیے کیوں عذاب بنی
ہوئی ہیں۔ آپ خود بھی کوشش فرمائیے مجھ نحیف و
ناتواں میں اتنی سکت کہاں ہے۔

کہہ تو بہت عرصے سے رہا ہوں خاتون آپ
سنیں تو سہی کتنی بار کہا ہے کہ کھانے میں احتیاط
رکھیں۔ یہ گوشت کی تہیں جمتی چلی جائیں گی تو پھر کم
نہیں ہوں گی۔

اب باہر تشریف لے آئیے تو بڑی عنایت ہو گی
ورنہ اگر کوئی آ گیا اور ہمیں یہاں دیکھ لیا تو نہ جانے کیا
کیا کہانیاں ہمارے بارے میں سنائی دیں گی۔"

"افوہ! مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جا رہا۔"

"کوشش کیجیے۔ کوشش کیجیے۔"

"دیکھو! میں اب اس مذاق کی متحمل نہیں
ہو سکتی۔ تم میرے بارے میں یہاں کچھ نہیں کہو
گے۔"

"ہم نہیں کہیں گے عزیزہ تو اس سے کیا ہو گا۔
دنیا کہہ رہی ہو گی۔" کرنل نے جواب دیا۔

"بھلا کیا کہہ رہی ہو گی؟"

"تمہارا موٹاپا دیکھ کر مجھ پر ہنستی ہو گی دنیا۔"

"میں کہے دیتی ہوں۔ میرا پیٹ نہیں بھرتا۔
میرے لیے انتظام کرو۔ کیا ارادے ہیں تمہارے۔
مجھے یہاں لا کر ختم کرنا ہے۔"

"ارے نہیں محترمہ! آپ کو تو ہم کہیں بھی لے
جا کر ختم نہیں کر سکتے اور آپ ختم ہونے والی چیز ہی
کہاں ہیں۔"

"مار ڈالو، زہر دے دو مجھے۔"

"زہر۔۔۔ خدا کی پناہ کتنا زہر لائیں گے آپ
کے لیے دو چار بالٹی لانا پڑے گا اور آپ کو اندازہ ہے
کہ دو چار بالٹی زہر کہیں نہیں ملتا۔"

''دیکھو میں کہتی ہوں خاموش ہوجاؤ۔ میرے چوٹ لگی ہے اور تم مذاق اڑائے جارہے ہو۔''

''اچھا بھئی خاموش ہوجاتے ہیں۔ خاموش رہ رہ کر تو یہ حال ہوگیا۔ کیا کہیں آپ سے۔'' کرنل صاحب نے کہا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند لمحات خاموشی رہی پھر کرنل صاحب نے سوال کیا۔

''ویسے بیگم آپ سے گفتگو کرنا تھی۔''

''کیسی گفتگو؟''

''کیسا پایا آپ نے اس ماحول کو؟''

''ٹھیک ہے۔ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''میرا مطلب ہے وہ بچی۔''

''ہاں بچی مجھے پسند ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔''

''اور وہ گدھا۔ وہ گدھا بھی کچھ کررہا ہے۔ اس سلسلے میں یا نہیں؟''

''وہ کیا کرے بے چارہ۔''

''اس نے اپنے بارے میں کیا تاثرات چھوڑے ہیں یہاں پر۔ ابھی تک اس کی اونگھنے کی عادت نہیں گئی۔''

''اونہہ! تم اس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ کہاں اونگھتا ہے۔ کم گو ہے ذرا سا خاموش بیٹھ کر سننے کا عادی۔''

''ہاں بھئی سننے کے عادی تو ہم بھی ہو چکے ہیں حالانکہ پہلے نہیں تھے۔''

''اب تمہیں اپنی شکایات کرنے سے فرصت ملے تو کوئی اور بات کروں تم سے۔''

''اوہو۔ کوئی بات کرنی ہے۔''

''ہاں۔''

''فرمایئے۔ فرمایئے۔''

''میں کہہ رہی تھی کہ جدید دور کی لڑکی ہے۔ بلاشبہ خوب صورت ہے پیاری ہے۔ اچھی طبیعت کی مالک ہے مگر اس کے بارے میں کم از کم اپنے ثاقب کا بھی تو خیال معلوم کرلیا جائے۔''

''کیا مطلب۔ صاحبزادے بے خیال ہیں۔''

''نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ ظاہر۔ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں اس کی ابتدا تو ہو چاہیے۔''

''مثلاً کس انداز میں؟''

''ثاقب سے آپ بات کیجئے۔ اس سے کہیے کہ نفیسہ کا قرب حاصل کرے۔ اس کے نزدیک رہ کر اس کی فطرت اور اس کی شخصیت کے بارے میں اندازہ لگائے۔''

''یہ حسین الفاظ اگر آپ ہی ان سے فرمادیں تو کیا ہرج ہوتا ہے۔''

''تمہاری بات پر زیادہ توجہ دیتا ہے مجھے تو وہ اپنے برابر کی سمجھتا ہے۔''

''تھوڑی ہی سی بڑی ہوں گی آپ اس سے۔ اگر سمجھتا ہے تو کیا غلط ہے۔'' کرنل صاحب نے کہا۔

''پھر مذاق! میں سنجیدہ ہوں۔''

''اچھا۔ اچھا بھئی تو بلایئے اس احمق کو۔'' کرنل صاحب نے کہا اور بیگم صاحبہ شاید اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ دو تین کراہوں کے بعد وہ دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی تھی۔ کرنل صاحب دھیمی آواز میں کوئی شعر گنگنا رہے تھے۔ چند لمحات کے بعد کیسٹ سے ثاقب کی آواز ابھری۔

''ڈیڈی آپ نے بلایا ہے مجھے؟''

''ہاں میاں! بلایا ہے۔ کچھ گفتگو کرنا تھی آپ سے۔''

''جی۔ جی فرمایئے میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔''

''حاضر ہی رہنا بیٹا! اگر غائب ہوئے تو خوامخواہ مجھے غصہ آجائے گا۔''

''جی۔'' ثاقب نے مدہم لہجے میں کہا۔

''عزیزم تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں اس مکان میں کیوں لایا گیا ہے۔'' کرنل صاحب نے سوال کیا۔

''جی۔ جی ڈیڈی میں نہیں سمجھا۔'' ثاقب

صاحب نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہائے یہ نا سمجھی ہی تو میرے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ میاں یوں کہو کہ بار بار میرے منہ سے سننا چاہتے ہو۔ صاحبزادے! میں یہاں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی۔ جی وہ تو میں جانتا ہوں۔'' ثاقب نے جواب دیا

''اور شادی یونہی نہیں ہو جاتی۔ تمہاری ان امی جان کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کن کن الجھنوں سے گزرنا پڑا تھا۔ کچھ معلوم ہے اس بارے میں۔''

''جی نہیں مجھے اس بارے میں کیا معلوم۔'' ثاقب نے جواب دیا۔

''امی جان سے پوچھیے، ذرا ہمارے دل سے پوچھیے۔ بہرطور سلسلہ یہ ہے میاں کہ نفیسہ کو تم سے منسوب کرنا ہے۔ بتایا تو تمہیں پہلے بھی جا چکا ہے۔ تم نے اب تک اس سلسلے میں کیا کیا؟''

''کک۔ کچھ نہیں۔''

''جی ہاں مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہیں کریں گے۔ ہمیشہ سے کھیاں مارنے کے عادی ہو۔ اب اس شخصیت کے بارے میں معلوم کرو کہ وہ کیسی ہے کس شخصیت کی مالک ہے تمہیں پسند ہے، وہ تمہیں پسند کرتی ہے یا نہیں، کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا اسے تم سے شادی پر۔''

''مم۔ مم۔ میں۔۔۔ میں کیسے معلوم کروں ابی!''

''بیٹے دو چار کتابیں پڑھ لی ہوتیں تو کچھ نہ کچھ تو سلیقہ آ جاتا۔ تم تو بس آرٹ کی دنیا میں کھو جانے کے عادی ہو۔ نفیسہ کے کمرے میں جاؤ اس سے گفت و شنید کرو، تعلقات بڑھاؤ۔ خاص طور پر اس سے یہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ سب کچھ جاننا ضروری ہے بیٹے تمہارے لیے۔ انہی کوششوں کے لیے تمہیں یہاں لایا گیا ہے اور اگر تم یہاں بھی ناکام رہے تو پھر بہتر ہے کہ واپس چلتے ہیں۔ یہاں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔''

''نہیں ڈیڈی آپ جو حکم دیں گے میں کروں گا۔'' ثاقب نے جواب دیا۔

''جیو میاں چھو! بڑے ہی سعادت مند ہو۔ شادی کے بعد بھی کوشش کرنا کہ ہمارے ہی احکامات کی پابندی کرتے رہو ورنہ عموماً اس سلسلے میں تجربات زیادہ بہتر نہیں ہوتے۔''

''جی۔'' ثاقب نے جواب دیا۔

''بس جاؤ میاں! آرام کرو۔ ہم نے اسی لیے تمہیں بلایا تھا۔ تو پھر یہ کوشش شروع کر دینا۔ اب دوبارہ ہدایت کی ضرورت نہ پیش آئے۔''

''جی!'' ثاقب نے جواب دیا اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

اکبر نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ بند کر دیا۔ پھر اس نے بتایا۔

''اس کے بعد یہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

''بھائی اکبر میاں! جاسوس ہو تو تم جیسا۔ سچ جانو اگر اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہوتے تو لوگ تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتے۔ بہرطور ترقی کرو گے یہ ہماری پیش گوئی ہے۔'' شیری نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ چیف! اب میرے لیے کیا ہدایت ہے؟''

''کام جاری رکھو۔ ویسے طریقہ کار کیا ہے تمہارا۔''

''جب کمرے میں نہیں ہوتا تو ٹیپ ریکارڈر ورنہ عموماً جب کمرے میں ہوتا ہوں دروازہ بند کر کے خود ہی ریسیور پر ہر جگہ کنٹیکٹ کرتا رہتا ہوں۔''

''گڈ، ویری گڈ، ویسے تینوں کمروں میں ڈکٹا فون کام کر رہے ہیں؟''

''یقیناً''

''لیکن ریکارڈنگ تینوں کمروں کی ایک ساتھ نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں یہ پرابلم تو ہے۔''

''چلو کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے چوتھا ڈکٹا فون بھی استعمال کرنا ہوگا۔''

''چوتھا! وہ کہاں۔۔۔'' اکبر نے سوال کیا۔

''بھئی اس گھر میں سب سے خطرناک شخصیت میرا مطلب ہے۔ سب سے زیادہ اہم شخصیت بابر علی صاحب کی ہے۔ یہ ضروری ہے اکبر کہ ایک ڈکٹا فون وہاں بھی لگایا جائے۔''

''لگ جائے گا چیف آپ فکر نہ کریں۔''

''لیکن نہایت ہوشیاری کے ساتھ۔ تم سمجھتے ہو کہ ہمیں اگر زبردست ذہنی جنگ لڑنی ہے تو بابر علی صاحب سے۔''

''او کے چیف ان کے کمرے میں چوتھا ڈکٹا فون پہنچا دیا جائے گا۔''

''لیکن میاں! ہوشیاری کے ساتھ ہم اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''

''آپ فکر نہ کریں میں اب بہت ٹرینڈ ہو چکا ہوں۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''خداوند کریم تمہیں اور زیادہ ٹرینڈ کرے۔'' شیری نے کہا۔

''اجازت چیف؟''

''او کے۔'' شیری بولا اور اکبر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''اس کا مقصد ہے کہ اب ثاقب میاں، نفیسہ کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں گے۔ چلو ٹھیک ہے نفیسہ کوئی کمزور شخصیت نہیں ہے، ٹھیک کر دے گی ثاقب صاحب کو۔'' شیری نے سوچا اس کے بعد اس کا ذہن آمنہ جاوید کی جانب بھٹک گیا۔ آمنہ جاوید کا سلسلہ تو کسی وقت بھی ختم ہو سکتا تھا لیکن جاوید ہاشمی کا معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ یہ کہانی جو شیری کے کانوں میں پڑ چکی تھی بڑی اہمیت رکھتی تھی اس کے لیے بہت سے اہم مسائل اس کی نگاہوں میں آ گئے تھے۔

رات حسب معمول تھی۔ کھانے کے بعد دوسری دلچسپیوں پر غور کیا جانے لگا۔ پروگرام بنائے گئے کہ کیا کیا کرنا چاہیے۔ بابر علی صاحب نے بدر کو ہدایات جاری کیں اور کہا کہ ثاقب اور مارہ رخ کو وطن کی سیر کرائی جائے۔ بدر بے چارہ خاموش رہا تھا۔ لیکن دادا ابو نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ لیکن مہمانوں کی وجہ سے وہ کچھ بولے نہیں۔ اس کے بعد بزرگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور یہ تمام ایک جگہ جمع ہو گئے۔ خوش گپیاں ہونے لگیں۔ ثاقب صاحب کا وہی طرز عمل تھا۔ کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی آج بھی ان کے انداز میں۔ رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔ دوران گفتگو ''اپنا گھر'' کا ذکر بھی آیا تھا اور ماہ رخ نے آج بھی اس سلسلے میں کچھ تفصیل جاننے کی فرمائش کی۔

''بھئی یہ نام ہمیشہ مجھے چبھتا ہے آخر ہے کیا چیز۔''

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو کل اس چیز کا جائزہ لے لیں۔ ویسے مجھے تعجب ہے بابر علی صاحب نے آپ لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''کبھی تذکرہ ہی نہیں ہوا۔'' ماہ رخ نے کہا۔

''تو پھر کل آپ میرے ساتھ ''اپنا گھر'' دیکھنے کی دعوت قبول فرمائیے۔'' شیری نے کہا۔

''کب چلیں گے؟''

''بس صبح دس بجے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد۔''

''ہم تیار ہو جائیں گے۔ نفیسہ آپ بھی چلیں گی نا؟''

''آپ کہیں گی تو میں ضرور چلوں گی۔'' نفیسہ نے کہا۔

''اور ہم کہیں گے تو۔'' ثاقب صاحب بولے اور نفیسہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کمال ہے آپ کا کہا تو کبھی ٹالا ہی نہیں جا سکتا ثاقب صاحب!''

''بہر طور کل۔'' شیری نے فوراً ہی بات اچک لی اور اس کے بعد یہ نشست برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن صبح دس بجے تمام لوگ گاڑیوں

میں بیٹھ کر ''اپنا گھر'' چل پڑے۔ راستے میں گفتگو ہوتی رہی تھی۔ عاقل بھی ساتھ تھا۔ دادا ابو بھی تھے۔ بدر بھی تھا۔ نفیسہ اور ان دونوں کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ بابر علی صاحب نے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بس منہ بنا کر خاموش ہو گئے تھے۔ ویسے وہ شیری سے شاذونادر ہی گفتگو کیا کرتے تھے۔ پتا نہیں اس بات کو ابھی تک دوسرے لوگوں نے محسوس کیا تھا یا نہیں۔ کرنل صاحب بابر علی صاحب کے ساتھ کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ اپنا گھر پہنچ گئے۔ عمارت دیکھ کر ماہ رخ نے ہونٹ سکوڑے تھے۔

''کمال ہے بھئی۔ یہ تو کوئی بڑا ہی عظیم الشان منصوبہ ہے۔ مگر ہے کیا؟''

''آیئے میں آپ کو پہلے اس کی سیر کراؤں۔ اس کے بعد اس کے بارے میں تفصیلات بتائی جائیں گی۔''

''مجھے اجازت۔'' بدر نے کہا۔

''ہاں، ہاں تم جاؤ، عاقل تم بھی اپنا کام دیکھو۔ میں معزز مہمانوں کو ''اپنا گھر'' کی سیر کرا رہا ہوں۔'' شیری نے کہا اس کے بعد وہ نفیسہ، ماہ رخ اور ثاقب کو لے کر ''اپنا گھر'' کے مختلف حصے دکھانے لگا۔ رہائشی عمارت، فنی شعبے اور دوسری تمام چیزوں کے معائنے میں ہی کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران میں بار بار شیری سے اس بارے میں پوچھا گیا۔ لیکن اس نے کہا کہ پہلے ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا جائے، اس کے بعد وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں تفصیلات بتائے گا۔ بدر کا کلینک بھی دیکھا گیا۔ اتنا شاندار کلینک دیکھ کر ماہ رخ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے۔ یہ تو یورپ کے معیار کا ہے۔ اتنے خوب صورت سے کلینک کا تو میں نے تصور تک بھی نہیں کیا۔ یہ آپ کا ہے بدر؟''

''نہیں میرا نہیں۔ یہ ہمارے وطن میں بسنے والے لوگوں کا ہے۔ یہاں ان لوگوں کا علاج ہوگا جو اپنے علاج معالجے کے لیے اس اسٹینڈرڈ کے اسپتالوں میں نہیں پہنچ سکتے۔'' بدر نے کہا۔

''کیا مطلب۔ اب بھی مجھے تفصیل نہیں بتائی جائے گی۔'' ماہ رخ نے پوچھا۔

''آیئے تشریف لایئے۔ بدر، دادا ابو کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں۔ میرا خیال ہے معائنہ ہی کر رہے ہیں کسی کام کا۔ دفتر میں موجود نہیں ہیں۔'' بدر نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ دفتر میں آ بیٹھے۔

''ہاں ماہ رخ صاحبہ! آپ ''اپنا گھر'' کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھیں۔ دراصل یہ ایک رفاہی ادارہ ہے جو سو فیصدی ہماری ذاتی کاوشوں اور کوششوں سے قیام میں آیا ہے۔ یہاں ہم ملک کے ان ناداروں اور پریشان حال لوگوں کے لیے کام کریں گے جن کے اپنے وسائل نہیں ہوتے۔'' شیری اپنا گھر کے بارے میں تفصیلات بتاتا رہا اور ماہ رخ حیرت سے منہ کھولے یہ تمام تفصیل سنتی رہی۔ پھر جب شیری خاموش ہوا تو متحیرانہ انداز میں بولی۔

''میرے خدا۔۔۔! اس قسم کے منصوبے سرکاری طور پر تو بہت سے ممالک میں نظر آتے ہیں لیکن نجی۔۔۔ میں نے کہیں ایسا کوئی ادارہ نہیں دیکھا اور پھر یہ کوئی معمولی جگہ نہیں ہے۔ آپ نے کمال کر ڈالا ہے۔ اس سلسلے میں کروڑوں روپے خرچ کر ڈالے ہوں گے۔''

''ہاں دادا ابو اس کے بانی ہیں اور انہوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا اور جو دوسروں سے حاصل کر سکتے تھے اس میں صرف کر دیا ہے۔ اس ادارے کے اپنے چھوٹے چھوٹے ذیلی ادارے بھی ہوں گے جو اس کے لیے روپیہ فراہم کریں گے اور اس طرح یہ اپنا کام شروع کر دے گا۔''

''خدا کی قسم میں بڑی متاثر ہوئی ہوں۔ یہ منصوبہ کس کا تھا؟''

''شیری بھائی کا۔'' بدر نے عقیدت سے کہا اور

ماہ رخ عجیب سی نگاہوں سے شیری کو دیکھنے لگی۔ شیری سے آنکھیں ملیں تب بھی اس نے آنکھیں نہیں جھکائی تھیں۔ بس اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آرہے تھے۔ شیری اس سے نگاہیں ہٹا کر ثاقب کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پر بالکل سو جانے کی سی کیفیت تھی۔

''ثاقب صاحب!'' اس نے آواز دی اور ثاقب صاحب بری طرح جھونکا کھا گئے۔

''ایں۔۔۔'' انہوں نے متحیرانہ لہجے میں کہا اور ماہ رخ برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''ثاقب بھائی کو تو بس نیند کے علاوہ اور کسی بات سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔''

''میں سو کہاں رہا تھا۔''

''ہاں، ہاں ماہ رخ! ثاقب صاحب سو تو نہیں رہے تھے۔'' شیری نے کہا۔

''بس بس جانے دیجیے ان کی بات۔ عاجز آ گئی ہوں ان کی اس عادت سے میں۔'' ماہ رخ بولی۔

''مم! مگر میں سو کہاں رہا تھا۔''

''پھر کیا کر رہے تھے آپ۔'' ماہ رخ نے سوال کیا۔

''سن رہا تھا۔ سب کچھ سن رہا تھا۔''

''کیا سنا آپ نے۔''

''وہ ادارہ ''میرا گھر''۔۔۔ ہمارا گھر مم میرا مطلب ہے ''اپنا گھر۔'' ثاقب صاحب نے جواب دیا۔

''واہ خوب سمجھے آپ خوب سمجھے واقعی گھر۔'' ماہ رخ نے کہا اور ہنس پڑی پھر شیری کو دیکھ کر بولی۔

''شیری صاحب! یہ منصوبہ آپ کے ذہن میں آیا کیسے؟''

''ارے اب میرا انٹرویو نہ لینا شروع کر دیجیے ماہ رخ صاحبہ! دراصل یہ ہم سب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ بدر کے بارے میں آپ شاید تفصیل نہیں جانتیں۔ انہوں نے ڈاکٹری کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلینک کھول کر ہزاروں اور لاکھوں کمانے کے بارے میں نہیں سوچا بلکہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وطن کے ان غریب عوام کے لیے وقف کر دیا ہے جو نادار ہیں اور اچھے علاج سے محروم ہیں۔ یہ کلینک مفت کام کرے گا۔ یہاں جدید ترین مشینیں ہوں گی۔ حسب استطاعت یہاں انیس فیصد کوٹہ ناداروں کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور بیس فیصد ان صاحب ثروت لوگوں کے لیے جو کسی طور پر یہاں کی افادیت سے متاثر ہو کر اپنا علاج یہاں کرانا پسند کریں گے۔ ان کے لیے یہ ملک کا سب سے مہنگا ترین اسپتال ہوگا۔ کیوں کہ وہی لوگ تو اسے چلانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ بڑے منصوبے ہیں ہمارے دیکھیے کب تک ان کی تکمیل ہوتی ہے۔'' شیری نے کہا۔ ماہ رخ شیری کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اس نے متاثر لہجے میں کہا۔

''شیری! بلاشبہ ہم اسے دنیا کا عظیم ترین منصوبہ کہہ سکتے ہیں۔ کاش میں خود بھی اس منصوبے کی تکمیل میں کچھ حصہ لے سکتی۔''

''شکریہ! آپ کے یہ الفاظ ہی ہمارے لیے بہترین عطیہ ہیں ماہ رخ صاحبہ۔''! شیری نے جواب دیا۔

پھر وہ سب دادا ابو کی آمد کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔

''کیا گفتگو ہو رہی ہے بھئی بچوں کے درمیان۔۔'' دادا ابو نے پوچھا۔

''دادا ابو آپ ماہ رخ اور ثاقب صاحب سے ٹھیک سے ابھی تک نہیں ملے۔ سرسری سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔''

''بھئی فرصت ہی کہاں ہے۔ ویسے کس قسم کے بچے ہیں یہ۔'' دادا ابو نے پوچھا۔

''نہایت ہی نفیس۔ بڑی اچھی شخصیت کے مالک۔'' شیری نے جواب دیا۔

''جب شیری کہہ رہے ہیں تو ہم نے تسلیم

کرلیا۔ کہو بچو، تم نے ''اپنا گھر'' کا معائنہ کیا۔''

''ہاں! دادا ابو! آپ کی عظمت کا اعتراف دل میں لے کر ہم یہاں سے رخصت ہوں گے۔''

''ارے نہیں بھئی، میں کیا اور میری بساط کیا۔ سچ جانو تو یہ بچہ جسے لوگ شیری کے نام سے جانتے ہیں بس یہ ان تمام چیزوں کا بانی ہے۔ میرا تو نام صرف ٹائٹل کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے۔''

''نہیں دادا ابو آپ مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔''

''اچھا چھوڑو نہیں گھسیٹتے۔ ان بچوں کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ کافی بنواؤ ہم بھی پئیں گے۔'' دادا ابو نے کہا۔

کافی کے دور کے بعد ان لوگوں کو یہاں سے رخصت کردیا گیا۔ انہیں چھوڑنے کے لیے عاقل کو طلب کرلیا گیا تھا۔ شیری اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ اس کے بعد شام کو جب انہیں فرصت ہوئی تو شیری نے عاقل سے کہا۔

''آمنہ جاوید کے ہاں چلنا ہے۔''

''شیری بھائی! میں تو اس تصور ہی سے بڑا خوف زدہ ہوں۔ اگر نفیسہ کو پتا چلا تو وہ کیا سوچے گی۔ دل میں اگر نہ بھی سوچے تب بھی اس سے رسم وراہ بڑھانے سے کیا فائدہ، عجیب لڑکی ہے۔''

''عاقل یوں سمجھو کہ میں اس سے ملتے رہنا چاہتا ہوں۔''

''ارے ارے شیری بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ۔'' عاقل نے تعجب سے پوچھا۔

''بس، بس زیادہ اونچی اڑان کی کوشش مت کرو عاقل، یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''خدا کا شکر ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ ورنہ مجھے تو سر پیٹ لینا پڑتا۔'' عاقل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں گھر چل کر تیاریاں کرتے ہیں۔ کوئی بہانہ کردیا جائے گا۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' عاقل نے کہا اور پھر وہ گھر واپس پہنچ گئے۔

گھر کی رونق حسب معمول تھی۔ شام کی چائے ساتھ پی گئی اور اس کے بعد شیری نے دادا ابو سے کہا۔

''دادا ابو! ایک بہت ہی ضروری کام سے مجھے عاقل کے ساتھ جانا ہے۔ آپ مجھے صرف چند گھنٹوں کی اجازت مرحمت فرمادیجئے۔''

''ٹھیک ہے کس کام سے جاؤ گے؟''

''بس ایسے ہی ''اپنا گھر'' کے کچھ معاملات ہیں ذرا اس سلسلے میں ہمیں ایک دو آدمیوں سے ملنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کب تک واپسی ہوجائے گی؟''

''ممکن ہے کہ رات کے کھانے پر آپ سے ہماری ملاقات نہ ہوسکے۔''

''او۔ کے کوئی بات نہیں ہے۔'' دادا ابو نے کہا۔ ماہ رخ اور دوسرے لوگ بھی یہ باتیں سن رہے تھے۔

بہرطور اس سلسلے میں ان سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔ شیری نے بڑا عمدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ عاقل بھی ایک خوب صورت سوٹ میں ملبوس تھا۔ وقت مقررہ پر یہ لوگ اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔ آمنہ جاوید کا پتا انہیں معلوم تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جس کوٹھی پر پہنچے اس کی شان وشوکت دیکھنے کے قابل تھی۔ بڑی ہی خوب صورت سی کوٹھی تھی۔ شیری کے سینے میں اس کوٹھی کے بارے میں ایک راز تھا۔ جس سے عاقل بالکل ناواقف تھا وہ تو بس معمولی سی حیثیت میں شیری کے کہنے کی وجہ سے یہاں تک آگیا تھا۔ اس کوٹھی کے برآمدے میں آمنہ بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''دیر نہیں ہوگئی آپ لوگوں کو۔'' اس نے کہا۔

''میرے خیال میں نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے انتظار میں شدت ہو۔'' شیری نے کہا۔

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں تو نہ جانے کب سے برآمدے میں کھڑی آپ کا انتظار کررہی ہوں۔''

''شاید صدیوں سے۔۔'' شیری نے کہا۔

''شاید۔'' آمنہ جاوید کی آنکھیں عاقل پر گڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

''مجھے اس کوٹھی کے درودیوار شکایت کرتے محسوس ہو رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک عظیم فن کار کے شایان شان استقبال نہیں ہوا۔ اس وقت تو درودیوار سے موسیقی کی آوازیں آنی چاہیے تھیں۔ ملک کا اتنا بڑا فن کار ہماری اس معمولی سی رہائش گاہ میں آیا ہے۔ کاش عاقل صاحب میں آپ کو آپ کے شایان شان خوش آمدید کہہ سکتی۔''

''واہ، واہ عاقل! حسد ہو رہا ہے مجھے تم سے۔ یہ الفاظ صرف تمہارے لیے ہیں۔ ہم تو تمہارے ساتھ ایک طفیلی کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' شیری نے کہا اور عاقل بری طرح چھپنے لگا۔

''اب اگر مناسب سمجھیں خاتون! تو اس برآمدے کے بعد کوٹھی کے اندرونی حصوں کو بھی اس فن کار کے قدموں سے سرفراز فرمادیں۔'' شیری نے کہا اور آمنہ جاوید چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر سنبھل کر بولی۔

''ارے ہاں! آیئے آیئے ڈیڈی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

شیری ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ ڈیڈی کے نام کے ساتھ ہی اسے حمیدہ بیگم کی کہانی یاد آگئی تھی۔ گویا کہ عاقل اپنے ہی باپ کے سامنے ایک اجنبی کی حیثیت سے پیش ہونے والا تھا۔ بہرطور وہ ان لوگوں کے ساتھ آگے چل پڑا۔ پھر وہ ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ رائنگ روم بہت حسین اور کشادہ تھا جیسا کہ اس عظیم الشان کوٹھی کا ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ آمنہ نے انہیں بیٹھنے کی پیش کش کی اور پھر گھنٹی بجا کر ایک ملازم کو طلب کرلیا۔ بڑا اہتمام کیا تھا اس نے، ملازموں وغیرہ کے لباس میں بھی نمائش کی شائستگی تھی۔ چنانچہ جو کچھ بھی کر لیتی کم تھا۔ ملازم سے اس نے جاوید ہاشمی صاحب کو اطلاع کروائی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا بلند قامت شخص اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں پائپ اور تمباکو کا پاؤچ دبا ہوا اچھی صحت کا مالک تھا۔ ان دونوں نے کھڑے ہو کر اس کے بڑے احترام سے استقبال کیا اور جاوید ہاشمی صاحب مسکراتے ہوئے اندر آگئے۔ انہوں نے ان دونوں سے ہاتھ ملایا تھا۔

''میرا نام جاوید ہاشمی ہے اور آپ میں سے ایک یقیناً شیری صاحب اور ایک عاقل صاحب ہیں۔ اب یہ بتادیجئے کہ عاقل کون ہے اور شیری کون ہے۔''

''یہ عاقل ہیں اور میرا نام شیری ہے۔'' شیری نے آہستگی سے کہا۔

''مسرت ہوئی تم لوگوں سے مل کر، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آمنہ کا سلیکشن غلط نہیں ہے۔''

''جی۔'' شیری نے کہا۔

''ہاں! میں نے اسے ہمیشہ یہی ہدایت کی ہے کہ دوستوں کے انتخاب میں شخصیت کا دخل ضرور ہونا چاہیے۔ اچھے چہرے اور کشادہ پیشانیاں بہترین انسان کی علامت ہوتی ہیں۔ ویسے تو دولت مندوں کا ایک ریوڑ ہے جنہوں نے مختلف ذرائع سے دولت حاصل کر کے خود کو ممتاز کرلیا ہے لیکن چہروں کی پاکیزگی اور شرافت آسمان سے ودیعت ہوتی ہے آپ لوگوں سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

''شکریہ جاوید صاحب۔ آمنہ کو ہنر پسند ہیں۔ عاقل مصور ہیں اور آمنہ کو ان کی مصوری بہت پسند ہے۔''

''ہاں آمنہ کے بیڈ روم میں میں نے ایک تصویر دیکھی ہے۔ جسے اس نے بہت زیادہ قیمت پر خریدا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ عاقل کی ایک شاگردہ کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ بھئی اگر یہ تجریدی نہ ہوتی تو ہم بھی اس کی تعریف وتوصیف میں کچھ کہتے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کاروباری رہے ہیں۔ فنون لطیفہ سے بہت زیادہ واقفیت نہیں رہی۔ کوئی اچھی چیز نظر آئی تو زبان سے کہہ دیا کہ اچھی ہے۔ لیکن اس کی اچھائی کی تشریح کبھی نہ کرسکے۔'' جاوید ہاشمی صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بڑے اچھے الفاظ میں آپ نے اس تصویر کی تعریف کی ہے جاوید صاحب!'' شیری نے کہا۔

''عاقل بہت کم گو معلوم ہوتے ہیں۔''

''ہاں! یہ حقیقت ہے۔ فن کار اپنے فن میں کھویا رہتا ہے۔ اسے عام زندگی کے ہنگاموں سے بہت زیادہ رغبت نہیں ہوتی ہے۔''

''خیر اب ایسا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ فن اپنی جگہ دنیا اپنی جگہ کیوں عاقل؟''

''جی بالکل درست فرمایا آپ نے بس یہ محبت ہے آپ سب کی کہ مجھے کسی قابل سمجھا جاتا ہے ورنہ آپ یقین فرمائیے میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بہت ہی کمتر سمجھا ہے۔'' عاقل نے جواب دیا۔

''اچھا اب یہ بتائیے کیا پئیں گے آپ لوگ، میرا خیال ہے ایک ایک کپ کافی ہوجائے۔ میں نے اپنی چند سہیلیوں کو بھی بلایا ہے۔ انہیں آپ سے متعارف کرواؤں گی۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر انہیں ذرا دیر کا وقت دیا ہے تاکہ ہنگاموں کا شکار نہ ہوجائیں۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

''بہتر ہے آپ کافی پلوا دیجیے۔'' شیری نے کہا۔

''کیوں عاقل صاحب۔'' آمنہ جاوید عاقل کی طرف دیکھ کر بولی۔

''جج۔ جی ہاں۔ کافی، کافی۔'' عاقل نے جواب دیا اور شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آمنہ نے ایک بار پھر گھنٹی بجادی تھی۔ جاوید ہاشمی صاحب کہنے لگے۔

''بھئی اس وقت میرا مطلب ہے پہلی ہی ملاقات میں کچھ فرمائشیں کرنا مناسب نہیں ہے لیکن یوں سمجھو کہ اپنی زندگی میں آمنہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لیے جب بھی بولتا ہوں اس کی زبان میں بولتا ہوں اور اس کی خواہشات کو ہمیشہ مدنگاہ رکھتا ہوں۔ وہ تم سے مصوری سیکھنے کی شائق ہے عاقل میاں! مجھے تخاطب کی اس بے تکلفی پر معاف کرنا بس بچے ہی محسوس ہوتے ہو اپنے۔ اس لیے تم کا لفظ استعمال کررہا ہوں۔ تو آمنہ مصوری سیکھنے کی شوقین ہے اور بہت سی باتیں کرچکی ہے مجھ سے تمہارے بارے میں، بابر علی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اچھے انسان ہیں۔ بڑے کاروباری ہیں۔ گو ہمارے بہت گہرے تعلقات نہیں ہیں لیکن شناسائی کی حد تک ضرور ہیں۔ آمنہ نے شکایت کی ہے کہ بابر علی نے تمہیں وہ مقام نہیں دیا جس کے تم حقدار تھے۔ اس نے مجھ سے بہت سی سفارشات کی ہیں۔ تمہارے لیے کہتی ہے کہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولی جائے جو تمہارے سپرد کردی جائے حالانکہ دونوں شعبے ذرا مختلف ہیں فن مصوری سے پبلسٹی کی کسی فرم کا کیا واسطہ لیکن آمنہ کاروباری ذہن بھی رکھتی ہے، کہتی ہے کہ وہ اس کاروبار کو ایک نیا رنگ دے گی اور اس قسم کے کام کرے گی جو آج تک کسی ایسی کمپنی نے نہیں کیے ہیں۔ میں پیشکش کرتا ہوں عاقل میاں کہ اگر تم پسند کرو تو اس سلسلے میں، میں تم دونوں کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس بات کو امارت کا مظاہرہ مت سمجھنا بس یوں سمجھو کہ بیٹی کی خواہش پر سر جھکانا مقصود ہے۔''

''جاوید صاحب! بہتر یہ ہے کہ ہم پہلی ملاقات میں کاروباری باتوں سے گریز کریں، جہاں تک فن مصوری سکھانے کا تعلق ہے میں عاقل کی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ جونہی انہیں موقعہ ملے گا آمنہ کی یہ خواہش پوری کردیں گے۔''

''بھئی ایک بات بتاؤ شیری میاں! برا مت ماننا۔ عاقل کی طرف سے تم بہت زیادہ بول رہے ہو۔ تم دونوں کے درمیان آپس میں کیا رشتہ ہے؟''

''یوں سمجھ لیجیے کہ میں عاقل کی زبان ہوں۔''

''بعض اوقات زبان ذہن کا ساتھ نہیں دے پاتی۔'' جاوید صاحب مسکرا کر بولے۔

''تو پھر آپ یوں سمجھ لیجیے کہ میں عاقل کا ذہن ہوں۔''

''بھئی یہ تو کچھ زبردستی والی بات ہوئی۔'' جاوید ہاشمی صاحب مسکرا کر بولے۔

''نہیں انکل! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شیری صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ بلاشبہ درست ہے۔ اگر میری ہی زبان سے سننا چاہتے ہیں تو آپ یقین فرمایئے کہ ان دنوں بہت ہی مصروف ہوں اور فوراً ہی آمنہ صاحبہ کو بھی وقت نہیں دے سکتا۔'' عاقل نے بولنا مناسب سمجھا۔

''ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر مصروف ہو تو ظاہر ہے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ مصروفیت اگر بابر علی صاحب کے لیے ہے تو پھر بے کار ہے بھئی دیکھو یا تو وہ تمہیں تمہاری ان کاوشوں کا بھرپور صلہ دیں یا۔۔۔''

''آپ نے یہ کیسے تصور کرلیا۔ صرف آمنہ صاحبہ کے کہنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔'' عاقل تڑپ کر بولا۔

''کیا مطلب۔ کیا مطلب۔۔۔؟''

''مطلب یہ کہ بابر علی صاحب کی کوٹھی میں، میں اتنا مطمئن و مسرور ہوں جتنا کسی انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ہم بلاوجہ بابر علی صاحب کو الزام دینے لگیں۔ براہ کرم اس سے پرہیز کیجیے۔''

''بہت خوب۔۔۔ بہت خوب بھئی۔ اچھی بات کہی تم نے۔ یہ بھی تمہاری شرافت کی دلیل ہے۔ ممکن ہے کہ آمنہ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ وہ ذرا جذباتی سی لڑکی ہے۔''

''میں بولوں گا تو اب آپ کہنے لگیں گے کہ آمنہ صاحبہ کی نمائندگی کیوں کر رہا ہوں۔''

''نہیں، نہیں بھئی! تم تو بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کہو کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''آمنہ صاحبہ نے خوامخواہ یہ تمام باتیں محسوس کی ہیں اور ان پر یقین کرلیا ہے حالانکہ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کوٹھی میں ہم کوٹھی کے افراد کی مانند رہتے ہیں اور وہاں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے جہاں تک معاوضے وغیرہ کا مسئلہ ہے تو شاید آپ اس بات پر یقین نہ کریں کہ عاقل وہاں سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے بلکہ ہم لوگوں نے ایک اور مشغلہ شروع کر رکھا ہے جس کے لیے عاقل بھی کام کرتے ہیں اور میں بھی ہم اس کا مناسب معاوضہ وصول کرتے ہیں۔

''وہ کیا سلسلہ ہے بھئی ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے۔'' جاوید صاحب نے کہا۔

''اپنا گھر! آپ نے یہ نام سنا ہوگا۔

''کمال ہے۔ نہ سننے کا کیا سوال ہے۔ بابر علی صاحب کا ٹریڈ مارک بن چکا ہے یہ اپنا گھر۔ مگر یہ ہے کیا چیز۔ اس بارے میں آج تک نہیں جان سکے۔ بابر علی صاحب سے بھی کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی کیونکہ ہماری اکثر ملاقاتیں کاروباری ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنا گھر کو بابر علی صاحب سے زبردستی منسوب کردیا گیا ہو کیونکہ انہوں نے خود کبھی اس کا کسی انداز میں تذکرہ نہیں کیا۔

''وہ دراصل ان کے والد حیدر علی صاحب کا اہم مشغلہ ہے اور اس مشغلے پر غالباً کروڑوں کے حساب سے روپیہ خرچ کیا جاچکا ہے۔

''ہاں! بھئی بابر علی صاحب کی آمدنی بھی تو لامحدود ہے۔ ویسے یہ اپنا گھر ہے کیا چیز۔ ہم اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔''

''جگہ جگہ اس کے بارے میں نہیں بتایا جاسکتا۔ اگر آپ کو اس سے دلچسپی ہے جاوید صاحب تو براہ کرم کبھی ہماری دعوت قبول کیجیے۔ ہمارے ہاں تشریف لایئے۔ دیکھیے وہ کیا ہے۔'' شیری نے کہا۔

''ٹھیک ہے اگر تم دعوت دوگے تو ضرور آئیں گے۔'' جاوید ہاشمی نے کہا پھر بولے۔

''ویسے آمنہ کے لیے عاقل میاں چلدی وقت نکال لیں۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ بھی آپ طے کریں گے وہ مجھے بالکل منظور ہوگا۔''

''میں نے عرض کیا نا کہ یہ ساری باتیں بعد کی

ہیں۔ آمنہ صاحبہ نے بڑے پرزور اصرار میں کہا تھا کہ میں اور شیری صاحب ان کے گھر آئیں گے چنانچہ ہم اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''بڑی خوشی ہوئی۔ اب میں کافی پیوں گا تمہارے ساتھ اور پھر چلا جاؤں گا۔ رات کو بھی مجھے ایک کاروباری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔'' جاوید ہاشمی نے کہا۔

کافی بڑی خاموشی سے پی گئی۔ آمنہ کچھ چپ چپ سی تھی۔ پھر جاوید ہاشمی صاحب اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ آمنہ جاوید انہیں لے کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔

''آیئے میں آپ کو کوٹھی دکھاؤں۔''

''بھئی آمنہ! آپ سے ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی۔'' شیری نے کہا۔

''نہیں نہیں فرمایئے۔''

''میں خود کو ایک جملہ معترضہ سمجھ رہا ہوں۔ اس وقت یوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہارے درمیان زبردستی مخل ہو رہا ہوں اگر مناسب سمجھو تو مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو اور عاقل کو کوٹھی دکھا لاؤ۔'' شیری نے کہا۔

''ارے نہیں نہیں آیئے۔ عاقل سے تو پھر تنہائی میں ملاقاتیں ہوں گی کیوں عاقل۔'' آمنہ نے اپنی دانست میں انتہائی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ عاقل نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر وہ کوٹھی کے مختلف حصے دکھاتی رہی۔ اس نے اپنا بیڈ روم دکھایا جہاں نفیسہ کی ایک تصویر آویزاں کی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے نکل کر لان میں آئی تھی کہ دفعتاً دو گاڑیاں اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان میں سے پانچ چھ لڑکیاں نکل آئیں۔ آمنہ اور عاقل کو دیکھ کر وہ اس طرف لپکی تھیں اور چند لمحوں میں ان کے پاس پہنچ گئیں۔ شوخ و شریر سی لڑکیاں تھیں۔ دولت مند والدین کی بیٹیاں، اس کا اظہار ان کے چہرے مہرے اور لباس سے ہو رہا تھا۔ انہوں نے عاقل و شیری سے تعارف حاصل کیا اور آمنہ ان کے بارے میں بتانے لگی۔

''ڈیڈی چونکہ کاروباری میٹنگ پر جانے والے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ رات کے کھانے پر اپنی ان دوستوں کو بھی دعوت دے دوں اچھا ہے ذرا کمپنی رہے گی۔''

''بڑا اچھا کیا آپ نے۔ کوئی حرج نہیں۔'' شیری نے کہا۔

لڑکیاں آمنہ سے عاقل کے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور شاید آمنہ نے عاقل کے بارے میں انہیں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ چنانچہ ان کی آنکھوں میں شرارتیں ناچ رہی تھیں۔ شیری سے بھی کچھ لڑکیاں محو گفتگو تھیں۔ لیکن شیری جیسے شخص کو اڑانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ بس وہ قہقہے ہی لگا رہی تھیں۔ آمنہ نے عاقل کو گھیر لیا تھا اور عاقل بوکھلایا بوکھلایا سا نظر آ رہا تھا۔ اسے کچھ دقت سی ہو رہی تھی۔ پھر ایک اور لڑکی وہاں پہنچ گئی۔ سادہ سے سفید لباس میں ملبوس یہ لڑکی جیسے ہی لان پر پہنچی آمنہ نے نعرہ لگایا۔

''ارے گل نور! اتنی دیر۔۔۔ ہمیشہ ہی دیر سے آتی ہو۔ سب پہنچ گئے بس مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔'' شیری کی نگاہیں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا ذہن جھٹکا کر رہ گیا تھا یہ لڑکی۔۔۔ یہ لڑکی اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ ہاں وہ اس لڑکی کو بخوبی پہچانتا تھا۔

''آؤ گل نور! عاقل سے ملو، یہ عاقل ہیں۔ اپنے وقت کے مانے ہوئے مصور، جن کے برش کی جنبش انسان کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے اور عاقل یہ میری بہت ہی عزیز سہیلی گل نور ہے۔۔۔ راؤ گل نواز مرحوم کی بیٹی۔ بہت ہی سادہ سی طبیعت کی مالک اور بہت ہی نفیس لڑکی ہے۔'' آمنہ نے کہا تو عاقل نے اپنی گردن خم کی۔

''اور گل نور یہ شیری ہیں عاقل کے دوست۔ بہت ہی دلچسپ انسان ہیں۔ تمہیں یقیناً ان سے مل کر خوشی ہوگی۔'' آمنہ نے کہا اور گل نور شیری کی جانب گھوم گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گردن خم کی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑی۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی اور وہ حیرآمیز نظروں سے شیری کو دیکھنے لگی۔ شیری گم صم ہوگیا تھا اور اپنی جگہ بیٹھا پھٹی پھٹی نگاہوں سے گل نور کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً گل نور بھی سنبھلی اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر شیری صاحب۔'' اس نے لفظ شیری پر خاصا زور دیا تھا۔ شیری بھی سنبھل گیا۔

''مجھے بھی مس۔۔۔ مس گل نور۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور گل نور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

آمنہ یا دوسری لڑکیوں نے اس لمحاتی تغیر کو محسوس نہیں کیا تھا۔ آمنہ مسلسل بکواس کیے جارہی تھی۔ عاقل کی شان میں قصیدہ خوانی سے وہ تھک نہیں رہی تھی

اپنی خوشی گپیوں کے درمیان وہ سب کو لے کر ڈائننگ ہال میں پہنچ گئی۔ اس نے اپنی امارت کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ پوری ڈائننگ ٹیبل انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ خاص طور سے اپنے برابر کی کرسی عاقل کو دی اس کے برابر شیری بیٹھا اور پھر دوسری تمام کرسیوں پر سہیلیاں براجمان ہوئیں۔

کھانے کے دوران لطیفے چلتے رہے تھے۔ شیری نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ حالانکہ اس کا ذہن شدید الجھنوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ شیری مضبوط اعصاب کا انسان تھا اور اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ گل نور نے اس کے بعد ایک بار بھی شیری سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ اس کا دیکھنے کا انداز، اس کی مسکراہٹ کا سکڑ جانا اس بات کا غماز تھا کہ جو شاک شیری کو لگا ہے وہ یقیناً اسے بھی لگا ہے۔ لیکن وہ اعلا ظرف لڑکی تھی۔ اپنی کیفیت کا اظہار دوسروں پر نہ ہونے دیا۔

بہت دیر تک عاقل کی جان کھائی جاتی رہیں۔ اس کے فن کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کی جاتی رہیں۔ آمنہ جیسی دوسری لڑکیوں نے بھی بابر علی کے گھرانے کو برا بھلا کہا جہاں ایک فن کار کی تذلیل ہورہی تھی۔ لڑکیوں نے پرزور سفارش کی کہ عاقل وہ جگہ چھوڑ دے اور آمنہ کی استادی قبول کرلے تاکہ خود اس کی اپنی زندگی بھی بن جائے۔ عاقل نے ان تمام باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر اس نے کہا

''آپ تمام لوگوں کا بہت بہت شکریہ اور مس آمنہ جیسا کہ میں نے جاوید ہاشمی سے وعدہ کیا ہے۔ فرصت ملتے ہی میں آپ کی خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔''

''کمال ہے ابھی سے۔۔۔ بھئی شیری صاحب آپ میری سفارش کیجیے نا ابھی سے یہاں سے واپسی کی کیا ضرورت ہے۔ کون سے اہم کام ہیں آپ کو۔''

''میرا خیال ہے ہمیں جانے دیجیے آمنہ صاحبہ۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر آنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن آپ سے چونکہ وعدہ کرلیا تھا۔ اس لیے یہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔''

بمشکل تمام آمنہ نے انہیں اجازت دی اور بالآخر یہ لوگ کار میں بیٹھ کر وہاں سے چل پڑے۔ عاقل کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔ شیری خاموشی سے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کافی دیر تک ان کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی پھر عاقل نے ہی کہا۔

''آپ کیوں خاموش ہیں۔ پتا چل گیا ایسی جگہوں پر آنے کا۔'' شیری چونک کر بولا۔

''کیا مطلب۔ میں سمجھا نہیں؟''

''ان لوگوں کی عامیانہ اور گھٹیا گفتگو آپ کو

بھی اتنی ہی ناگوار گزری ہے شیری بھائی جتنی مجھے۔ بابر علی صاحب کا گھرانہ ہمارے لیے کیا ہے۔ یہ بات تو صرف ہم اور آپ ہی جانتے ہیں۔ ہم کسی سے بھی اس کے لیے برا نہیں سن سکتے۔''

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں عاقل! زندگی میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہم نے تو کبھی اس کی پذیرائی نہیں کی۔''

''مگر ہم ایسے الفاظ سنیں کیوں؟''

''سنا کرو عاقل! سنا کرو۔ زندگی میں بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔'' شیری نے سنجیدگی سے جواب دیا اور عاقل اسے چونک کر دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا کوئی خاص بات۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔''

''نہیں کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ بس کھانا زیادہ کھالیا ہے۔ طبیعت پر کچھ گرانی سی ہو رہی ہے۔'' شیری نے جواب دیا اور اس کے بعد عاقل بالکل خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی پہنچ گئے۔

''آپ آرام کریں گے۔'' عاقل نے پوچھا۔

''ہاں بھئی! اب اس وقت کسی کے ساتھ بیٹھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ چنانچہ اگر کوئی تم سے ٹکرا بھی جائے تو میری طرف سے معذرت کر لینا۔ میں واقعی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کچھ زیادہ ہی کھا گیا یا اس وقت طبیعت کچھ بھاری ہو گئی ہے۔'' شیری نے جواب دیا اور اپنے بیڈ روم کی جانب چل پڑا۔ اس نے دروازہ بند کر کے روشنی بجھا دی۔ ذہن و دل تہہ و بالا ہو رہا تھا، گل نور، گل نور کانوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا۔۔۔ یہ بہت ہی برا ہوا۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

(جاری ہے)

فرق

''تنہائی کی زندگی اور شادی شدہ کی زندگی میں کیا فرق ہے؟''

''تنہائی کی زندگی میں تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے اور شادی شدہ زندگی میں بیوی۔''

ہفتہ صفائی

ہفتہ صفائی کے شروع ہوتے ہی ایک شخص نے شیریں لہجے اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بیوی کو حکم دیا۔

''ڈارلنگ! ذرا گھر کی اچھی طرح صفائی کیجیے۔ تمام فالتو اور ناکارہ چیزیں سمیٹ کر کوڑے کرکٹ کے ڈرم میں پھینک دیجیے۔''

تو جواباً بیوی نے بھی والہانہ انداز میں گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''جان من۔۔۔! ساری کی ساری فالتو اور ناکارہ چیزیں بھلا کیسے پھینک سکتی ہوں۔ آخر آپ میرے شوہر ہیں۔''

جن

بیٹا: ''پاپا کیا ہمارے گھر میں جن ہیں؟''

باپ: ''یہ جن وغیرہ کچھ نہیں ہوتے۔''

بیٹا: ''پاپا نوکرانی کہتی ہے ہمارے گھر میں جن ہیں۔''

باپ: ''سامان پیک کرو۔''

بیٹا: ''کیوں پاپا؟''

باپ: ''بیٹا! ہمارے گھر میں کوئی نوکرانی ہی نہیں ہے۔''

پیار اور عشق

ٹیچر: ''پیار اور عشق میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

اسٹوڈنٹ: ''سر! پیار وہ ہے جو آپ اپنی بیٹی سے کرتے ہیں اور عشق وہ ہے جو میں آپ کی بیٹی سے کرتا ہوں۔''

موتیوں کی لڑی

بیلا مریم

دولت کا نشہ ایسا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اس کے حصول کے لیے کچھ لوگ ہر جائز و ناجائز راستے پر چلنے سے بھی گریز نہیں کرتے، ان اندھیروں کے مسافروں کی کوئی منزل نہیں ہوتی اس لیے وہ ساری زندگی بھٹکتے رہتے ہیں۔

ایک حسینہ دلنواز کا قصہ جس کی زندگی دولت سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوئی

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تمہارے پاس جگہ ملی ہے۔'' میں نے ٹیبل سے کہا اور ہم ڈنر کے لیے بیٹھ گئے۔

''میرے لیے۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''یہ تو دیکھنا پڑے گا، میں خاص طور سے تم سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔''

یہ سن کر اس کا دل شاید تھوڑا سا بیٹھ گیا۔

''اس سے تو اچھا ہے کہ تم اپنے یا میرے بارے میں باتیں کرو۔'' وہ بولا۔

''اوہ، مگر مجھے یہ کہانی تمہیں ضرور سنانی چاہئے۔ میرے خیال میں تم اسے استعمال کر سکتے ہو۔

''اگر ضروری ہے تو سناؤ، لیکن پہلے مینو دیکھ لیتے ہیں۔

''یہ واقعہ میرے چند دوستوں کے ساتھ پیش آیا جو بالکل سچا ہے۔'' اس نے کہانی سنانی شروع کی۔ ''دراصل جب یہ واقعہ ہوا میں خود وہاں موجود تھی۔ میں ''لونگ اسٹونز'' کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی۔ تم جانتے ہو ''لونگ اسٹونز'' کو۔

''نہیں۔''

''خیر ہوا یوں کہ ایک رات انہوں نے اپنی گورنس سے کہا کہ ڈنر کے لیے آ جائے۔ کیونکہ ان کی کسی جاننے والی نے اچانک آخری لمحے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ بعض لوگ بہت بے حس ہوتے ہیں۔ اور اس عورت کے نہ آنے کی وجہ سے کھانے کی ٹیبل پر تیرہ لوگ رہ جاتے۔ (تیرہ کا ہندسہ مغرب میں منحوس خیال کیا جاتا ہے) ان کی گورنس کا نام مس روبنسن تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ بالکل نوجوان بیس اکیس سال کی اور خاصی خوب صورت۔ ذاتی طور پر تو میں کسی نوجوان اور خوبصورت گورنس کو رکھنے کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض نبھانے سے زیادہ جوان مردوں کے بارے میں سوچے گی اور پھر جب وہ آپ کے طور طریقے کے مطابق کام کاج کی عادی ہو جائے گی تو شادی کر لے گی مگر مس روبنسن ایک منفرد لڑکی تھی بہت اچھی اور معزز سی۔ میں اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہوں کہ وہ ایک پادری کی بیٹی تھی۔

ڈنر پر ایک ایسا آدمی موجود تھا جس کے بارے میں تم نے کبھی نہیں سنا ہوگا وہ خاصی مشہور شخصیت

تھی۔ کاؤنٹ اور سینو نام تھا اس کا۔ قیمتی پتھروں سے متعلق معلومات میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ میری لنکیٹ کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جسے اپنے قیمتی پتھروں کے زیورات پر بڑا ناز ہے گفتگو کے دوران اس نے کاؤنٹ سے پوچھا کہ وہ اس مالا کے متعلق کیا کہنا چاہے گا جو اس نے پہنی ہوئی ہے۔ کاؤنٹ نے کہا مالا بہت خوب صورت ہے اس بات پر وہ فخر سے بولی کہ اس کی قیمت آٹھ ہزار پاؤنڈ ہے۔

''مس روبنسن اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس دن وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا لباس اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ سوفی کا پرانا ڈریس تھا۔''

''یہ بڑا حسین نیکلس ہے جوان نوجوان خاتون نے پہنا ہے۔'' اور سینو نے کہا۔

''اوہ۔ مگر یہ تو مسز لونگ اسٹونز کی گورنس ہے۔'' میری لنکیٹ نے کہا۔

''میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن جو نیکلس انہوں نے پہنا ہے عمدہ ترین موتیوں کی لڑیوں کا بنا ہوا ہے۔ یہ کم از کم پچاس ہزار پاؤنڈ کا ہوگا۔''

''کیا بے کار بات ہے۔''

میری لنکیٹ نے اپنی چبھتی ہوئی آواز میں گورنس سے کہا۔ ''مس روبنسن۔ کاؤنٹ اور سینو فرما رہے ہیں کہ یہ موتیوں کی لڑیاں جو تم نے پہنی ہیں پچاس ہزار پاؤنڈ کی ہیں۔''

ہم سب مڑ کر مس روبنسن کو دیکھنے لگے وہ کچھ سرخ پڑ گئی اور ہنسنے لگی۔ ''میں نے بڑی اچھی بارگین کی تھی۔'' وہ بولی۔ ''کیونکہ میں نے اس کے صرف تین پاؤنڈ دیئے تھے۔''

''ضرور دیئے ہوں گے بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔''

''ہم سب ہنسنے لگے۔ ہم سب نے ان بیوپاریوں کے متعلق سنا ہوا تھا جو اصلی اور قیمتی موتیوں کی مالا کو اپنے شوہروں کے سامنے نقلی بنا کر پیش کرتی ہیں۔ یہ کہانی بہت پرانی اور قدیم ہے۔''

''آپ کا شکریہ۔'' نبیل نے کہا اور پھر میری کہانی کے بیچ میں اپنا بیان شروع کر دیا۔

''لیکن یہ بہت ہی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک گورنس پچاس ہزار پاؤنڈ کی مالیت کا ہار پہن کر بھی گورنس ہی رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کاؤنٹ نے تکا مارا تھا۔

''کاش تم مجھے اس وقت درمیان میں نہ ٹوکو جب کہ میں کہانی کے سب سے دلچسپ موڑ پر آ رہی ہوں۔''

''خیر۔ اسی لمحے ایک بٹلر نے جھک کر مس روبنسن کے کان میں کچھ کہا۔ مجھے لگا کہ وہ بالکل زرد پڑ گئی۔ وہ بہت حیران لگ رہی تھی اور جھک کر ادب سے بولی۔

''مسز لونگ اسٹونز، ڈاؤسن کہہ رہا ہے کہ وہ آدمی نیچے ہال میں مجھ سے ابھی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' سوفی لونگ اسٹونز نے کہا۔

مس روبنسن اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم سب کے ذہنوں میں ایک ہی خیال بجلی کی طرح کوندا مگر میں نے کہنے میں پہل کی۔

''مجھے امید ہے کہ وہ اسے گرفتار کرنے نہیں آئے ہوں گے۔'' میں نے سوفی سے کہا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ ہار اصلی تھا اور سینو۔''

''اوہ۔ کافی یقین ہے۔''

''اگر چرایا ہوا ہوتا تو اس لڑکی میں آج رات اسے پہننے کی ہمت نہ ہوتی۔''

میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ سوفی لونگ اسٹونز کے چہرے پر میک اپ کے نیچے موت جیسے زردی چھا گئی اور مجھے لگا وہ اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ اس کے تمام زیورات تجوری میں بخیر و عافیت ہوں۔ میرے پاس تو صرف ایک باریک سی ہیرے کی چین تھی پھر بھی غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اپنے گلے تک پہنچ گیا تاکہ

محسوس کرسکوں کہ وہ ابھی تک وہیں موجود ہے۔

''فضول بات نہ کرو۔'' مسٹر لونگ اسٹونز نے کہا۔ بھلا مس روبنسن کے پاس اتنی قیمتی موتیوں کی لڑی چرانے کا موقع کہاں سے ہاتھ لگے۔

''ہوسکتا ہے کہ اس کو کسی نے دی ہو۔'' میں نے کہا۔

''خیر، ہم لوگ مارے سسپنس کے سانس روکے انتظار کرتے رہے۔ میں امید کررہی تھی کہ تھوڑی دیر میں کسی چیخ کی آواز سنائی دے گی، لیکن وہاں تو مکمل سکوت تھا۔ مجھے خاموشی سے گھبراہٹ ہی شروع ہوگئی۔

''تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور مس روبنسن اندر آئی۔ میں نے فوراً نوٹ کیا کہ نیکلس اس کے گلے سے غائب ہوچکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پیلی زرد پڑی ہوئی تھی۔ وہ ٹیبل پر واپس بیٹھ گئی اور نیکلس میز کے اوپر پھینک دیا۔

''اوہ، مگر یہ تو نقلی ہے۔'' وہ بولا۔

''میں نے کہا تھا نہ یہ نقلی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''مگر یہ وہ والی مالا تو نہیں ہے جو چند لمحے پہلے آپ کے پاس تھی۔'' کاؤنٹ نے کہا۔

''اس نے اپنا سر ہلایا اور مسکرائی اور گویا ہوئی۔'' جب وہ ہال میں گئی تو وہاں دو آدمی موجود تھے جو کہہ رہے تھے کہ وہ جیرنس اسٹور سے آئے ہیں اس نے وہ مالا وہیں سے خریدی تھی۔ اور تین پاؤنڈ میں خریدی تھی جیسا کہ اس نے پہلے کہا تھا۔ چند دن پہلے دوبارہ وہ مالا اس اسٹور میں لے کر گئی چونکہ اس کا ''لاک'' کچھ ڈھیلا تھا۔ آج دوپہر کو ہی وہ مالا واپس لینے دوبارہ اسٹور گئی۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ انہوں نے غلط مالا واپس دے دی۔ کوئی اپنی اصلی مالا دوبارہ بنوانے وہاں چھوڑ گیا تھا اور اسسٹنٹ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کوئی اتنی بڑی نادانی کیسے کرسکتا ہے کہ اتنا بیش قیمت ہار جیرنس کے اسٹور میں لے جاکر دے آئے، انہیں اس قسم کی چیزوں کو ڈیل کرنے کی عادت نہیں ہے نہ ہی ان میں اصلی اور مصنوعی موتیوں کی پہچان ہے مگر تم تو جانتے ہو کہ بعض عورتیں کتنی لاپرواہوتی ہیں، بہرحال یہ وہی ہار تھا جو مس روبنسن نے پہنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ پھر اس نے وہ ہار ان آدمیوں کو واپس کردیا۔ وہ بھلا اور کیا کرسکتی تھی، ضرور اسے دھچکا لگا ہوگا۔ انہوں نے مس روبنسن کو اس کی لڑی واپس کردی اور انعام کے طور پر تین سو پاؤنڈ بھی دے دیئے۔ مس روبنسن نے خود ہمیں وہ چیک دکھایا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔

''اچھا تو اس کی قسمت کھل گئی ہے نا۔'' نبیل بولا۔ ''تمہارا خیال ہے کیوں کہ آگے جاکر یہ واقعہ اس کی بربادی کا سبب بنا۔'' میں نے کہا۔

''اوہ، وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ جب اس کی چھٹیوں کا وقت آیا تو اس نے سوفی لونگ اسٹونز سے کہا کہ وہ ایک مہینے کے لیے ''ڈیوائل'' جائے گی اور پورے تین سو پاؤنڈ اڑادے گی۔ سوفی لونگ اسٹون نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یہ پیسے سیونگ میں رکھوادے، مگر وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی۔ اس کے بعد اس کو ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا اور وہ کم از کم آنے والے چار ہفتے کسی شہزادی کی طرح گزارنا چاہتی ہے۔

سوفی کچھ نہ کرسکی سو اس نے ہار مان لی۔ اس نے مس روبنسن کو اپنے بہت سے کپڑے بیچ دیئے۔ اس نے وہ کپڑے پورے سیزن پہنے تھے اور اب وہ ان سے انتہائی بور ہوچکی تھی۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس نے بہت سستے داموں وہ کپڑے بیچ ڈالے اور مس روبنسن روانہ ہوگئی۔ بالکل اکیلی۔ ''ڈیوڈوائل کے سفر پر''

مس روبنسن کو ڈیوڈ وائل میں ایک امیر وکبیر جوہری مل گیا اور وہ اس کے ساتھ پیرس چلی گئی، تب سے وہ پیرس میں ہی ہے۔ میں نے اس کو فلورنس میں دیکھا تھا۔ وہ کہنیوں تک بریسلیٹ پہنے ہوئے تھی اور گلے کے اطراف موتیوں کی رسیاں لپٹی ہوئی تھیں۔

تھوڑے ہی مہینوں میں اس نے اس جوہری سے چھٹکارا پالیا اور پھر ایک یونانی کو پکڑا معلوم نہیں اب وہ کس کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کا لب لباب یہ ہے کہ اس وقت وہ پیرس کی سب سے فیشن ایبل طوائف ہے۔

ڈیڑھ ہوشیار

عبدالکریم ساگر

قاتل نے کہیں اپنا کوئی نشان تک نہ چھوڑا تھا، مگر ایک بے ضرر سی عادت اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن گئی۔

جاسوسی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ کہانی

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ مائیک نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں، لیکن گھڑی پر نظر پڑی تو اچھل کر بیٹھ گیا۔ رات کی تھکن ابھی تک باقی تھی۔ ایک تو سراغ رسانی بذات خود ہی کافی تھکا دینے والا کام ہوتا ہے، خصوصاً جب انسان کام کی دھن میں اپنا کھانا پینا سب بھلا دے اور پھر اگر آدمی اپنا باس خود ہی ہو، یعنی پرائیویٹ سراغ رساں۔۔۔ تو پھر ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اس کام کی تھکاوٹ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مائیک پچھلی رات کو ایک بہت ہی پیچیدہ کیس سلجھا کر پولیس لیفٹیننٹ بل پارکنز کو سارے معاملے کی مکمل رپورٹ دے کر رات گو کوئی دو بجے کے قریب سونے لیٹا تھا۔ بل پارکنز لاکھ دوست سہی، کام کے معاملے میں وہ اپنے خون کے رشتوں کو بھی بھلا بیٹھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مائیک کو رات گئے تک بیٹھ کر وہ رپورٹ لکھنی پڑی تھی۔

ٹھنڈے ٹھنڈے پانی نے مائیک کی آنکھیں

پوری طرح کھول دیں اور جب وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو گرمیوں کے سورج کی روشن کرنیں اسے کھڑکیوں میں سے داخل ہوتی ہوئی بہت بھلی محسوس ہوئیں۔ اس نے گنگناتے ہوئے اپنے لیے ناشتا تیار کرنا شروع کیا لیکن ابھی وہ بمشکل اسٹوو ہی جلانے پایا تھا کہ ٹیلی فون کی زوردار گھنٹی نے اس کے اعصاب کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔ دل ہی دل میں اس نے ایک بہت بری گالی سوچی لیکن اس کو ادا کیے بغیر ہی اس نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے پارکنز کی آواز سن کر اسے بہت تعجب ہوا، لیکن اگلے ہی لمحے بل نے اس کی ساری حیرت دور کردی۔ مائیک کے چچا کو رات قتل کردیا گیا تھا۔ یہ کیس بل کے حوالے کیا گیا تھا۔ چونکہ گھر والوں کی حالت غیر ہورہی تھی لہٰذا بل نے اپنے طور پر مائیک کو فوراً مطلع کرنا مناسب سمجھا۔

مائیک اپنے چچا کو بہت چاہتا تھا۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد وہ اپنے چچا اور چچی کے ساتھ ہی رہتا چلا آیا تھا۔ یہ کوئی پندرہ برس پرانی بات ہے۔ اس وقت وہ صرف دس سال کا تھا۔ اب حال میں ہی اسے ان کا گھر مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اب وہ گھر کافی چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ گھر والوں کی تعداد، گھر کی وسعت سے کہیں زیادہ بڑھتی جارہی تھی۔ گھر میں چچا، چچی اور ان کے تین چھوٹے بچوں کے علاوہ تین افراد اور بھی رہ رہے تھے۔ ایک چچی کا سترہ سالہ بھائی ڈان جسے اپنے والدین کے انتقال کے بعد چچی نے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ ایک چچا کی نحیف ونزار ادھیڑ عمر کی بہن گریس، یعنی مائیک کی پھوپی اور واحد پھوپی جو دماغی و جسمانی طور پر کمزور واقع ہوئی تھیں اور وقتاً فوقتاً دورے پڑنے کی بنا پر اکیلے رہنے کے قابل نہ تھیں اور ایک چچا کا سگا بھتیجا، یعنی مائیک کے دوسرے چچا کا لڑکا جیک، پچیس سال کا جوان لیکن نیم پاگل ظاہر ہے کہ یہ تینوں ہی محتاج و معذور لوگوں کی صف میں آتے تھے۔ انہیں سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ سہارے کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مائیک اب اپنے پیروں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ اپنی روزی خود کمارہا تھا۔ گھر چھوٹا پڑنے کی صورت میں وہی واحد فرد تھا جو علیحدہ رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ ہی مہینے ہوئے اس نے اپنے چچا سے بات کر کے چند ہی بلاک دور اپنے لیے ایک کرائے کا اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ اس کے چچا، چچی کو یہ بات پسند تو نہ آئی تھی، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مائیک بہرحال ان کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا اور فون پر تو تقریباً روزانہ ہی بات ہوتی تھی۔ ابھی پچھلی ہی رات تو اس نے اپنے چچا کو فون کیا تھا اور اب وہ ان کی موت کی خبر سن رہا تھا۔

مائیک کے لیے یہ خبر ایک سانحے سے کم نہ تھی، وہ بمشکل ہی لیفٹیننٹ سے فون پر اپنی بات مکمل کرسکا۔ ریسیور رکھ کر وہ فوراً اپنے چچا کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

گھر کے باہر پولیس والوں کے علاوہ بہت سے رپورٹر بھی جمع تھے کیونکہ اس کے چچا کو شہر کے بہت بڑے تاجروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ بات حیران کن نہیں تھی۔ مائیک بھیڑ کو چیرتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ اندر شدید غم اور سوگ کی فضا چھائی ہوئی تھی۔

مائیک نے سب سے پہلے اپنی چچی اور پھوپی کا حال معلوم کیا۔ وہ دونوں اوپر کے کمرے میں تھیں۔ چچی کی حالت اگرچہ بہت خراب تھی لیکن پھوپی کی حالت ان سے بھی بدتر تھی۔ ان پر دورے پڑرہے تھے۔ کچھ عورتیں ان دونوں کو سنبھال رہی تھیں۔ ان ہی سے معلوم ہوا کہ ڈان کو بھی ابھی ایک آدمی خبر کرنے بھیجا گیا ہے۔ وہ اپنی کلاس اور ایک استاد کے ساتھ اسکول ہی کی طرف سے حیوانی زندگی کا اس کے قدرتی ماحول میں مشاہدہ کرنے کے لیے جنگلوں کی طرف گیا ہوا تھا۔

مائیک، جیک اور بچوں سے بھی ملا۔ وہ لوگ سہمے ہوئے ایک کمرے میں دبکے بیٹھے تھے۔ مائیک نے انہیں تسلی دی اور نیچے اتر آیا۔ ابھی وہ سیڑھیوں ہی پر تھا کہ اس نے بل پارکنز کو مطالعے کے کمرے

سے نکلتے دیکھا۔ قتل اس کمرے میں ہوا تھا اور اندر کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ مائیک نے دیکھا کہ اس کے چچا کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا کہاں وہ ان کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا اور مذاق کرتا ہوا دیکھتا آیا تھا۔ اور کہاں اب وہ یوں خاموش اور ساکت پڑے تھے مائیک کا دل بھر آیا۔ اس نے بڑی کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور جب اسٹریچر لے جایا گیا تو وہ بل کے پاس آ گیا۔ بل اسے مطالعے کے کمرے میں لے گیا۔ سامنے چچا کی میز تھی۔ میز کے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کی باقی سب چیزیں جوں کی توں اپنی جگہوں پر تھیں۔

پوچھنے پر بل نے اس کو تفصیلات بتانا شروع کیں۔ چچی، پھوپی اور تینوں بچے رات کو سونے چلے گئے تھے۔ جیک پر بھی اسی شام دورہ پڑا تھا اور اسے اسی وقت سے اس کے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ چچا اکیلے ہی اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ انہیں غالباً کسی کا انتظار بھی تھا۔

''ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق بل کہتا رہا۔ ''قتل رات کے دس سے بارہ بجے کے درمیان ہوا۔ مقتول کی لاش اسی میز کے پیچھے رکھی ہوئی ان کی کرسی پر ملی۔ ان کی پیٹھ پر کسی تیز دھار کی چیز سے دو وار کیے گئے تھے۔ ایک ذرا اوپر شانے کی طرف، دوسرا عین دل پر، قتل جس ہتھیار سے کیا گیا وہ ہتھیار البتہ نہیں مل رہا ہے۔ غالباً قاتل اس کو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔''

پھر اس نے رک کر مائیک سے اس کے چچا کی موت پر اظہار افسوس کیا۔ اس اثنا میں فنگر پرنٹ کا عملہ میز کی طرف سے ہٹ چکا تھا۔ چنانچہ مائیک بڑھ کر خود ہی میز پر رکھی ہوئی چیزوں کا معائنہ کرنے لگا۔

''تمہارے خیال میں یہ کام کس نے کیا ہوگا، مائیک! میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ جس آدمی کا بھی انتظار کر رہے تھے، اسی نے یہ کام کیا ہے۔''

''ایسا ممکن تو ہے۔'' مائیک پُرخیال انداز میں بولا۔ ''رات نو بجے کے قریب میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ کسی کا اکاؤنٹ بند کرنے کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے مگر افسوس کہ فوراً ہی سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا، پھر بولا۔ ''یہ اپائنٹمنٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑا گیا ہے۔ اس میں ضرور اس آدمی سے ملاقات کا ذکر ہوگا۔ نیز ان کی ڈائری بھی ان کی اس دراز میں نہیں ہے۔ شاید قاتل اسے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔''

''کیونکہ اس میں بھی غالباً اسی آدمی کا ذکر ہوگا۔'' بل نے کہا۔

''اور ان کے خط کھولنے کا اوزار جو وہ کبھی اپنی میز پر سے ہٹانے بھی نہیں دیتے تھے، آج یہاں موجود نہیں ہے۔'' پھر مائیک بڑے معنی خیز انداز میں بل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بڑا ہی مضبوط، بہت تیز اور بڑے کام کا اوزار تھا وہ۔۔۔''

''قتل کرنے کے بھی کام کا۔۔۔'' بل اس کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ قاتل اس کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا۔ انگلیوں کے نشان دستے سے صاف کر دینا کافی تھا۔ اس کی ان حرکتوں سے تو پتا چلتا ہے کہ وہ بے حد گھبرایا ہوا، بہت ہی حواس باختہ تھا۔''

''یقیناً وہ کوئی عادی مجرم تو کسی طور پر نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنا پہلا قتل کرنے میں ضرور کامیاب ہو گیا۔ اب اس کے فرار کو ناکام بنانا باقی ہے۔'' مائیک کی نظریں میز پر رکھی ہوئی ایک ایش ٹرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ بولا۔ ''بل! یہ جو تین آدمی باہر کھڑے ہوئے تھے، یہ کون تھے۔''

''تم نہیں جانتے انہیں۔ ایک تو تمہارے چچا کے بزنس کے پارٹنر ہیں، مسٹر گوزیک، دوسرے ایک پرانے دوست ہیں، کرنل ماڈکن۔ اب تو شاید ان کا جانوروں کی کھالوں کا کوئی کاروبار ہے جس میں شاید تمہارے چچا بھی کچھ حصہ لینے والے تھے۔ کم از کم کرنل کا تو یہی کہنا ہے۔ اور تیسرے کوئی اور دوست ہیں۔ مسٹر ڈیونپورٹ۔''

''ہاں۔۔۔ یہ نام تو کئی بار کے سنے ہوئے ہیں۔ چچا کے کہنے کے مطابق، ڈیونپورٹ نے تو حال ہی

میں ان سے کافی قرض بھی لیا تھا۔''

چند ایک باتیں اور ہوئیں۔ پھر مائیک کمرے سے باہر نکل آیا۔ چند ملنے والے اس سے تعزیت کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی وہ تینوں اجنبی بھی آگے بڑھ آئے۔ دوسرے لوگ پیچھے ہٹے تو انہوں نے اپنا اپنا تعارف کرا کر اظہار افسوس شروع کیا۔

''گھر کے نوکر سے ابھی ابھی پتا چلا کہ آپ مرحوم رچرڈ کے دوسرے بھتیجے مائیک پام ہیں، بے چارہ رچرڈ آپ کا بہت ذکر کرتا تھا۔''

''اور مجھ سے آپ صاحبان کا۔ افسوس کہ ہم لوگوں کی ملاقات بھی ایسے موقع پر ہوئی۔'' پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بل کو اپنی طرف متوجہ پا کر بولا۔ ''چلیے، ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔ یہاں تو بہت بھیڑ ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ انہیں دوسرے کمرے میں لے آیا۔ دوسری طرف سے بل پارکنز بھی اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دیتا ہوا پیچھے چلا آیا اور ایک کونے میں کھڑا ہو کر خاموشی سے تماشا دیکھنے لگا۔

مائیک کے چچا کا پارٹنر گوزیک ایک بہت ہی کائیاں اور چال باز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمرے میں رکھے ہوئے بڑے اور نہایت آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہنے لگا۔

''کتنے افسوس کی بات ہے رچرڈ بے چارہ ہم سب کو کتنا قریب سمجھتا تھا، لیکن ہم سب کی ملاقات بھی ہوئی تو کیسے موقع پر۔۔۔ کیوں، خیر تو ہے؟''

مائیک کو بے چینی سے اپنی جیبیں ٹٹولتا دیکھ کر وہ اپنی بات کاٹ کر بولا۔

''میری سگریٹ کی ڈبیا۔۔۔ معلوم نہیں کہاں رہ گئی۔''

''لیجیے۔ میں دیتا ہوں۔'' تینوں نے اپنی اپنی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر ایک نے سگریٹ پیش کی تو دوسرے نے ماچس۔ ساتھ ہی گوزیک نے اپنے لیے بھی ایک سگریٹ سلگالی۔

''مسٹر گوزیک، آپ غالباً چچا جان کے پاس زیادہ نہیں آتے جاتے تھے۔ نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری پہلے ملاقات نہ ہوئی تھی۔''

''سچ کہتے ہو، بیٹے! دراصل میں زیادہ سماجی اور سرگرم آدمی نہیں ہوں۔ بزنس میں بھی میرا تقریباً یہی حال ہے۔ سارا کام زیادہ تر پارٹنر ہی سنبھالتے ہیں۔ رچرڈ ہی بے چارہ بھاگ دوڑ کرتا پھرتا تھا۔ میں تو صحیح معنوں میں بیٹھ کر کھانے والا آدمی ہوں۔'' گوزیک نے بے ساختگی کے ساتھ کہا۔

''آپ نے شاید شادی بھی نہیں کی۔ آخر آپ کا کچھ نہ کچھ تو مشغلہ ضرور ہوگا۔''

''بس ایک ہی ہے۔ اگر زندگی میں کسی چیز پر محنت کی ہے، اس پر روپیہ صرف کیا ہے تو دل کھول کر اس پر کیا ہے۔ اور وہ ہے میرا میوزیم۔ اس میں میں نے دنیا بھر کی بھلائی ہوئی نادر اور بیش قیمت چیزیں جنہیں اب شاید تاریخ بھی بھلا چکی ہے۔ ان قدیم چیزوں کی تلاش میں، میں نے مصر کے اہرام سے لے کر افریقہ کے بیابانوں تک کو کھنگالا ہے۔ ساری چیزیں میرے میوزیم میں محفوظ ہیں اور پرانے زمانے کی عظمت کو منعکس کر کے میرے دل کو ایک سکون ملتا ہے۔ رچرڈ میرے اس شوق کو دیوانہ پن کہتا تھا۔ بہرحال ہر آدمی کسی نہ کسی چیز کا دیوانہ تو ضرور ہوتا ہے۔''

ماچس کی تیلی رگڑنے کی آواز سن کر مائیک مڑا تو اس نے ستاسی سالہ کرنل کو اپنی سگریٹ سلگانے میں مصروف پایا۔ بوڑھا کرنل جو شکل سے ویسے ہی یتیم لگتا تھا، اسے اپنی طرف متوجہ پا کر اور بھی زیادہ بے چارگی سے بولا۔

''سارے پھیپھڑے بے کار ہو گئے ہیں، جانتا ہوں، پر کیا کروں زندگی گزر گئی پیتے ہوئے۔ عادت ہے کہ چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ اس کے بغیر اتنی بے چینی ہوتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔''

''یہ تو صحیح فرمایا آپ نے۔ اب دیکھیے، میں نے بھی تیسری بار عزم کیا تھا کہ آئندہ سگریٹ بالکل نہیں پیوں گا اور ابھی پورے دو دن بھی نہیں ہوئے

کہ اس کی طلب نے بے چین کر دیا۔'' اس نے ایک گہرا کش لیا اور ساتھ ہی دوہرا ہو کر بری طرح کھانسنے لگا۔

کرنل اس کی حالت دیکھ کر آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔

''حیرت ہے۔ اتنی کم عمری میں سگریٹ نے تمہاری یہ حالت کر دی ہے۔ تمہیں دیکھتے ہوئے میرا سگریٹ پی کر اس عمر تک پہنچنا ایک معجزہ ہی معلوم ہوتا ہے۔''

بل پارکنز نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی اور بڑھ کر مائیک کے ہاتھ سے سگریٹ لیتا ہوا بولا۔ ''ان کی زندگی تو اب بس دوسروں کے لیے سبق بن کر رہ گئی ہے۔''

مائیک بولنے ہی والا تھا کہ سوکھے ہوئے مریل ڈیونپورٹ کو اپنی سگریٹ بجھاتے دیکھ کر رک گیا اور حیرت سے بولا۔

''ہیں، مسٹر ڈیونپورٹ! یہ کیا۔۔۔ کیا آپ میری حالت دیکھ کر ایسا کر رہے ہیں۔ بل کی باتوں میں آ کر۔۔۔؟''

''جی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سرد مہری کا شائبہ تھا۔ ''سگریٹ کے نقائص سے میں خود بھی بخوبی واقف ہوں۔ لیکن جانتے بوجھتے اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا کیا کروں۔ عادت پڑ گئی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آدھی سے زیادہ سگریٹ پینے کی کوشش کروں تو دم اکھڑنے لگتا ہے۔ اسی لیے اس تک نوبت پہنچنے سے پہلے ہی اسے بجھا دیتا ہوں۔''

''واقعی۔۔۔ پھر تو آپ کو اسے بالکل ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ پہلا کش ہی آپ کے لیے عذاب ثابت ہونے لگے۔'' مائیک نے کہا۔

''جس طرح آپ کے لیے ہے۔'' وہ سرد مہری سے مسکرایا۔

''جی نہیں، مسٹر ڈیونپورٹ! اب تو یہ سگریٹ مجھے قبر ہی تک لے جائے گی۔'' مائیک نے ایک بے تاثر لہجے میں کہا۔

''آپ میرے چچا کے قریب ترین دوستوں میں سے ہیں۔ کم از کم میں نے سنا تو یہی ہے۔ یہ بات اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب آپ کی کمپنی دیوالیہ ہوئی تو آپ کی مالی حالت بحال کرنے کے لیے چچا نے خود آپ کو قرض دینا شروع کیا۔ چچا ایسا کم ہی لوگوں کے لیے کرتے تھے۔''

''ہاں، اور میں ان کا بہت شکر گزار بھی ہوں۔'' وہ بڑے خلوص سے بولا۔

''اتنے شکر گزار کہ آپ نے ان کا خون کر دیا۔'' اس پر وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہی نہیں، گوزیک اور کرنل ماڈلن بھی چونک اٹھے۔

''مسٹر ڈیونپورٹ! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ جوا کھیلتے ہیں۔'' مائیک نے اندھیرے میں نشانہ لیا۔

''ہاں۔ تو پھر۔۔۔''

''تو پھر یہ کہ آپ لاس گیس تو اکثر جاتے ہی رہتے ہوں گے۔''

''ہاں، جاتا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ۔۔۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''میں کل رات بھی وہیں گیا ہوا تھا۔''

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں مسٹر ڈیونپورٹ!'' مائیک چالاکی سے مسکرایا۔ ''کل تو آپ میرے چچا کے پاس آئے ہوئے تھے۔''

''یہ جھوٹ ہے۔''

''نہیں، یہ سچ ہے۔ چچا نے کل رات آپ کے آنے سے دو منٹ پہلے ہی تو مجھ سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

''میری سمجھ میں تو تمہاری کوئی بھی بات نہیں آ رہی۔ معلوم نہیں تم بک کیا رہے ہو اور یہ لیفٹیننٹ، الوکا پٹھا! معلوم نہیں کس مرض کی دوا ہے، کھڑا سب کچھ سن رہا ہے، کچھ کہتا ہی نہیں۔ آدمی ہے یا، یا۔۔۔ موم کا پتلا۔۔۔''

بل اپنی شان میں ان کلمات کو قطعی نہیں برداشت کر سکتا تھا، مگر اس وقت صرف کسمسا کر رہ

گیا۔ ادھر مائیک پوری رفتار سے جاری تھا۔

''بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنے جرم کا اعتراف چپ چاپ کرلیں۔ خوانخواہ اتنا ڈراما کر کے اپنے آپ کو اور ذلیل کرنے سے کیا فائدہ۔''

''نہیں۔'' وہ اپنے دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم واقعی کچھ جانتے ہو تو صاف صاف کہہ دو۔ میں الفاظ سے ڈرنے والا نہیں۔ نہ میرے دل میں کوئی چور ہے۔''

''آپ کا چور تو میں ابھی پیش کیے دیتا ہوں، مسٹر ڈیوپورٹ قصہ شروع ہوتا ہے اس وقت سے جب آپ نے اپنی کمپنی کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اور وہ بھی غالباً غبن کر کے۔ پھر جب چچا جان نے آپ سے ہمدردی کرتے ہوئے آپ کو قرض دینا شروع کیا تو بجائے اس کے کہ آپ شکر گزاری کے ساتھ نئے سرے سے اپنی کمپنی کی حالت بحال کر کے اپنے پرانے نقصان کی تلافی کرتے، آپ نے اور بھی زیادہ ڈھٹائی سے جوا کھیلنا شروع کر دیا اور غالباً ہارتے ہی گئے۔ ادھر چچا جان کو آپ کے بارے میں سب پتا چل گیا۔ وہ تو آپ کا اکاؤنٹ تک بند کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے جس شیطان کو انجانے میں پروان چڑھایا تھا، وہ اسے اب کچل دینا چاہتے تھے۔ اور ان کا ایسا کر دینا آپ کے لیے تباہ کن ہوتا۔ اکاؤنٹ بند کر دینے کی صورت میں آپ کے سارے چیک بے کار ہو کر رہ جاتے پھر ان پیسوں کا کیسے بندوبست ہوتا جو آپ بدمعاشوں سے ہار چکے تھے۔ کھیلتے وقت تو وہ بڑے شریفوں کی اولاد لگتے ہیں، بڑے بھولے اور معصوم، لیکن جہاں ادائیگی کی بات آتی ہے تو وہ اپنے باپ کو بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔ ایک طرح سے میں آپ کی لاچاری سمجھ سکتا ہوں، مسٹر ڈیوپورٹ! اگر چچا جان آپ کے چیکوں کو بے کار کر دیتے تو پھر جان دینے کے علاوہ آپ کے پاس اور طریقہ بھی کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اپنی الجھن میں آپ نے چچا جان کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ ان کو کچھ سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ ان کی سمجھ بوجھ کو غلط سمجھا اور یہی سوچا کہ ان کو قتل کیے بغیر انہیں آپ کا اکاؤنٹ بند کرنے سے نہیں روکا جاسکتا۔ کیوں، مسٹر ڈیوپورٹ! کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔'' اس کا لہجہ از حد تلخ تھا۔

''تمہارے تخیل کی داد دینی پڑتی ہے لڑکے!'' گو کہ ڈیوپورٹ کا منہ فق ہو چکا تھا، لیکن وہ اب بھی سنبھلا ہوا تھا۔

''مسٹر ڈیوپورٹ! آپ نہ تو اچھے جواری ہیں اور نہ عادی قاتل۔ آپ کی کوششیں بے سود ہیں۔ آپ نے میرے چچا کو قتل کر کے بھی ایک جوا کھیلا تھا۔ یہ سوچ کر کہ آپ اپنے ان چیکوں کی مدد سے جو چچا جان ناکارہ کیے دے رہے تھے۔ بدمعاشوں سے اپنا پیچھا چھڑا لیں گے۔ سو آپ یہ جوا بھی ہار گئے۔ اور اس دفعہ بدمعاشوں سے بھی بڑھ کر، قانون کے ہاتھوں میں پھنس گئے ہیں۔''

''میں پوچھتا ہوں، تمہارے پاس ثبوت کیا ہے۔ اے لیفٹیننٹ! تمہارے منہ میں بھی کوئی زبان ہے یا نہیں۔ یہ لڑکا برابر بغیر کسی ثبوت کے اپنی زبان

نقلی دانت

ایک بوڑھا گلوکار اسٹیج پر گانے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کے نقلی دانت گر پڑے۔ اس نے جلدی سے انہیں منہ میں فٹ کیا، لیکن جب گانے کے لیے منہ کھولا تو وہ پھر گر پڑے۔

جب چار پانچ دفعہ ایسا ہی ہوا تو ایک آدمی جل کر بولا۔

''کیسٹ ہی بدلتے رہو گے یا کچھ گاؤ گے بھی۔''

بے وقوف

استاد (شاگرد سے): ''گائے کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟''

شاگرد: ''سر! یہ تو کوئی بے وقوف بھی بتا دے گا۔''

استاد: ''اسی لئے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

چلائے جارہا ہے اور تم۔۔۔"

"لیفٹیننٹ کیا بولے گا۔" مائیک تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ "ثبوت تو اس کے آدمی پہلے ہی اس کے حوالے کر چکے ہیں۔ خنجر پر سے ملنے والے آپ کی انگلیوں کے نشان۔"

"خنجر۔۔۔" وہ بڑے زور سے ہنسا۔ "تمہیں یہ تک تو پتا نہیں کہ قتل لفافہ کھولنے والے اوزار سے ہوا تھا۔" وہ ایک دم رکا لیکن بے سود۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آسکتا۔

"ڈیونپورٹ!" مائیک بڑے سکون سے بولا۔ "یہ تو پولیس والے بھی ابھی تک یقین سے نہ کہہ سکے تھے کہ قتل کس ہتھیار کی مدد سے کیا گیا تھا۔ پھر تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ گئے؟"

ڈیونپورٹ کی حالت قابل دید تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تنکے جیسا بدن ابھی ڈھلک جائے گا۔ بڑی مشکل سے وہ بولا۔

"رچرڈ کو۔۔۔ میرے غبن کرنے کا پتا چل گیا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس نے میری طرف سے اپنے کان بالکل بند کر لیے تھے۔ وہ یہی کہے جارہا تھا کہ جوا۔۔۔ کوئی بات نہیں، شراب، گوارا، لیکن اپنی ہی کمپنی سے غداری۔۔۔ کبھی نہیں۔ اس نے میری بات سننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ مجھے ان بدمعاشوں کے آگے پھینک دینا چاہتا تھا۔ میرے پاس اس کو قتل کر دینے کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔"

بل نے اپنے آدمیوں کو بلایا۔ وہ اسے ہتھکڑی لگا کر کمرے سے باہر لے گئے۔ ادھر گوریک اور کرنل ماڈلن بھی بہت چکرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے رخصت ہونے ہی میں عافیت سمجھی۔ کمرا خالی ہونے کے بعد، بل، مائیک کی طرف بڑھا۔

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں پتا کس طرح چلا کہ ڈیونپورٹ ہی تمہارے چچا کا قاتل ہے۔ تمہیں نہ تو یہ معلوم تھا کہ اس نے غبن کیا ہے اور نہ تم اس کی جوئے کی عادت سے واقف تھے۔ تمہارے تو فرشتے بھی اس کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ سوائے ان چند باتوں کے جن کا تمہارے چچا نے تم سے کبھی ذکر کیا ہوگا۔"

"وہ چند باتیں ہی کافی سے زیادہ تھیں بل! لیکن میرا اصل اور واحد سراغ، جس کی بدولت یہ ساری باتیں معنی خیز نظر آنے لگیں، ایک سگریٹ کا ٹکڑا تھا۔" پھر وہ بل کو مطالعے کے کمرے میں لے گیا جہاں میز پر ایش ٹرے میں سگریٹ کا ایک ادھ جلا ٹکڑا اب بھی موجود تھا۔

"دراصل ہمارے گھر میں سگریٹ کوئی بھی نہیں پیتا۔ کل سارا دن یہاں کوئی ملنے بھی نہیں آیا۔ سوائے قاتل کے اور آج اس کمرے میں تمہارے آدمیوں نے باہر کے کسی فرد کو گھسنے نہیں دیا نیز یہ کہ میں تم سے معلوم ہی کر چکا تھا کہ تمہارے کسی آدمی نے یہاں اس کمرے میں کوئی سگریٹ نہیں سلگائی۔ جہاں تک ان تینوں آدمیوں کا تعلق ہے، تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ گوریک اور ماؤلن سگریٹ کا آخری کش تک نہیں چھوڑتے۔ سگریٹ کو اس لمبائی پر بجھا دینے کی عادت صرف ڈیونپورٹ ہی کو تھی۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن یہ سگریٹ تو میری ہے۔" بل نے کہا۔

"کیا۔۔۔؟" مائیک ششدر رہ گیا۔

"یہ میری سگریٹ ہے۔ میں نے تھوڑی سی ہی پی تھی کہ خیال آیا اس جگہ سگریٹ پینا کچھ مناسب نہیں لہٰذا آدھی ہی بجھا دی۔"

"لیکن جب میں نے پوچھا تھا۔۔۔؟"

"تم نے میرے آدمیوں کے بارے میں پوچھا تھا، میرے بارے میں نہیں۔ میں تو فرسٹ کلاس سگریٹ پیتا ہوں۔"

"مگر کب سے۔۔۔؟" مائیک نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک ہی ہفتہ تو ہوا ہے۔ دیکھو کتنی مہارت حاصل کر لی ہے۔" اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور نہایت خوبی سے دھوئیں کے مرغولے ایک کے اندر ایک داخل کر کے دکھائے۔

سراغ رساں

محمد علی

اُس کو اپنی ذہانت پر ناز تھا کہ اُس نے اپنی ذہانت سے غربت کی زندگی کا خاتمہ کرکے دولت کا انبار لگایا ہے لیکن اس کی اسی "ذہانت" نے اسے پریشانی اور مصائب کا شکار کر دیا۔

غریب دوست کی عجیب کہانی

اسٹینلے بلیرڈ کھیلتے ہوئے اگلے داؤ کے چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ کالج کے زمانے میں وہ بلیرڈ کا اچھا کھلاڑی تھا۔ لیکن جب وہ عملی زندگی میں داخل ہوا تو کاروبار کے بکھیڑوں میں پھنس کر اپنا پسندیدہ کھیل بھول گیا جب کھیلنا بند ہوا تو رفتہ رفتہ اس پر موٹاپا چھا گیا۔ وہ سست ہوگیا اور اس کا جسم پھیل گیا۔ تب اس کی آنکھیں کھلیں اور اس نے دو دن پہلے بلیرڈ کی چیز خریدی تا کہ اپنی توند کم کر سکے۔

آج چھٹی تھی اور سہ پہر اپنے محل نما بنگلے میں وہ بلیرڈ کھیل کر گزارنا چاہتا تھا۔ وہ چھڑی پکڑ کر ایک گیند کو جانچنے لگا تھا کہ اچانک کمرے میں ملازمہ داخل ہوگئی وہ کسی گھریلو کام کے سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھی اسٹینلے نے جھنجھلا کر کہا کہ وہ اس قسم کے امور پر اپنی مالکن سے بات کرے۔ ملازمہ نے اسے یاد دلایا کہ وہ خریداری کے لیے گئی

ہے۔

اسٹینلے نے ناراضی سے پوچھا۔ ''کام کیا ہے؟''

''ایک آدمی آیا ہے۔ جسے کام کی تلاش ہے۔ کہتا ہے کوئی چھوٹا موٹا کام ہو۔''

''اسے کہو کہ وہ نوکری دلوانے والے کسی ادارے کے پاس جائے۔ ہونہہ۔ ایک دفعہ کسی سر پھرے کو نوکری دو تو شہر کے سارے آوارہ پہنچ جاتے ہیں۔''

خادمہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن جناب! وہ شریف آدمی لگتا ہے۔ کیوں نہ اسے آتش دان کے لیے لکڑیاں۔۔۔'' اسی دوران اسٹینلے نے گیند پر چھڑی آزمائی اور اس کا نشانہ خطا گیا۔ وہ ہنکار کر بولا۔

''ٹھیک ہے اسے گودام میں لے جا کر کام سمجھا دو۔ یہ بھی بتا دینا کہ بڑی لکڑیاں کاٹنا۔ کام ختم ہو جائے تو اسے کھانے کے علاوہ تین ڈالر مزدوری دے دینا۔''

خادمہ چلی گئی لیکن اس مداخلت سے کھیلنے کی ترنگ جاتی رہی۔ اسٹینلے نے چھڑی رکھی اور اپنے کمرے میں جا کر کوئی کتاب پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ سگار پینے میں تین منٹ باقی تھے آج کل وہ وقت دیکھ کر سگار پیتا تھا۔ تاکہ اس عادت بد پر قابو پا سکے۔ اس نے کتاب رکھی اور ٹی وی کھول لیا۔ کوئی فلم چل رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے اسے بھوک لگی تو وہ باورچی خانے آ گیا۔

وہاں کوئی آدمی میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ دروازے پر ٹھہر کر غور سے اجنبی کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے فوجی جیکٹ پہن رکھی تھی جس پر جگہ جگہ چکنائی کے دھبے نمایاں تھے۔ کہیں کہیں لکڑی کے ٹکڑے بھی اٹکے نظر آئے۔ اسٹینلے کو یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے ملازمہ نے اس شخص کا ذکر کیا تھا۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ آہٹ سن کر اجنبی نے سر اٹھا کر کچھ دیر کے لیے اسے دیکھا اور پھر لاپروائی سے دوبارہ کھانا کھانے لگا۔

اسٹینلے نے گھڑی دیکھی۔ سگار پینے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے جیب سے سگار نکالا اور اسے سلگا کر پینے لگا۔ اس کا ذہن ماضی کے پردے سرکا رہا تھا۔ اس نے غور سے اجنبی کو دیکھا اور پھر بولا۔

''میرا خیال ہے۔ میں تم سے پہلے بھی ملا ہوں۔''

اجنبی نہ میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔''

''لیکن مجھے یقین ہے کہ میں تم سے مل چکا ہوں۔''

اجنبی نے کئی دن سے داڑھی نہیں مونڈی تھی۔ لہٰذا چہرے پر کافی بال تھے۔ اس نے دوبارہ بنگلے کے مالک کو دیکھا۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسٹینلے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اجنبی کو پہچان گیا تھا۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔

''ارے تم تو مائک ہو۔ تمہارا نام مائک ہے نا۔''

اجنبی کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا۔ جیسے کسی نے تھپڑ مار دیا ہو۔ وہ سنبھل کر کہنے لگا۔

''آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''ارے تم نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا۔ میں اسٹینلے ہوں۔ اسٹینلے ٹاورس۔''

''اسٹینلے ٹاورس!'' اجنبی اب تک اسے کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''بھئی ذہن پر زور دو۔ ہم کالج میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ یاد آیا۔۔۔؟''

مائک نے زیر لب اس کا نام دوہرایا۔

''اسٹینلے ٹاورس۔ ارے ہاں تم کالج میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔۔۔''

اسٹینلے ہنستے ہوئے بولا۔ ''قدرت کا کیسا انوکھا مذاق ہے۔ ہماری ملاقات عجیب سے

حالات میں ہو رہی ہے۔ میرا مطلب ہے مائک! میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن۔۔۔"

مائک اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کو دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

"میں بڑی تکلیف دہ باتیں سن چکا ہوں۔ اب کسی بات پر میرے جذبات مجروح نہیں ہوتے۔ کھانے کا شکریہ۔ لکڑیاں کٹ گئی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔"

"ارے کچھ دیر بیٹھ کر گزرے وقت کی یادیں تازہ کرو۔"

"کیسی یادیں۔۔۔؟"

اسٹینلے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کچھ پرانی یادیں۔۔۔ تمہیں اتنے برے حال میں دیکھ کر میں حیران ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم۔ میرا مطلب ہے تم جماعت میں سب سے قابل اور ہوشیار لڑکے تھے۔ اساتذہ کو یقین تھا کہ تمہارا مستقبل تابناک ہے لیکن۔۔۔"

"مجھے ان کی پیشن گوئی یاد ہے مگر پرانی یادیں دوہرانے سے فائدہ؟"

"مائک! میں تمہیں افسردہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن تمہاری بدحالی دیکھ کر میرا تجسس جاگ اٹھا ہے یہ فطری بات ہے۔"

"اسٹینلے! لگتا ہے تمہیں بدنصیبی کی داستانیں سنتے ہوئے مزا آتا ہے میں تمہیں اپنی داستان سناتا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے تم ایک مصروف شخص ہو گئے۔۔۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میں اس وقت فارغ ہوں۔ مصروف ہوتا تب بھی سب کام چھوڑ کر تمہاری آپ بیتی سنتا۔ یہ لو سگار۔ کافی پیو گے؟"

مائک نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔"

اسٹینلے نے ملازمہ کو کافی تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر اپنے ہم جماعت سے گپ شپ لگانے لگا۔

☆☆☆

کافی ختم ہوئی تو مائک سگار کا گہرا کش لگا کر بولا۔ سچ یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس حال میں کیسے پہنچ گیا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں سارے امتحانوں میں بہترین نمبر لے کر کامیاب ہوا تھا۔ میں وزارت خارجہ میں ملازمت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کم تنخواہ دیکھ کر وہاں نہیں گیا۔ میرے والد کے ایک دوست بازار حصص میں بڑے دلال تھے۔ میں نے ان کے ہاں ملازمت کر لی تاکہ کاروباری رموز سیکھ سکوں۔ میں نے بعد میں ان کی لڑکی سے شادی کر لی مگر افسوس وہ کامیاب نہ ہوئی اور طلاق ہوگئی۔ میں قانون کے مطابق چھ برس تک اپنی سابقہ بیوی کے اخراجات برداشت کرتا رہا۔ جب اس نے دوسری شادی کی تب میری گلوخلاصی ہوئی لیکن نام نہاد شادی اور ان چھ برسوں کے اخراجات نے مجھے زندگی سے بے زار کر دیا۔ میں کثرت سے مے نوشی کرنے لگا۔ آنے والے حالات کے بارے میں تم خود اندازہ لگا لو۔"

مائک نے اپنی المناک داستان سنا کر ایک سرد آہ بھری اور افسردگی کے عالم میں سگار کا کونا چبا بیٹھا وہ پھر شرمندگی اور احساس جرم سے اسٹینلے کو دیکھنے لگا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ اپنی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ آخر وہ بولا۔

"مائک! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری زندگی ناکامی کا اشتہار بن گئی ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارا مستقبل اتنا غم ناک ہوگا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں پڑھائی میں کتنا کمزور تھا۔ میں نصابی کتب سے دور بھاگتا اور امتحان میں بمشکل کامیاب ہوتا۔ البتہ میں بلیرڈ کھیلنے میں طاق تھا۔ ہاں یاد آیا۔ اب میرے پاس بلیرڈ کی قیمتی میز موجود ہے یہ کامیابی کی بے مثال نشانی ہے نا۔"

مائک افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''تمہاری زندگی واقعی بہت کامیاب ہے۔''

اسٹینلے جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''میرے والد کے پاس پیکنگ کی کھٹارا سی مشین تھی۔ جسے دیکھ کر سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے اس کھٹارا مشین کا نظام سنبھال لیا۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ اسی پرانی مشین کے ذریعے آج میں ترقی کی بلندیوں پر ہوں۔ میں اپنی محنت کے ذریعے اتنے اونچے مقام تک پہنچا۔ تاجر مختلف اشیا بناتے ہیں اور میں اپنی جدید ترین مشینوں کے ذریعے انہیں خوب صورت ڈبوں میں بند کرتا ہوں۔ اب میرا کاروبار بہت وسیع ہے جس میں بیسیوں ملازم ہیں۔ میں ہر مہینے انہیں لاکھوں ڈالر تنخواہ دیتا ہوں۔ میرا کاروبار عروج پر ہے۔'' مائنک ہولے سے بولا۔ ''مبارک ہو۔''

''حقیقت یہ ہے کہ انسان کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ میں آج بہت امیر ہوں۔ اتنا کہ شاید تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر رقم کمانا آسان کام نہیں۔ بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔''

مائنک اسے حسرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو اپنا سارا وقت کتابیں پڑھنے میں ضائع کر دیا۔ کاش! کتابی کیڑا بننے کے بجائے میں نے دولت کمانے کے گر سیکھے ہوتے۔ میں آج تک رقم کمانے کا راز نہیں جان سکا۔ جب بھی مال جمع کرنے کی کوشش کی۔ ناکامی میرا مقدر بنی اور انکم ٹیکس۔۔۔ یہ میرے لیے تباہی کا پیغام ثابت ہوا۔ ٹیکسوں کی بھرمار نے مجھے تباہ کر دیا۔''

اسٹینلے فخر سے کہنے لگا۔ ''لیکن محکمہ انکم ٹیکس سے نمٹنے ہی میں دولت بنانے کا گر پوشیدہ ہے۔ کوئی بھی کاروبار شروع کرنے سے پہلے ٹیکس بچانے کے طریقے آنے چاہئیں اور میں اس ضمن میں بڑی مہارت رکھتا ہوں۔ رقم کمانا بہت مشکل مگر اسے جمع کرنا سب سے کٹھن کام ہے۔ مجھے ٹیکس بچانے کی نادر و نایاب ترکیبیں معلوم ہیں، مثلاً میں اپنا آدھا کاروبار نقد کرتا ہوں۔ کیش کھاتوں میں ان سودوں کا اندراج ہی نہیں ہوتا نقد دینے پر میں گاہک کو دس فیصد رعایت دیتا ہوں۔ یوں ہر سال میرا آدھا منافع ٹیکس سے بچ جاتا ہے۔ مائنک! ایسے گر اسکول کالج میں نہیں سکھائے جاتے اور نہ کتابوں میں ملتے ہیں۔ میری کامیابی اور تمہاری ناکامی کے درمیان شاید یہی بنیادی فرق ہے۔''

اسٹینلے کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر تالی بجاتے ہوئے بولا۔

''مائنک! تم میری بیوی سے ملے ہو۔ اگر ڈراموں کے شوقین ہو تو اس سے ضرور ملنا۔ اوہ! مگر تمہیں اسٹیج ڈرامے دیکھنے کا موقع کیسے ملتا ہوگا۔۔۔ پھر وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ میری بیوی اسٹیج ڈراموں کی مشہور اداکارہ ہے۔''

مائنک اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

''رکو بھئی! مجھے تمہارا یوں جانا اچھا نہیں لگ رہا۔''

اسٹینلے نے یہ کہہ کر اپنے قیمتی بٹوے سے بیس ڈالر کا کڑکڑاتا نوٹ نکالا۔ پھر کچھ سوچ کر ایک اور نکال لیا۔ اور بولا۔ ''یہ رقم رکھ لو۔ یہ قرض نہیں بلکہ ایک دوست کی طرف سے تحفہ ہے۔''

''مگر ملازمہ نے کہا تھا مجھے تین ڈالر۔۔۔''

''ملازمہ کی بات چھوڑو۔ اب معاملہ کچھ اور ہے یہ نوٹ رکھ لو۔''

مائنک نے ہچکچا کر نوٹ پکڑے اور جلدی سے جیب میں ٹھونس لیے احسان مندی کے جذبات نے اسے کچھ کہنے نہ دیا۔ وہ دروازہ کھول کر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اسٹینلے دیر تک باورچی خانے میں بیٹھا سگار پیتا رہا۔

☆☆☆

چند دنوں بعد اسٹینلے کو محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے حاضر ہونے کا اطلاع نامہ ملا۔ اس پر ٹیکس چوری کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ اسٹینلے گھبرا گیا۔ مگر اس کے وکیل نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں کمپنی کے حسابات بالکل درست ہیں انکم ٹیکس والے کوئی الزام ثابت نہیں کر سکتے۔ اسٹینلے مقررہ دن اپنے وکیل کے ہمراہ محکمہ انکم ٹیکس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں اسے گاہکوں کے حلفی بیانات کا بنڈل تھما دیا گیا۔ جنہوں نے اس سے رسید کے بغیر مال خریدا تھا۔ انہوں نے مکمل گوشوارے بھی ساتھ لگا رکھے تھے۔ بیان دیکھ کر اسٹینلے حواس باختہ ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد مقدمے کا آغاز ہوا۔ اسٹینلے کو روز عدالت جانا پڑتا اور اس کا کاروبار بھی متاثر ہونے لگا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کا کلاس فیلو مائک عدالت میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ سرکاری وکیل کے پاس گیا اور اس سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ آج اس کی شخصیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ شکل و صورت وہی تھی لیکن آج وہ کلین شیو تھا اور اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس نے قیمتی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں بڑی خود اعتمادی تھی۔ اسٹینلے کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے وکیل سے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

وکیل بولا۔ ''آپ اسے نہیں جانتے؟ حیرت ہے۔ یہ مائک ہے۔ محکمہ انکم ٹیکس کا سب سے چالاک اور کامیاب سراغ رساں۔ بڑا دولت مند آدمی ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ جب سراغ رساں کسی جرم کے بازی کا پتا چلا کر عدالت میں اسے ثابت کر دیتے ہیں تو مجرم پر بھاری جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ سراغ رساں کو ہر جانے والی رقم سے بیس فیصد اور کمیشن ملتا ہے۔''

کولڈ ڈرنک

ایک آدمی جنگل سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے چیتا آ گیا۔ چیتے نے کہا: ''میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

آدمی بولا: ''میری عمر زیادہ ہے اس لئے میرا خون تو ٹھنڈا ہے، پیچھے ایک نوجوان آ رہا ہے اس کا خون گرم ہے تم اس کا خون پینا۔''

چیتا: ''نہیں، آج میرا دل کولڈ ڈرنک پینے کو چاہ رہا ہے۔''

براحال

ایک صاحب کسی مخولیے کا تذکرہ کر رہے تھے اور مسکرا کر کہنے لگے۔

''وہ ظالم تو ایسی باتیں کرتا ہے کہ گدھے کو بھی ہنسی آ جائے۔ میرا تو ہنس ہنس کے بُرا حال ہو گیا ہے۔''

شکایت

گلوکار نے اپنے ہمسائے سے شکایت کی۔ ''بھائی صاحب! میں جب بھی گانا گاتا ہوں تو آپ کا کتا بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔''

ہمسائے نے جواب دیا۔ ''اس میں کتے کا کیا قصور ہے پہل تو آپ ہی کرتے ہیں۔''

پپو کا قصور

بیٹی (ماں سے): ''امی پپو نے شیشہ توڑ دیا۔''

ماں بولی۔ ''وہ کیسے؟''

بیٹی نے کہا: ''میں نے پپو کو پتھر کھینچ کر مارا اور وہ سامنے سے ہٹ گیا۔''

وقت کا انتقام

ظاہر شاہ

اس عورت کی کہانی جس نے اپنے شوہر کو قتل کردیا تھا لیکن سات سال بعد مقتول شوہر انتقام لینے واپس آگیا

جرم و سزا کی تازہ ترین کہانی

منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے محض دو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن لوسیلی مارٹینز کو سمندری موجوں کا طوفانی شور یہیں سے صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کی کار کے روانہ ہوتے ہی تیز اور طوفانی بارش شروع ہوگئی تھی۔ نیلگوں رات میں کار کی ہیڈ لائٹس راستے کی تاریکی دور کرنے میں مصروف تھیں۔

اس نے رومال سے چہرے کو صاف کیا جس پر بارش کے چھینٹے مسلسل پڑ رہے تھے۔ بوندیں کار کی ونڈ اسکرین کے ایک چھوٹے سے شگاف سے ہوا کے ساتھ اس پر گر رہی تھیں۔ اسے خدشہ تھا کہ بارش کا پانی اس کا میک اپ خراب کر ڈالے گا۔ وہ بے زار کن غصے کے ساتھ یہ بھی سوچنے لگی کہ کہیں بارش کی وجہ سے اس کے سرخی مائل بالوں کا نیا رنگ نہ دھل جائے۔

اچانک آسمانی بجلی اسے اپنے قریب ہی کڑکتی

محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے زرد رنگ کی کار پر ایک بہت بڑا بم پھٹ گیا ہو۔ دوسری مرتبہ بجلی کڑکی تو اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس پر روشنی کے تیر برسا رہا ہو۔ آسمانی بجلی کسی اژدہے کی مانند تھی جس کی آتشیں زباں تیزی سے اندر باہر حرکت کر رہی تھی۔ بجلی کی کڑک اور لمحے بھر کو چمکتی ہوئی روشنی میں ریت کے ٹیلوں، درختوں اور جھاڑیوں پر چھائی ہوئی ویرانی، اپنے بھیانک پس منظر کے ساتھ عجیب اور دہشت انگیز محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اس شاہراہ تک پہنچ گئی جو کھاڑی کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی لیکن اس کی کار یہاں پہنچ کر خوف ناک شور کے ساتھ رک گئی۔ سامنے راستہ بند تھا طوفان باد و باراں کے سبب درخت کی ایک شاخ سڑک کے درمیان گر گئی تھی۔ غالباً یہی وہ وقت تھا جب آسمان پر بجلی کی مستقل کڑک اور تیز روشنی میں اسے ایک شخص نظر آیا تھا جو شاید اپنی جان بچانے کے لیے سمندر کی تیز و تند موجوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کا سر خون میں لت پت تھا، بالکل جیمز بولینڈ کے سر کی طرح۔۔۔ جس کے سر پر آج سے سات سال قبل ایک ایسی ہی رات میں لوسیلی نے کشتی کا فولادی ہک دے مارا تھا۔

لوسیلی کو اپنی دھڑکنیں تیز ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے اعصاب پر شدید تناؤ سوار ہو گیا۔ اچانک بجلی پھر کڑکی اور روشنی کا ایک سیلاب سا امڈ پڑا۔ اس کے بعد لوسیلی کو محسوس ہوا کہ جو کچھ اسے نظر آیا تھا وہ کوئی شخص نہیں بلکہ ربر کی ایک سرخ گیند تھی جو تیزی سے چکر کھاتے ہوئے پانی میں اچھل رہی تھی۔

لوسیلی نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ اب ایک بار پھر سکون کی سانس لے رہی تھی۔ اس نے غصے کا رخ خود اپنی ہی جانب موڑ دیا۔ کیا میں ایک کمزور اور ضمیر گرفتہ احمق ہوں۔ کیا میں اس قدر نرم دل اور نرم خو ہو سکتی ہوں کہ ایک ٹیلی فون کال اور طوفانی رات کے خوف سے آسیب کے وجود پر یقین کرنے لگوں۔

اس نے ان خیالات و سوالات کے ساتھ ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید ضمیر کی یہ خلش بالکل اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ جس طرح بوڑھی عورتوں میں جوڑوں کا درد مرتے دم تک ساتھ رہتا ہے۔ یہ ضمیر کی خلش ہی تو تھی جس نے اسے محض ایک فون کال پر بریکر بیچ جانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

صبح کے وقت فون آیا تو ایمن مارٹینز ابھی محو خواب ہی تھا اور وہ دوپہر سے پہلے بے دار نہیں ہوتا تھا۔

''کیا آپ مسز ایمن مارٹینز ہیں؟'' کسی نے استفسار کیا تھا۔ ''جی ہاں۔'' لوسیلی نے کچھ اضطراب کے ساتھ جواب دیا۔

''آپ کے نام ایک پیغام ہے۔۔۔ مسٹر جیمز بولینڈ کی جانب سے۔'' لوسیلی کو اپنے اعصاب اور احساسات پر مکمل قابو رکھنے کا فن آتا تھا۔ یہ ایک ایسی خوبی تھی جو ہمیشہ حسین لوسیلی کی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ اسے اپنی اس صلاحیت پر ناز تھا کیونکہ اسی صلاحیت کو استعمال کر کے وہ غربت سے نکل کر آسائش کی دولت سے مالا مال ہوئی تھی لیکن اس فون کال کو سن کر ایک لمحے کے لیے اسے اپنا اعتماد متزلزل ہوتا محسوس ہوا تھا۔

''قطعی ناممکن ہے۔۔۔'' لمحے بھر کی خاموشی کے بعد وہ اچانک بول پڑی کیونکہ مسٹر بولینڈ کو مرے ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔

''مگر یہ پیغام مسٹر جیمز بولینڈ کی جانب سے ہے۔'' دوسری طرف سے فون پر اصرار کیا گیا۔ یہ آواز بڑی عجیب اور کھردری تھی جسے لوسیلی پہچان نہ سکی۔ حالانکہ آواز کچھ کچھ شناسا بھی لگتی تھی۔

''تمہیں آج ہی رات ان سے ملاقات کے لیے بریکر بیچ آنا ہوگا۔''

''بالکل مضحکہ خیز۔۔۔'' لوسیلی نے غصے سے کہا مگر اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے

لگے تھے۔

"پیغام یہی ہے خاتون! مسٹر جیمز بولینڈ آج رات روشن ہاؤس میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔"

"تم کون ہو؟" لوسیلی نے سوال کیا۔

"اگر تم وہاں نہ پہنچیں تو جائیداد کا تصفیہ روک کر تمہارے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جائے گی۔۔۔ پھر ظاہر ہے، ایمن مارٹینز سے پوچھ گچھ بھی ہوسکتی ہے۔" فون پر اسے دھمکی دی گئی۔

لوسیلی نے خشک ہونٹوں پر زبان کی نوک پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں آؤں گی۔ ہوسکتا ہے کل صبح ہی آسکوں۔ کیونکہ فاصلہ بہت زیادہ ہے اور بارش بھی کافی تیز ہورہی ہے۔ مجھے بارش کے رکنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"نہیں۔۔۔ آج ہی رات!" سنگدلانہ آواز پھر فون پر گونجی۔ "آج رات نہیں تو پھر کبھی نہیں۔"

پسینہ اب لوسیلی کی پشت پر بھی بہہ رہا تھا۔ وہ چیخی۔ "تم کون ہو؟" جواب میں صرف کلک کی آواز آئی اور فون بند ہوگیا۔

لوسیلی پر خوف کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

اس کا بدن جل رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ جم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جم تو وہ شخص تھا جسے اس نے سات سال قبل بریکر بیچ کے گرین رولر میں موت سے بچنے کی جدوجہد کرتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔ اور پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے جم کے زندہ رہنے کی آخری کوشش کو آہنی ہک سے اس کے سر پر وار کرکے ناکام بنادیا تھا اور جب وہ زخم کھا کر سطح آب پر آخری بار ابھرا تھا تو اس کی آنکھوں میں ناقابل فراموش تاثرات تھے۔

اس نے کئی بار سوچا کہ کاش! جم کی دولت اس کی آنکھوں کے ان تاثرات کی یاد کا بدل بن جاتی جو ڈوبتے وقت جسم کی آنکھوں میں تھے۔ اس کا گول چہرہ کسی جھلی کی طرح سفید تھا لیکن خون بہہ کر اس کے چہرے اور سر پر یوں پھیل گیا تھا جیسے اس نے قرمزی ٹوپی پہن رکھی ہو۔ جہاز کے کیبن میں موجود لیمپ کی ٹمٹماتی روشنی میں اسے جم کا سر کسی سرخ گیند کی مانند نظر آیا تھا اور پھر وہ پانی کے نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

ایک وحشیانہ جھٹکے سے لوسیلی نے کار کو سڑک پر گری ہوئی شاخ سے بچاتے ہوئے موڑا اور گیئر تبدیل کرکے کار کی رفتار تیز کردی۔

بریکر بیچ چھوٹا سا دور افتادہ شہر بھوتوں کے کسی کیمپ کی طرح تھا۔ سیاحوں کا ہجوم سال میں صرف تین ماہ تک یہاں رہتا تھا اور دسمبر میں مزدوروں کے عالمی دن کی تقریبات کے بعد یہاں ویرانی رقص کرنے لگتی تھی۔ تختوں سے بنے ہوئے راستوں اور ویران شاپنگ سینٹر کے ادھر چوبی فریموں سے بنے ہوئے بے ترتیب چھوٹے چھوٹے ہوٹل تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ ہوٹل سڑک کے مقابل اس طرح ایستادہ تھے، جیسے سمندر کے خوفناک دباؤ سے بچنے کی کوشش کررہے ہوں۔

دور دور تک گھپ اندھیرا تھا۔ لوسیلی کی کار سے وقتاً فوقتاً ساحلی موجیں آکر ٹکراتی رہیں لیکن اس کی منزل ابھی دور تھی۔ وہ اس علاقے سے واقف تھی۔ اس لیے کچھ دیر بعد کسی دشواری کے بغیر روشن ہاؤس کے عقب میں پہنچ گئی۔ کئی سال گزرنے کے باوجود یہاں زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی زرد کار پارکنگ کے لیے مخصوص ایک مختصر سی جگہ پر روک دی۔۔۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا اور تیزی سے تاریک راستے پر دوڑ پڑی۔ اس کی اونچی ایڑی کے سینڈلز دلدلی پانی میں تربتر ہوگئے تھے۔

وہ ایک منقش دروازے کے سامنے رکی اور اسے زور زور سے پیٹنا شروع کردیا۔ بارش سے اس کا جسم بری طرح بھیگ چکا تھا۔

کمرے کے اندر کسی نے روشنی کی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ لوسیلی جلدی سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ دروازے پر ایک بوڑھی عورت موجود تھی۔ اس نے دروازہ بند کرکے کنڈی چڑھادی

دبلی پتلی بڑھیا کسی زندہ لاش کی طرح تھی۔ اس کا چہرہ مصر کی قدیم حنوط شدہ لاش جیسا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر ان گنت باریک اور مہین لکیروں اور جھریوں کا سلسلہ تھا۔ ان جھریوں اور لکیروں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے تبت کے کوہستانی سلسلوں کا نقشہ ہو۔ کمرے میں بغیر شیڈ کا ایک بلب تھا، جس کی روشنی بڑھیا کے زردی مائل بالوں پر پڑ رہی تھی۔

''تو آپ مسز مارٹینز ہیں؟'' بڑھیا نے پوچھا اور لوسیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بڑھیا کی رہنمائی میں خالی کمروں کی راہ داری میں پہنچ گئی۔

تاریک کمرے چونے کے پتھروں کے بنے ہوئے غار لگ رہے تھے۔ فرنیچر کو گرد سے محفوظ رکھنے کے لیے معقول انتظام تھا اور یہ کمرے آرائش کے اعتبار سے بہترین اور قابل دید تھے۔ بڑھیا اسے ایک کمرے میں لے گئی جہاں ایک آتش دان میں انگارے چیخ رہے تھے۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ ''برائے مہربانی اس رجسٹر پر دستخط کر دیجیے۔'' بڑھیا نے لوسیلی سے درخواست کی۔ ''اس کے بعد آپ آگ سے اپنے بدن کو حرارت پہنچا سکتی ہیں۔''

لیکن لوسیلی بڑھیا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آتش دان کے قریب کھڑی ہو گئی۔ وہ شعلوں کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ تاکہ اس کا سرد جسم کچھ گرم ہو جائے اور بھیگے ہوئے کپڑے بھی خشک ہو سکیں۔ ''مجھے رجسٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرا ارادہ یہاں قیام کا نہیں ہے۔'' لوسیلی نے کچھ دیر بعد وضاحت کی۔

بڑھیا ڈیسک تک جا کر روشن ہاؤس کا رجسٹر اٹھا لائی۔ رجسٹر کیا تھا بس ایک پتلی سی کیش بک لگتی تھی۔ اس نے یہ پتلا سا رجسٹر لوسیلی کے سامنے رکھ دیا۔ ''تمہیں یہاں رکنا پڑے گا۔'' بڑھیا کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''تم جس سے ملاقات کے لیے یہاں آئی ہو وہ ابھی پہنچنے ہی والا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے لوسیلی کے ہاتھ میں ایک قلم تھما دیا۔

لوسیلی نے انتہائی تنگ مزاجی سے رجسٹر ہاتھ میں لے لیا لیکن وہ دستخط کرتے کرتے اچانک رک گئی۔ رجسٹر کے اس صفحے پر ایک نام پہلے سے درج تھا۔ صرف ایک نام۔۔۔ جیمز بولینڈ۔

لوسیلی کی ننھی سی روح دہشت زدہ ہو گئی۔ ایک لمحے کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس جگہ کوئی بھوت رقص کر رہا ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں آ کر اس نے کتنی بڑی حماقت کی ہے۔۔۔ ایک مردہ شخص سے ملاقات کرنے کی حماقت۔۔۔ لیکن اپنے احساسات کو چھپانے کی دیرینہ مشق اور ریاضت نے یہاں بھی اس کی مدد کی۔ اس نے خوف و دہشت کے جذبے کو بھلانے کی کوشش میں بظاہر بے نیازی کے ساتھ رجسٹر پر درج نام کے نیچے اپنے دستخط بھی کر دیے۔ پھر نہ جانے کیوں اپنی کپکپاتی ہوئی تحریر پر وہ نادم سی ہو گئی۔

لوسیلی پلٹ کر آتش دان کی طرف دیکھنے لگی اور پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''کیا تم اس شخص کے بارے میں بتا سکتی ہو؟''

''وہ پستہ قامت ہیں اور ان کا جسم گٹھا ہوا ہے، چہرہ مکمل چاند جیسا ہے اور کانوں کے علاوہ ناک پر بھی کہیں کہیں خون کی سرخی جھلکتی ہے وہ ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جو زندگی کا بھرپور لطف اٹھانے کا عادی ہو۔ میرا خیال ہے، تم دونوں پرانے دوست ہو۔''

آگ کی تپش کے باوجود لوسیلی کانپ گئی۔

بڑھیا نے جو کچھ بتایا تھا، وہ جم پر صادق آتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ہاں۔۔۔ جم بھی بھرپور زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے بڑھیا سے کہا۔ ''کیا تم اس ہوٹل کی نگران ہو؟''

''ہاں۔۔۔ تم مجھے نگران ہی سمجھ سکتی ہو۔'' بڑھیا نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بریکر بیچ ہی میں گزارا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں یہاں پر کچھ جائیداد

خریدوں۔۔۔مگر یہ اب بہت پرانی بات ہوگئی ہے۔''

''اوہ۔۔۔کیا واقعی۔'' لوسیلی نے یونہی کہہ دیا حالانکہ سے بڑھیا کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''ہاں۔۔۔'' بڑھیا اپنی ہی جھونک میں بول رہی تھی۔ ''بہرحال جب میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تو میرے بیٹے نے جائیداد کی دیکھ بھال شروع کردی۔۔۔لیکن مستقبل میں کون جھانک سکتا ہے۔''

بڑھیا نے ایک دلدوز آہ بھرنے کے لیے لمحے بھر کو سلسلہ کلام توڑ دیا۔ ''بدقسمتی سے میرا بیٹا قتل کردیا گیا۔ اس نے میری بانہوں میں دم توڑا تھا۔ اسے زندگی نے صرف اتنی ہی مہلت دی تھی کہ وہ اپنے قاتل کے بارے میں مجھے بتا سکے۔''

لوسیلی کو بڑھیا کی کہانی سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ آج کی رات وہ موت یا تشدد کے بارے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی چنانچہ اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔ ''سنیے بی! میں اس طوفانی رات میں تمہاری آپ بیتی سننے نہیں آئی۔ مجھے صرف اس بات سے دلچسپی ہے کہ مسٹر بولینڈ کہاں ہیں؟ آخر وہ وقت مقرر کرنے کے بعد ملاقات کے لیے یہاں کیوں نہیں پہنچے؟''

''مسٹر بولینڈ سے تمہاری ملاقات جلد ہی ہوگی۔۔۔آؤ میں تمہارا کمرہ دکھادوں۔''

لوسیلی خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ چند زینے چڑھنے کے بعد وہ ایک کشادہ غلام گردش سے ہوتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ ''یہ اس عمارت کا سب سے اچھا کمرا ہے۔'' بڑھیا نے پلٹ کر کہا۔ ''مسٹر بولینڈ نے اس کمرے کو آپ کے لیے مخصوص کرنے کی خواہش کی تھی۔''

لوسیلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ شدید بے چینی میں مبتلا تھی کیونکہ اس کمرے میں وہ پہلے بھی آچکی تھی۔۔۔لیکن اس قیام کو طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ جم بولینڈ اسے دلہن بنا کر لایا تھا تو اس نے بریکر بیچ میں موجود اپنی جائیداد کی سیر کراتے ہوئے اس کمرے کے سامنے آکر بالکل یہی بات کہی تھی کہ یہ اس ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا ہے۔۔۔یہی وہ کمرا تھا، جہاں جم بولینڈ نے اس سے ضد کی تھی کہ وہ جہاز کے کیبن سے سمندر کا نظارا کرنے کے لیے اس کے ساتھ چلے۔۔۔اور پھر اسی خواہش کے انجام پر جم موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا۔

اس نے خیالوں کی دنیا سے نکل کر بڑھیا کی طرف دیکھا۔ اس بڑھیا کے لیے لوسیلی کے دل میں بے پناہ نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ حالانکہ اس نفرت کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا، سوائے اس کے کہ بھدی سی اس بڑھیا کو ان بھولی بسری یادوں کا کوئی علم نہیں تھا جن کا اس کمرے سے تعلق تھا۔ لوسیلی سوچ رہی تھی کہ وہ اس کمرے میں سو بھی نہیں سکتی۔ اس میں قوت ارادی کا کوئی دخل نہیں تھا، بات صرف اتنی سی تھی کہ آج کی رات خوف کی وجہ سے وہ اس کمرے میں سو نہیں سکتی تھی۔ اس کے علاوہ سمندری طوفان اور تند و تیز ہوا کی وجہ سے یہاں خاصا شور رہتا تھا۔ ہوا کے ساتھ لہریں کمرے کی کھڑکی سے آکر ٹکراتی تھیں۔ تو ایسی آوازیں پیدا ہوتیں جیسے ان گنت نقارے بج رہے ہوں۔۔۔پھر یہ لہریں کھڑکیوں کی درزوں سے یوں اندر آجاتیں جیسے کمرے کے فرش پر چوری چھپے داخل ہونے والے سانپ کنڈلی مار کے بیٹھ جاتے ہیں۔

''یہ اس ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا ہے؟'' لوسیلی نے کہا اس کے لہجے میں طنز کی تلخی تھی۔ ''میرا خیال ہے، اس کمرے میں تو بطخیں بھی نہیں رہ سکتیں۔''

''مجھے افسوس ہے، مسز مارٹینز!'' بڑھیا نے جلدی سے معذرت کی۔ ''کمرے میں آنے والے پانی کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ دراصل آج شام تک طوفان اتنا شدید نہیں تھا۔ بہرحال میں آپ کے لیے کوئی اور کمرا تیار کردیتی ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آگئیں۔ ''آپ ٹھہریں۔۔۔میں پہلے آپ کے

لیے کوئی گرم مشروب لاتی ہوں۔'' بڑھیا نے کہا اور ایک دروازے سے گزر کر لوسیلی کی نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔

لوسیلی اب تنہا تھی۔ وہ آتش دان کے قریب پہنچ گئی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں سے اسے فوری طور پر قدرے حرارت کا فرحت بخش احساس ہوا تو اعصابی کھچاؤ اور خوف میں کمی آ گئی۔ وہ گھسیٹ کر آتش دان کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ اس نے پیروں سے سینڈلوں کو اتار پھینکا اور ٹانگوں کو آتش دان کے قریب کرلیا اب وہ بہت دیر بعد اطمینان اور سکون کی سانس لے رہی تھی۔

آنکھیں بند کر کے وہ جم بولینڈ کی اس جائیداد کے بارے میں غور کرنے لگی جس کے حصول میں اب اسے زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔۔۔ پھر منتشر خیالات اسے مضطرب کرنے لگے۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی سے شکایت تھی کہ جم بولینڈ کی جائیداد کی مالک بننے کے لیے اسے مزید سات سال تک انتظار کرنا پڑا۔۔۔ لیکن اسے یقین تھا کہ جم بولینڈ اپنی ملکیت کا دعوا کرنے کے لیے واپس نہیں آئے گا۔

اس جائیداد نے ہی لوسیلی کے دل میں جم کو جہاز کے کیبن سے سمندر میں دھکیل دینے کی خواہش پیدا کی تھی۔۔۔ اس نے فوری طور پر اپنی اس خواہش کو عملی جامہ بھی پہنا دیا اور پھر مسٹر مارٹینز سے شادی کرلی۔ جم بولینڈ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ یہ بات سبھی کے علم میں تھی، اس لیے اس کی موت کو حادثے کا رنگ دینا لوسیلی کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ جم سمندر میں ڈوب گیا تو وہ کسی ایسی دلہن کی طرح ساحل پر آئی تھی جو شوہر سے صرف چند گھنٹوں کی رفاقت کے بعد ہی بیوہ ہوگئی ہو۔ اس نے بڑے رقت آمیز انداز میں لوگوں کو بتایا کہ جم بولینڈ جہاز کے رسوں میں الجھ کر حادثاتی طور پر سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے ہوئے دیکھتی رہی اور اسے بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کرسکی۔

وہ نہ صرف ایک اچھی اداکارہ تھی بلکہ اس کا منہ زور اور دل آویز حسن، جسمانی کشش اور شباب، مردوں کی نگاہوں کو الجھانے کی قوت سے مالا مال تھا۔ اس کی سبزی مائل آنکھیں اور چمک دار سنہرے بال کسی بھی مرد کو دام میں پھانس لینے کے لیے کافی تھے۔ وہ انہی خوبیوں کے سہارے اپنی کہانی کو لے کر چل رہی تھی۔

اسی دوران مارٹینز کو اپنی زلف کا اسیر کرنے کے لیے بھی وہ منصوبے بناتی رہی۔۔۔ لیکن جب وہ اس کام پر عمل درآمد کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوئی تو قسمت نے اس کے ساتھ ایک دلچسپ مذاق کیا۔۔۔ جم کی لاش سطح آب یا ساحل پر نمودار نہ ہوئی، پورا ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے۔ ایک مہینہ اور پھر پورا سال بیت گیا۔ لیکن جم کی لاش نہ ملی۔۔۔ اور اسی ایک حقیقت نے لوسیلی کے تمام منصوبوں کو درہم برہم کردیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایسا کوئی بھی شخص وہاں موجود نہیں تھا جس نے جم کو لوسیلی کے ساتھ سیر کے لیے جہاز پر دیکھا ہو اور قانون کی باریکیوں کے پیش نظر جم کو اس وقت تک مردہ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا جب تک اس کی لاش کا پتا نہ چل جاتا۔۔۔ چنانچہ جم کی تمام ملکیت عارضی طور پر عدالت ہی کی تحویل میں تھی اور اس قانونی کارروائی کو پورا کرنے کے لیے سات سال کا عرصہ درکار تھا۔

عدالت نے لوسیلی کو ٹرسٹی مقرر کردیا۔ سات سال بعد جب قانونی تقاضے پورے ہوجاتے تو بالآخر لوسیلی کے لیے جائیداد کا حصول آسان ہوجاتا کیونکہ جم کی وصیت کے مطابق اس کی جائیداد کی واحد حق دار لوسیلی ہی تھی۔ ابتدا میں تو لوسیلی ٹرسٹ فنڈ کے استعمال میں بے حد محتاط رہی لیکن اسے خدشہ تھا کہ سات سال کی اس مدت میں اس کی جوانی اور شباب ڈھل بھی سکتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ ایمن مارٹینز کو قابو میں کرنا ایک مشکل کام ہے۔ بہرکیف اس نے مارٹینز کی عیاشیوں کے لیے مجبوراً ٹرسٹ کے فنڈ سے رقم نکالنے کا سلسلہ شروع

کردیا۔ یہی بنیادی وجہ تھی کہ وہ بریکر پوائنٹ پہنچنے کی ہدایت کو نظر انداز نہ کرسکی۔ اسے اندیشہ تھا کہ حساب کتاب کی سخت جانچ پڑتال سے وہ اس ٹرسٹ سمیت ایمن ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اس لیے وہ ایمن کے بے دار ہونے سے پہلے ہی وہاں سے کھسک گئی۔ جاتے ہوئے اس نے ایمن کے سرہانے ایک پیغام چھوڑ دیا۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایمن اس سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرے گا کیونکہ بزنس کی باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

آتش دان کے سامنے بیٹھے بیٹھے لوسیلی کے ہونٹوں پر ایک مدہوش سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ پہاڑ پر ایک محل خرید لے گی کیونکہ وہ سمندر کو ہرگز دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی شریر قاتل آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ اسے نیند آنے لگی۔ اس نے ایمن کو راہ پر لانے کے لیے بھی ایک منصوبہ سوچا۔ ایمن کو تو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لوسیلی کے ہوتے ہوئے وہ آزادی اور عیش و عشرت کی زندگی سے کبھی محروم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے تو راوی نے عیش ہی عیش لکھ رکھا تھا۔

اچانک چمنی سے ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ آتش دان کے شعلوں سے دھویں کے بادل اٹھنے لگے۔ آگ کے باوجود ٹھنڈی ہوا سے لوسیلی کا بدن ایک لمحے کے لیے نم ہوگیا۔ بادلوں کی خوف ناک گرج سے ہوٹل کی پرانی عمارت لرز اٹھی۔۔۔ دھویں کی وجہ سے لوسیلی کھانسنے لگی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے جلدی سے سینڈل پہنے اور آتشدان سے دور ہٹ گئی۔ وہ بے زاری کے عالم میں چلتی ہوئی دہلیز کے دروازے تک پہنچ گئی۔ یہ بڑھیا کہاں غائب ہوگئی۔ اس نے سوچا۔ اسے تو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔

کھڑکی کے شیشوں سے باہر کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی چنانچہ اس نے کوشش کر کے دروازہ کھول دیا۔ اچانک تیز ہوا کے جھونکوں سے اس کے رنگ دار بال اڑنے لگے۔ ہوٹل کے سامنے والی دیوار سے سمندری موجیں خوف ناک شور کے ساتھ ٹکرا کر واپس جارہی تھیں۔

''یہ لکڑی کے تختوں کا راستہ۔۔۔'' لوسیلی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اس تند و تیز طوفان میں تو یہ ایک ہی ریلے میں بہہ سکتا ہے۔'' اس نے گھبرا کر دروازہ بند کردیا۔ اسی لمحے بڑھیا بھی پہنچ گئی۔

''میں تمہارے لیے گرم کافی لائی ہوں۔'' اس کے ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے کپ سے بھاپ اٹھتی نظر آرہی تھی۔ ''جب آپ یہ کافی پی لیں گی تو میں آپ کو ایک ایسے کمرے میں لے چلوں گی جو رہنے کے قابل۔۔۔''

''میں فیصلہ کرچکی ہوں کہ یہاں قیام نہیں کروں گی۔'' لوسیلی نے چیخ کر کہا۔ ''میں گھر واپس جارہی ہوں۔''

''لیکن اس طوفان میں تم گھر نہیں جاسکو گی۔'' بڑھیا نے احتجاج کیا۔ ''پھر ایک شریف آدمی نے آپ کو وقت دے رکھا ہے۔''

''تو پھر اسے اب تک یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔'' لوسیلی نے بڑھیا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اتنی دیر بھی یہاں رک کر حماقت کی ہے۔''

''آپ اپنی کار کو ہائی وے پر نہیں لاسکتیں۔ طوفان کے تیور خطرناک ہیں۔'' بڑھیا نے دلیل پیش کی۔

لوسیلی نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ کہیں میں پاگل تو نہیں ہورہی ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا جم بولینڈ سمندر کی تہہ سے نکل کر زندہ سلامت واپس بھی آسکتا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ لوسیلی کا ذہن جم کے سلسلے میں بھٹکنے لگا تو اس نے جلدی جلدی کافی پینا شروع کردی۔ کافی اسے حلق میں اٹکتی محسوس ہونے لگی۔ پھر اس نے دیکھا کہ بڑھیا اس کے لیے وھسکی لیے کھڑی ہے۔ وھسکی کی تندی اور گرمی نے لوسیلی کی ہمت کو سہارا دیا۔ بڑھیا

اسے لے کر اس کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ غلام گردش کے اداس اور خاموش ماحول سے ہوتے ہوئے ہوٹل کے عقبی حصے میں پہنچ گئیں۔۔۔ پھر تہہ خانے میں پہنچنے کے لیے زینے سے آہستہ آہستہ اترنے لگیں۔ ہوٹل کے عقبی حصے میں ایک اور چھوٹی سی غلام گردش بھی تھی۔ روشنی ہوئی تو لوسیلی نے دیکھا کہ شہتیروں پر جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ مہمان خانے کے سوا کوئی متبادل موزوں جگہ مہیا نہ کر سکی۔'' بڑھیا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

یہ کمرا جہاں لوسیلی کو لایا گیا تھا، چھوٹا سا تھا۔ اس کی دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور فرش پختہ تھا۔

''یہ ڈریسنگ گاؤن لیجیے۔ بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر اسے پہن لیں۔ میں جاتی ہوں تاکہ اگر وہ شریف آدمی آ گئے ہوں تو انہیں یہاں بھیج دوں۔'' بڑھیا یہ کہہ کر مہمان خانے سے چلی گئی۔

لوسیلی نے اپنا بھیگا ہوا بھاری بھرکم لباس اتار کر گاؤن پہن لیا اور سوچا کہ بڑھیا واپس آئے گی تو اس سے اپنا لباس آگ کے قریب رکھ کر خشک کرنے کے لیے کہہ دے گی۔۔۔ لیکن اچانک ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے اس مقام سے خوف آنے لگا اور وہ شدت سے خود کو دنیا سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگی۔ اسے سمندر کی طوفانی موجوں کے ہوٹل کی دیواروں سے ٹکرانے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ بلکہ اب تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے لہریں اس کے سر سے ٹکرا رہی ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ موجوں کی تیزی سے کمرا ہل رہا ہو۔ اس نے سوچا کہ پانی پر بنا ہوا چوبی رستہ، موجوں کے تھپیڑے کھا کر تہس نہس ہو چکا ہوگا۔ یہ چھوٹا سا کمرا ہوٹل کے آخری حصے میں واقع تھا۔

لوسیلی نے ایک بار پھر اپنے سر پر موجوں کا شور سنا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ چھت پر لگا ہوا برقی بلب اس طرح جھولنے لگا جیسے کٹھ پتلی کا تماشا ہو رہا ہو۔۔۔ پھر اچانک شور دب گیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی گھمانی چاہی لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ خوف و دہشت کی ایک بے رحم لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے دروازے کو توڑنے کا ارادہ کیا لیکن دروازہ ٹھوس اور بے حد مضبوط تھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو محسوس ہوا کہ دروازے کے باہر جو کنڈی لگی ہے وہ کمزور ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دروازے کی بیرونی کنڈی سے اس کا خیال کمرے میں جمع ہونے والے سمندری پانی کی طرف چلا گیا پھر اسے میز پر پڑی ہوئی شمع کا خیال آیا۔ اسی لمحے چھت پر لگے ہوئے بلب کی روشنی بھی غائب ہو گئی۔ تاریکی میں وہ اس قدر خوف زدہ ہو گئی کہ اس کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ اندھیرا ہوتے ہی سمندر کا پانی چھت کی دراڑوں سے تیزی کے ساتھ کمرے میں گرنے لگا۔

اندھیرے میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے لوسیلی نے بمشکل شمع تک رسائی حاصل کی اور اپنے لائیٹر سے اسے روشن کر دیا۔ کمزور اور بیمار بیمار سی روشنی میز پر پڑے ہوئے کاسی کے ایک منقش گل دان پر پڑی جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

''جیمز بولینڈ کی یاد کے لیے وقف۔۔۔ جو ۱۰ جولائی ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوا اور ۲۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

اس کی پیاری ماں سارہ بولینڈ کی جانب سے۔''

لوسیلی کا دماغ خطرناک حد تک تخریبی ضرور تھا لیکن وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ اس کا ذہن آئندہ آنے والی حقیقت کو کھل کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھنے لگی تھی کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کے ذہن میں فون کی مبہم سی آواز گونجنے لگی اور اسے یاد آیا کہ وہ آواز بڑھیا کی آواز جیسی ہی تھی۔ یہ بڑھیا کی جم بولینڈ سے مشابہت و تعلق کا ایک حوالہ تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ بڑھیا ہی سارہ بولینڈ ہے اور وہ جم ہی تھا جو اپنی ماں سے آخری ملاقات تک زندہ رہا۔ اس نے

اپنی ماں کو بتا دیا کہ اسے اس کی نو بیاہتا دلہن نے کس طرح قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''تو یہی وجہ تھی کہ جم کی لاش نہ مل سکی۔'' لوسیلی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

سارہ بولینڈ نے اسے چپکے سے دفن کر دیا تھا۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کی موت کے بعد طویل عرصے تک انتظار کیا۔ سات سال اس نے ایک ایسی عورت کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے گزار دیے جو اس کے بیٹے کی جائیداد پر حریصانہ نگاہ گاڑے ہوئے تھی۔ سات سال اور اس کے بعد لوسیلی کی موت۔۔۔

آج کی طوفانی شب، لوسیلی کو دہشت اور موت کا سامنا تھا۔ سمندر کی ایک بپھری ہوئی لہر اوپر واقع دہلیز سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی چھت سے پانی کا ریلا اندر گھس آیا۔ پھر کمرا تیزی سے بھرنے لگا۔ لوسیلی کے اعصاب پر فون پر سنی ہوئی آواز مسلط تھی۔ یہی وہ آواز تھی جس پر وہ بریکر پوائنٹ تک کھنچی چلی آئی تھی۔ یہ پیغام فون پر سارہ بولینڈ ہی نے دیا تھا اور وہی بڑھیا اس کے لیے موت کی قاصد بن گئی تھی۔

ادھر بوڑھی سارہ بولینڈ نے لوسیلی کے بند کمرے کی چھت پر ہتھوڑے برسانا شروع کر دیے۔ شگاف میں سے پانی کے گرنے کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔ آج رات لوسیلی کی روشن ہاؤس میں واقع جم بولینڈ سے ملاقات ہو رہی تھی لیکن موت کی صورت میں۔۔۔ وہ موت کی آغوش میں جا رہی تھی جہاں جم بولینڈ اس کا منتظر تھا۔ لوسیلی نے چیخ چیخ کر کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہا لیکن وہاں اس بڑھیا کے علاوہ سننے والا کون تھا جو اس کی زندگی چھین لینا چاہتی تھی۔ اسی اثنا میں لوسیلی نے زندگی کی خاطر ہیجانی کیفیت میں خود کو دروازے سے ٹکرا دیا۔ وہ پوری قوت سے مضبوط چوبی دروازے کو کھولنے کے جتن کرتی رہی لیکن تھک ہار کر بستر پر جا گری۔ وہ خوف اور تھکن کے باعث کانپ رہی تھی۔ تاہم اس میں زندہ رہنے اور موت سے فرار ہونے کی تڑپ اب بھی موجود تھی۔

سمندر کا ٹھنڈا پانی اب اس کے گھٹنوں تک پہنچ چکا تھا۔ دیوانگی کے اس خوف ناک ماحول میں بھی لوسیلی کے ذہن نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ اس پانی سے بچ کر نکل سکتی ہے۔

لوسیلی نے اداس نظروں سے کالے پتھروں کی دیواروں کو دیکھا پھر بھاری بھرکم شہتیروں والی چھت پر نظریں گاڑ دیں۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا خفیہ غار نما تھا۔ جس میں سے کوئی بھی بدنصیب مجرم زندہ سلامت بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔۔۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسے اچانک ہی ایک راہ فرار سجھائی دے گئی۔ چھت کے ایک کونے میں شمع کی مدھم روشنی میں اسے ایک سوراخ نظر آیا اسے یہ ایک چھوٹا سا روشن دان محسوس ہوا۔ وہ اچھل کر میز پر کھڑی ہوگئی اور اس سوراخ کا جائزہ لینے لگی۔ یہ واقعی ایک روشن دان تھا اور اسے لکڑی کے بولٹ لگا کر بند کیا گیا تھا۔ اس روشن دان کی کنڈی کمرے کے اندر ہی تھی۔۔۔ لیکن کاش! وہ اس تک پہنچ سکتی۔ روشن دان کھول کر وہ اس قید سے فرار ہو سکتی تھی اور یہ اس کی زندگی کا واحد راستہ تھا۔ وہ میز کو گھسیٹ کر اس کو روشن دان کے نیچے لے آئی۔ اس پر چڑھ کر دیکھا تو اس کے ہاتھ اور روشن دان کے درمیان تقریباً ایک گز کا فاصلہ تھا۔ اس کا ذہن منصوبے پر منصوبہ تیار کرتا رہا۔ وہ یہاں سے ہر حال میں فاتحانہ انداز میں نکل جانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ جم بولینڈ کی بوڑھی ماں کتنی احمق ہے۔ اس بڑھیا کو معلوم نہیں تھا کہ لوسیلی تیراک بھی ہے۔ لوسیلی نے اپنے اعصاب مکمل طور پر پرسکون رکھے۔ وہ اب خوف زدہ نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ جوں جوں پانی اوپر آئے گا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ خود بخود اوپر اٹھتی چلی جائے گی۔ یہ پانی اور زندہ انسان کے درمیان ایک ازلی رفاقت کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ پانی روشن دان کے قریب پہنچ جائے گا تو وہ تیرتی ہوئی روشن دان تک پہنچ کر اس راستے سے نکل جائے گی۔ اس کے بعد بڑھیا کو اس شرارت کا ایسا مزا چکھائے گی

کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔ آہستہ آہستہ شمع کی مدھم روشنی بھی ختم ہونے لگی اور پانی کے شمع دان تک آتے آتے کمرے میں ایک بار پھر تاریکی چھا گئی۔ لوسیلی کی دنیا ایک بار پھر اندھیر ہوگئی لیکن وہ اندھیرے میں اعتماد کے ساتھ میز پر کھڑی، پانی کے چڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔ پانی آہستہ آہستہ اس کے گھٹنوں سے اوپر چڑھنے لگا پھر اس کی کمر بھی پانی میں ڈوب گئی۔ اور پھر اس کا سینہ۔۔۔ آخر میں اس نے اپنا بھاری ہوتا ہوا گاؤن اتار پھینکا اور اپنے بے لباس جسم کے ساتھ موت کی اس وادی سے فرار ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

بریکر پیچ کی بدمست موجیں اس کے سر پر ٹکرانے لگیں۔ لوسیلی نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ تاریک کمرے میں اس کا مرمریں بدن پانی میں تیر رہا تھا۔ پانی کچھ فٹ اور چڑھ آیا۔ آخر کار کمرے کی چھت تک پانی بھر گیا۔ بڑھیا نے سوچا ہوگا کہ لوسیلی ڈوب چکی ہوگی اور اس کی مثال اس چوہے کی سی ہوگی جسے صرف برساتی نالے میں پھینکنا باقی تھا۔۔۔ لیکن اندر لوسیلی زندگی اور موت کی سرحد پر ابھی زندہ تھی۔ اس کا ہاتھ اچانک روشن دان کے بولٹ پر پڑا۔ اس نے کنڈی کھما دی۔ اس کے ساتھ ہی فتح مندی کا ایک احساس اس کے نڈھال بدن میں سرایت کر گیا۔ امید کی کرن نمودار ہوئی اور وہ سوچنے لگی کہ اب موت نہیں آئے گی۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر دوڑتی چلی جائے گی۔ اس نے ایک بار پھر روشن دان کو کھولنے کے لیے اپنی قوت مجتمع کی۔ روشن دان کھلا۔ امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ اس نے خود کو روشن دان سے نکالنے کی کوشش کی لیکن روشن دان کے باہر اتنی ہی جگہ تھی کہ وہاں اس کا نڈھال بدن ہی سما سکتا تھا۔ دوسری جانب زمین تھی، ریتلی زمین کے بجائے نم آلود اور دلدلی زمین۔ کائی اور کیچڑ سے لت پت زمین۔ یہ جگہ غالباً اس کی قبر کے لیے خاص طور پر تیار کی گئی تھی۔ اس نے اپنے انجام پر نظر ثانی کی۔ تاریک قبر کو دیکھنے کی آخری کوشش کی۔۔۔ بالآخر تھک کر موت کا انتظار کرنے لگی۔ زندگی کی طرف جانے والا آخری راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اب اسے جم بولینڈ کی روح کے ساتھ ساتھ موت کا بھی شدت سے انتظار تھا۔ اس کی مسلسل کوششوں اور چڑھتے ہوئے پانی کی وجہ سے روشن دان کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا اور لوسیلی نے موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ اس قبر میں زندہ دفن ہوگئی تھی۔

اس کے بعد لوسیلی کا کوئی پتا نہ چلا۔ اس کی زرد رنگ کی کار کھاڑی کے قریب پچاس فٹ گہرے پانی میں کھڑی ملی۔ وہ خود بھی جم بولینڈ کی طرح خاموشی کے ساتھ غائب ہوگئی۔ ایمن مارٹینز کو لوسیلی کے شوہر کی حیثیت سے اس کے سابق شوہر جم کی جائیداد کا وارث بننے کے لیے مزید سات سال انتظار کرنا ہوگا۔

ستر سالہ دل

ایک دولت مند آدمی کا دل کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اپنا دل تبدیل کرالیں۔

اس کی رضا مندی پر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”میرے پاس تین افراد کے دل دستیاب ہیں۔ اب ان میں سے آپ کون سا دل پسند کریں گے؟ ایک سولہ سالہ نوجوان کھلاڑی کا دل۔ ایک بیس سالہ رقاصہ کا دل اور ایک ستر سالہ انکم ٹیکس آفیسر کا دل۔

”انکم ٹیکس آفیسر کا دل۔“ مریض نے انکم ٹیکس آفیسر کا دل پسند کیا۔

آپریشن کامیاب رہا۔ جب ان سے پوچھا گیا انہوں نے ستر سالہ دل کیوں پسند کیا تو اس نے جواب دیا۔

”میں وہ دل چاہتا تھا جو پہلے استعمال نہ ہوا ہو۔“

انوکھی ایجاد

زبیر احمد

ایک نو ایجاد ٹائم مشین نے
اسے بہت بڑے نقصان سے
بچالیا۔
مگر جب اس پر کامیابی کا
عقدہ کھلا تو۔۔۔۔۔

عمران ڈائجسٹ کی دلچسپ فکشن کہانی

''**بزنس** ۔۔۔ بزنس۔۔۔'' ول بورن کی بیوی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''ول! میں بتا رہی ہوں کہ یہ بزنس تمہاری جان لے لے گا۔ تم اس کاروبار سے پیچھا چھڑاؤ اور کہیں اور چل کر انسانوں کی طرح رہنا شروع کرو۔''

مگر ول بورن نے اپنی بیوی کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس نے اطمینان سے کوٹ کے بٹن بند کیے اور باہر نکل کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چیختی ہوئی کرخت آواز خاموش ہوگئی۔ ول بورن نے راہداری میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لینا چاہا، مگر اسی وقت اسے اپنے معدے میں پرانے السر کے مخصوص درد کی لہر محسوس ہوئی اور اس نے پہلی بار سوچا کہ اس کی بیوی کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اسی وقت اس کے سامنے لفٹ کا دروازہ کھلا اور لفٹ میں سام نے سر نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''گڈ مارننگ مسٹر بورن! آج کا دن بہت خوش گوار معلوم ہو رہا ہے۔''

''بہت خوش گوار!'' بورن نے جواب میں دوہرایا، مگر لفٹ مین، بورن کے لہجے کے زہریلے پن کو محسوس نہیں کرسکا تھا۔ اس لیے جواب میں ایک بار پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے بتیسی کی نمائش کی۔

''بازار کا کیا حال ہے مسٹر بورن!'' سام نے لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا بھتیجا کہہ رہا تھا کہ سینٹرل مائننگ کمپنی میں رقم مت پھنسانا۔ میرے بھتیجے کو تو آپ جانتے ہیں نا۔ وہی جو پائلٹ بننے کی تیاری کررہا ہے۔ وہ بے حد ذہین ہے۔ مجھے اس کی بات کا یقین تو ہے، مگر ٹریڈ جرنل میں لکھا ہے کہ سینٹرل مائننگ کے دام ابھی اور بڑھیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال یہ ہے سام! کہ تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ بزنس کرنا کوئی ٹینس کا کھیل نہیں ہے کہ جس کا جی چاہا ریکٹ اٹھا کر آ گیا۔''

☆☆☆

دفتر جاتے ہوئے بورن ٹیکسی میں بیٹھا یہی سوچ سوچ کر کھول رہا تھا کہ لفٹ مین سام جیسے بے شمار افراد نے جو بزنس کی الف بے بھی نہیں جانتے، یہ سارا فراڈ پیدا کیا ہے۔ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا جس نے چار پیسے جمع کرلیے، مارکیٹ کی طرف بھاگتا ہے اور کسی نہ کسی کمپنی کے شیئرز خرید لیتا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مارکیٹ میں ایسی زبردست مہنگائی پیدا ہوئی۔ مانگ زیادہ ہونے کی وجہ سے بازار میں شیئرز ناپید ہوچکے تھے۔

بورن ایک بہت بڑا شیئرز بروکر تھا اور اس کی فرم ڈبلیو جے بورن ایسوسی ایٹس فی الحال بہت زوروں پر تھی۔ وہ عموماً بڑی بڑی تیل کمپنیوں اور یورینیم کی کانوں کے شیئرز کا لین دین کرتا تھا۔ سینٹرل مائننگ اور یوٹا یورینیم دنیا کی وہ عظیم ترین کمپنیاں تھیں جن کے شیئرز خریدنے کے لیے ہر شخص بے چین تھا۔ حالانکہ ان کے دام آسمان سے باتیں کررہے تھے، مگر بورن خوب جانتا تھا کہ شیئرز کی قیمتیں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں اور اب کسی بھی روز اچانک قیمتیں گر جائیں گی اور پھر قیمتوں میں یہ کمی اس قدر تیز رفتار ہوجائے گی کہ مارکیٹ کا سنبھالنا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے ایک بار پھر بورن کے معدے میں السر کا وہی پرانا درد لہرایا۔

☆☆☆

بورن جب مارکیٹ پہنچا تو نو بج کر پندرہ منٹ ہوچکے تھے۔ اسٹاک ایکسچینج کی عمارت میں حسب معمول ایک ہنگامہ بپا تھا۔ شیئرز خریدنے اور بیچنے والوں کا ہجوم بھنبھنا رہا تھا۔ استقبالیہ ہال میں کمپیوٹر اسکرین پر رنگ برنگے گوشوارے ہر لحظہ تبدیل ہورہے تھے اور ہر کارے ہر منٹ کے بعد ہال میں آکر چلاتے ہوئے لندن، پریس، ملن اور وی آنا کے تازہ ترین بھاؤ بتا رہے تھے۔ نیویارک اور سانس فرانسسکو کے ریٹ ابھی موصول نہیں ہوئے تھے۔

''ہوسکتا ہے وہ گھڑی آج ہی آپہنچے۔'' بورن نے ہال میں سے گزرتے ہوئے سوچا۔ ''اگر نیویارک سے سنٹرل مائننگ کے نرخوں میں ذرا سی بھی کمی ہوئی تو اس کا اثر سب مارکیٹوں پر پڑے گا یا اگر سان فرانسسکو سے یوٹا یورینیم کے داموں میں کمی ہوئی تو پھر شکاگو سے بھی کمی کا اعلان ہوگا اور اس کے ساتھ ہی ٹوکیو مارکیٹ سے بھی مندی کے رجحان کا اظہار ہوگا اور یوں رفتہ رفتہ دنیا بھر کی مارکیٹوں میں قیمتوں کی کمی کا ایک تیز رفتار سلسلہ شروع ہوجائے گا۔

شیئرز کے نرخوں کا معاملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے سنگتروں کا ڈھیر۔ آپ اس ڈھیر کے نیچے سے ایک یا دو سنگترے نکال لیں۔ اگلے ہی لمحے وہ پورا ڈھیر نیچے کو حرکت کرے گا یا لائبریری کے شیلف میں ایک دوسرے کے سہارے رکھی ہوئی کتابوں کی قطار۔ آپ آخری کتاب اٹھالیں تو اس کے ساتھ کتابوں کی پوری قطار نیچے حرکت کرے گی۔

☆☆☆

بورن اپنے دفتر میں داخل ہوا تو اس کی سیکریٹری مس النگ نے اس کے سامنے ان لوگوں کی

فہرست رکھ دی جنہوں نے شیئرز کی خرید کے لیے درخواست کی تھی، مگر بورن نے فہرست کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور مس النگ کو لورنگ کا نمبر ملانے کے لیے کہا۔

لورنگ کے فون کی گھنٹی بہت دیر تک بجتی رہی۔ بورن ریسیور تھامے غصے سے کھولتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ لورنگ کی لیبارٹری بہت وسیع و عریض ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب لورنگ کام میں مصروف ہوتا ہے تو پھر اسے اردگرد کا کچھ ہوش نہیں رہتا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا، مگر آج بورن کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ وہ جلد سے جلد معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کا کام کہاں تک مکمل ہوا ہے۔

''ہیلو۔ کون ہے؟'' بہت دیر کے بعد ریسیور سے لورنگ کی مری مری سی آواز سنائی دی۔

''میں بورن بول رہا ہوں۔'' اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کام مکمل ہوا یا نہیں۔''

کافی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر لورنگ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آج رات بھر نہیں سویا، مگر میری محنت اکارت نہیں گئی۔ میرا خیال ہے مجھے کچھ کامیابی ہوئی ہے۔''

''کچھ کامیابی۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''میں نے ایک ٹائم پیس ایک بلی اور ایک سفید چوہیا کو ٹائم مشین کے ذریعے مستقبل میں بھیجا تھا۔ وہ تینوں دو گھنٹے کے بعد صحیح سلامت واپس پہنچ گئے۔''

''کیا واقعی۔'' بورن نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ مستقبل میں کتنی دور تک گئے تھے۔ میرا مطلب ہے کتنے سال آگے۔''

''بالکل صحیح مدت تو میں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ تم جانتے ہو۔ بے چاری بلی اور چوہیا کچھ بتا نہیں سکیں۔ مگر میرا اندازہ ہے کہ وہ مستقبل میں دو سال آگے گئی تھیں یعنی ۲۰۱۶ء میں۔''

''اچھا تم وہیں ٹھہرو۔'' بورن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے بورن نے فوراً اپنا ہیٹ اٹھایا اور بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہال میں وہ تقریباً بھاگتے ہوئے نکلا۔ لوگوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ان لوگوں نے چند ناقابل اشاعت کلمات بھی اس کی شان میں کہے جن سے وہ ٹکرایا تھا، مگر بورن کے پاس جوابی کلمات کہنے کا وقت نہیں تھا۔

''کہیں لورنگ نے صرف مجھے تسلی دینے کو تو نہیں کہا۔'' بورن نے رستے میں سوچا۔ ''مگر نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ ''لورنگ ایسا آدمی نہیں ہے۔'' وہ ایک سیدھا سادہ محنتی اور ذہین شخص تھا۔ وہ پچھلے چھ مہینوں سے اس مشین پر کام کر رہا تھا۔ اور اب وہ مکمل ہو چکی تھی۔

چھ مہینے پہلے جب لورنگ نے پہلی بار اسے اپنی ٹائم مشین ''سائی فیوچر'' کے منصوبے کے بارے میں بتایا تھا تو بورن نے اس کی صداقت پر شک کیا تھا، مگر جب لورنگ نے اس کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تو وہ کسی حد تک قائل ہو گیا اور پھر یہ سوچتے ہوئے وہ اس منصوبے کے لیے رقم دینے پر تیار ہو گیا کہ اگر یہ مشین بن گئی تو وہ اپنے کاروبار میں اس کی مدد سے لامحدود کامیابیاں حاصل کر سکے گا۔ بورن نے نہ صرف خود ڈھائی لاکھ ڈالر دیے تھے بلکہ اس کے کہنے پر دو ایک بینکروں نے بھی لورنگ کو قرضہ فراہم کیا تھا۔ شروع شروع میں لورنگ کو چند ناکامیاں ہوئیں تو بورن کو اپنے ڈھائی لاکھ ڈالر کی رقم کا افسوس ہوا تھا۔ مگر آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ڈھائی لاکھ ڈالر کی رقم تو بہت معمولی ہے دو سال آگے کے حالات جاننا اس کے لیے کروڑوں ڈالر کے منافع کا باعث ہوگا۔ یعنی اسے اپنے سرمائے پر کم از کم دس ہزار فیصد منافع ہوگا۔ اگر وہ صرف یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ مارکیٹ کا موجودہ تیزی کا رجحان کب تک ہوگا تو وہ دس بارہ کروڑ آسانی سے کما لے گا۔ اگر اسے وہ تاریخ معلوم ہو جائے جب مارکیٹ گرنا شروع ہوگی تو وہ اس سے پہلے اپنے سب شیئرز فروخت کر کے تمام خطرات

سے محفوظ ہو جائے گا اور اسے عمر بھر کبھی گھاٹے کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ''ویسٹ والا'' پہنچ گیا جہاں لورنگ کی لیبارٹری تھی۔

☆☆☆

لورنگ حسب توقع کام میں مصروف تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور شیو بڑھا ہوا۔ بورن کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔

''آیئے مسٹر بورن! کیسے مزاج ہیں؟''

''مزاج کو چھوڑو۔'' بورن نے بے چینی سے کہا۔ ''مجھے فوراً سائی فیوچر دکھاؤ۔''

لورنگ نے بورن کا بازو تھاما اور دونوں بغلی دروازے میں داخل ہو گئے۔

مشین ابھی تک اسی حالت میں تھی جس میں وہ اسے پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہی بے ڈھب سا جنریٹر۔ وہی ایکولائزر اور ایک کیبن کا ڈھانچا سا جیسا کہ تیسرے درجے کی پراسرار فلموں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کیبن کے باہر تیس فٹ لمبی ویکیوم ٹیوبیں تھیں اور الجھے ہوئے ریزیسٹر۔ ہاں ایک چیز کا اس میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ٹیلیفون کے کریڈل جیسا ایک ڈبا کیبن کی اندرونی دیوار کے ساتھ نصب تھا۔ اس کی تانبے کی چھت سے بہت سی تاریں منسلک تھیں جن کے دوسرے سرے مشین کے برابر رکھے ایک بڑے سے کمپیوٹر میں نصب تھے۔

''یہ ہے جناب سائی فیوچر۔'' لورنگ نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھیے میں نے کباڑ کے سامان کو کس عمدگی سے جوڑا ہے۔ میرا خیال ہے میں ابھی ایک چوہیا کو مستقبل میں بھیج کر دکھاتا ہوں، مگر اس کی واپسی کے لیے آپ کو دو گھنٹے تک انتظار۔''

''نہیں۔'' بورن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میرا ارادہ ہے کہ میں یہ تجربہ خود پر کروں۔ آخر اسی کی تکمیل میں میرے بھی ڈھائی لاکھ ڈالر صرف ہوئے ہیں۔'' پھر چند لمحے تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''اس بات کی تو تم گارنٹی دیتے ہو نا کہ ایسا کرنے میں میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

''دیکھیے مسٹر بورن!'' لورنگ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں کسی بات کی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ یہ بھی میرا اندازہ ہے کہ یہ مشین آپ کو مستقبل میں دو سال آگے لے جائے گی اور یہ کہ اگر ٹھیک دو گھنٹے کے اندر اندر آپ واپس اس مشین میں پہنچ گئے تو یہ آپ کو پھر اس زمانے میں لے آئے گی۔ لیکن میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اگر مستقبل میں نہ پہنچ سکے تو ہو سکتا ہے آپ کبھی اس زمانے میں نہ آ سکیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو گھنٹے کی مدت ختم ہوتے ہی آپ فوراً ہلاک ہو جائیں۔''

بورن نے ایک بار پھر السر کے درد کی اس مانوس تکلیف کو برداشت کیا۔

''کوئی اور اہم بات یا احتیاط بھی ہے جو جاننا ضروری ہو۔'' اس نے کچھ دیر کے بعد پوچھا۔

''نہیں اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر بورن نے اپنی نوٹ بک اٹھائی اور جیب میں رکھ لی۔ پھر قلم نکال کر اس میں روشنائی بھری اور ڈرتے ڈرتے اس کیبن میں داخل ہو گیا۔ کیبن کے شیشے میں سے اس نے دیکھا کہ لورنگ نے باہر سے بڑی احتیاط سے ہاتھ ہلایا۔ بورن نے آہستگی سے مخصوص سوئچ کو دبایا اور دم سادھ لیا۔

مگر یہ کیا۔۔۔ کوئی حرکت نہیں۔ کوئی آواز نہیں۔ کیبن اب بھی وہیں تھا۔ وہی کمرا تھا، جو پہلے سے تاریک تر معلوم ہو رہا تھا۔ شاید کہیں کوئی گڑبڑ تھی۔ بورن نے فوراً دروازے کا ہینڈل گھمایا اور باہر آ گیا۔ لورنگ کمرے میں موجود نہیں تھا اور وہ مشین کے سامنے تنہا کھڑا تھا اس نے حیرت سے دیکھا کہ کمرے کا سامان پہلے سے کچھ مختلف ہے۔ مشین کی بیرونی سطح زنگ آلود تھی اور فضا میں عجیب سی سیلن زدہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ اسی وقت بورن پر انکشاف ہوا کہ مشین نے کام کر دکھایا ہے۔ کمرے کی

کھلی کھڑکیوں میں سے اسے عمارتوں کے لمبے سائے نظر آرہے تھے اور فضا میں سہ پہر کی مخصوص کیفیت موجزن تھی۔ اس نے اپنی گھڑی پر نظر کی تو اس میں نو بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔ یہ دیکھتے ہی وہ فوراً باہر کو لپکا۔ اس کے پاس صرف دو گھنٹے کا وقت تھا اور گیارہ بج کر پچپن منٹ تک اسے واپس پہنچنا تھا۔ کمرے سے نکل کر وہ ہال میں آیا تو وہ بھی خالی تھے۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے کاٹھ کباڑ پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے سیڑھیاں عبور کیں اور اگلے لمحے وہ عمارت سے باہر تھا۔ دروازے پر ''ویسٹ ولا'' کے وہی الفاظ موجود تھے اور باہر سڑک پر اسی طرح ٹریفک رواں دواں تھا۔ کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آرہی تھی، مگر پھر بھی ہر چیز اجنبی سی لگ رہی تھی۔ سب چہرے غیر مانوس سے تھے۔ بورن کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ مستقبل میں پہنچ چکا ہے۔ اسی وقت ایک بچہ اس کے قریب سے گزرا تو اس نے سوچا کہ اسے روک کر پوچھوں یہ کون سا سال ہے، مگر پھر اسے یہ سوال احمقانہ سا لگا۔ اسے یاد آیا کہ اس بلاک سے آگے ایک نیوز اسٹینڈ تھا۔ وہ فوراً بھاگتا ہوا وہاں تک گیا۔ نیوز اسٹینڈ موجود تھا۔ اس نے ایک ''ڈیلی پوسٹ'' خریدا جس کی قیمت اسے پانچ سینٹ زیادہ ادا کرنا پڑی، مگر اسے اس کی فکر نہیں تھی۔ اخبار پر گیارہ ستمبر ۲۰۱۶ء کی تاریخ درج تھی اور یہ یقین دلانے کو کافی تھی کہ لورنگ کی مشین نے بالکل صحیح کام کیا ہے۔

بورن نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار کا تجارتی صفحہ کھولا جس کے ایک مخصوص گوشے میں سینٹرل مائننگ اور یونائیورنیم کے تازہ ترین نرخ درج تھے۔ سینٹرل مائننگ ۲۷ یونائیورنیم ۱۹۔

یقیناً وہ مندی کا ریلا آکر گزر چکا تھا، مگر کب۔۔۔ کب۔ اس سوال کا جواب کیسے ملے گا۔

بورن نے ایک بار پھر خوف زدہ ہوتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو بج کر انسٹھ منٹ۔ اس کے پاس صرف ۱۱۶ منٹ تھے۔ یہ سوچتے ہی خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنائی اور وہ بے ارادہ ایک طرف کو تیزی سے چل پڑا۔ یہ کہاں سے معلوم ہو کہ وہ گھاٹے کا رجحان کب شروع ہوا تھا جسے جاننے کے لیے اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی تھی۔

اسی وقت ایک ٹیکسی قریب سے گزری، تو اس نے چلاتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ''پبلک لائبریری۔۔۔ لیکن بہت جلدی۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے بورن نے دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی آگے کی طرف رینگی اور بورن اخبار کھول کر خبریں پڑھنے لگا۔ ''پچیس ہزار بے روزگاروں کا مظاہرہ، سنہری بالوں والی دوشیزہ ٹب میں مردہ پائی گئی۔ نوجوان بوائے فرینڈ کی تلاش۔'' کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اس دوشیزہ کا جائزہ لینے لگا جس کی تصویر اخبار کے بائیں کونے میں تھی اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ کار حرکت نہیں کر رہی۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا تو اس کے آگے گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ شاید کسی وجہ سے ٹریفک جام ہو چکا تھا۔

''ڈرائیور۔۔۔!'' بورن نے کچھ کہنا چاہا، مگر پھر رک گیا۔

ڈرائیور نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بے زاری سے بولا۔ ''ٹریفک جام ہے جناب! آپ شاید ادھر پہلی بار آئے ہیں۔ یہاں تو دن بھر یہی عالم رہتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب دفتروں کا وقت ختم ہو جائے گا تو پھر ذرا سڑکیں صاف ہوں گی۔''

ٹریفک چند منٹ کے بعد ذرا سا چلا، مگر پھر رک گیا۔ بورن نے ایک بار پھر سر باہر نکال کر دیکھا۔ ٹریفک کا اگلا سرا نظر نہیں آرہا تھا۔ حد نظر تک گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج کر سولہ منٹ کچھ سوچ کر اس نے جیب سے ایک نوٹ نکالا اور ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ کر باہر آگیا۔ پبلک لائبریری بہت دور نہیں تھی۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا جا رہا تھا، مگر پھر بھی جب وہ لائبریری پہنچا تو

دس بج کر چھیالیس منٹ ہو چکے تھے، لیکن یہ وقت اس کی گھڑی کا تھا، جس میں ۱۶ اپریل کی تاریخ درج تھی۔ ورنہ وہاں شام ہو چکی تھی اور لوگ دفتروں سے نکل کر فٹ پاتھوں پر رینگنے لگے تھے۔ چند لڑکیاں اس کے قریب سے گزریں تو اس نے دیکھا کہ فیشن خاصا تبدیل ہو چکا ہے۔ ان کی ہاٹ پینٹیں کچھ اور مختصر ہو چکی تھیں اور انہوں نے سروں پر بڑے بڑے ہیٹ پہن رکھے تھے، مگر اس کے پاس اس باعث تسکین جاں نظارے سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا لائبریری کی عمارت میں داخل ہو گیا اور مختلف راہداریوں اور کمروں سے گزرنے کے بعد جب وہ نیوز سیکشن میں پہنچا تو گیارہ بج کر تین منٹ ہو چکے تھے۔ وہ فوراً کاؤنٹر کی طرف لپکا اور ہانپتے ہوئے کہا۔

''مجھے ٹریڈ جرنل کی ۲۰۱۴ء، ۲۰۱۵ء اور ۲۰۱۶ء کی فائلیں چاہئیں

''دیکھیں جناب! کاؤنٹر گرل نے اس کی طرف دیکھے بغیر اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ ''ہمارے پاس ۱۴ء اور ۱۵ء کا کوئی شمارہ موجود نہیں ہے البتہ ۱۶ء کے اب تک کے تمام پرچے مل جائیں گے اور ۱۴ء اور ۱۵ء کی صرف مائکرو فلم فائل ہی آپ کو مل سکے گی۔

''مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ۲۰۱۴ء میں شیئرز کے کاروبار میں جو زبردست تیزی آئی تھی تو اس کے بعد مندی کا ریلہ کب شروع ہوا تھا؟

''وہ تو جناب ۲۰۱۵ء ہی میں شروع ہوا تھا۔''

''مگر وہ تاریخ کون سی تھی یا مہینہ کون سا تھا۔''

بورن نے بے چینی سے پوچھا۔

''مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید مارچ یا اگست کا مہینہ تھا۔ یا غالباً اپریل تھا۔

''آپ مجھے ۲۰۱۵ء کا پورا فائل ہی دے دیں۔'' یہ کہتے ہوئے بورن نے سوچا یہ تو اسی کا سال ہے۔ کاش یہ ریلہ ایک دو مہینے کے وقفے کے بعد شروع ہوا ہو۔ یا کم از کم ایک ہفتہ ہی اسے مل جائے۔

''اس پر دستخط کر دیجیے۔'' لڑکی نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''دائیں جانب وہ ریڈنگ مشین رکھی ہے۔ آپ وہاں جا کر بیٹھیں۔ میں ۲۰۱۶ء کی مائکرو فلم رول لے کر آتی ہوں۔''

بورن نے جلدی سے دستخط کیے اور مشین کی طرف چلا گیا۔ اتفاق سے وہاں اس وقت کوئی اور موجود نہیں تھا۔ ورنہ شاید اسے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ۔ اب صرف پچاس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ لڑکی نہایت اطمینان سے ایک الماری کھول کر اس میں سے مختلف ٹیپ نکال کر دیکھ رہی تھی اور پسینہ بورن کے ہر مسام سے پھوٹ رہا تھا۔ لڑکی نے الماری بند کی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اب وہ وہاں تنہا بیٹھا تھا۔ خوف زدہ اور منتظر۔ گھڑی کی سوئیاں بے حد تیز رفتار ہو گئی تھیں۔ گیارہ دس۔۔۔ گیارہ پندرہ۔۔۔ گیارہ بیس۔۔۔

اسے اپنے معدے میں السر کی تیز لہر اٹھتی محسوس ہو رہی تھی، مگر اسی وقت وہ لڑکی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ۳۵ ملی میٹر کا ایک ٹیپ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بورن کی طرف دیکھا اور نزدیک آ کر بولی۔ ''مل گیا جناب! اب آپ مائکرو اسکوپ پر آ جائیں۔ میں ٹیپ چڑھاتی ہوں۔''

بورن نے آنکھ مائکرو اسکوپ کے عدسے سے چپکا دی۔ لڑکی نے ٹیپ چڑھا کر بٹن دبایا، مگر وہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ بورن نے سر اٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی پھر اچانک چونکتے ہوئے بولی۔

''کم بخت، اوہ خدایا! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اس کا تو بلب ہی فیوز ہے۔ وہ الیکٹریشن بھی نہیں آیا حالانکہ میں نے صبح ہی فون کیا تھا۔''

یہ سنتے ہی بورن پھر دہشت زدہ سا ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس لڑکی کا منہ نوچ لے۔

''معاف کیجیے آپ کو ذرا سی زحمت ہوگی۔'' لڑکی نے کھسیاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ذرا اس ٹیوب لائٹ کے قریب چلے جائیں۔ میں آپ کو مائکرو اسکوپ لا دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ روشنی کافی ہوگی۔ میں اس زحمت پر معذرت خواہ ہوں، مگر دیکھیے مجبوری ہے۔۔۔''

ناچار بورن نے ٹیپ اٹھایا اور ٹیوب لائٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی گر پڑے گا۔ اس کی ٹانگیں بالکل بے جان سی ہو رہی تھیں۔ گیارہ بج کر ستائیس منٹ ہو چکے تھے اور اب اس کے پاس صرف ۲۸ منٹ باقی تھے۔ لڑکی نے فوراً ہی اسے مائکرو اسکوپ لا کر دے دیا اور پھر ٹیپ اس میں لگا کر واپس کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ بورن نے آنکھ مائکرو اسکوپ کے عدسے سے لگا دی اس کے سامنے ایک مانوس سا صفحہ تھا۔ ٹریڈ جرنل کے بڑے بڑے حروف کے نیچے یکم جنوری ۲۰۱۴ء درج تھا اور اس کے اوپر سرے پر وہی مخصوص اشتہار تھا جو اب تک شائع ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ٹیپ گھمانا شروع کیا۔ جنوری۔ فروری۔ مارچ۔۔۔ بورن تیزی سے ٹیپ گھماتا رہا، حتیٰ کہ وہ اپریل تک آ پہنچا۔ ستمبر ۲۰۱۵ء یہی وہ مہینہ تھا جس میں وہ ۹۱ منٹ پہلے تک موجود تھا۔ اب اس نے ٹیپ کو آہستہ آہستہ گھمانا شروع کیا اور ۱۶ اپریل تک آ کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی شہ سرخی تھی جسے اس نے آج صبح ہی پڑھا تھا۔ ''کیمیکلز کے نرخوں میں مزید اضافہ۔۔۔ فروخت کا نیا ریکارڈ'' اس نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیپ گھمایا اور اب اس کے سامنے ۱۷ اپریل کا صفحہ تھا۔ جسے دیکھتے ہی وہ چونک اٹھا۔ یہی تو اس کی مطلوبہ خبر تھی۔

''شیئرز کے نرخوں میں زبردست کمی۔ گزشتہ پانچ سالوں میں سب سے بڑی مندی۔ تیزی کا تاریخی ریلہ آج ختم ہو گیا۔ بینکوں کی چیک بھنانے سے معذوری۔ پروکروں پر شیئر ہولڈروں کی یلغار'' الفاظ اس کی نظروں کے سامنے ناچنے لگے۔ اس نے ایک بار پھر شہ سرخی کو پڑھا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ بے حد پرسکون تھا۔ یقیناً وہ اس ریلے کے نقصان سے نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ کروڑوں ڈالر کا منافع بھی کما لے گا۔ مسرت اور فتح مندی کی خوش گوار لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھا اور ہال سے باہر آ گیا۔ گیارہ بجکر انتیس منٹ۔ ابھی چھبیس منٹ باقی تھے۔ وہ یقیناً وقت پر مشین تک پہنچ جائے گا اور جب اپنے زمانے میں پہنچے گا تو ابھی لنچ کا وقفہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ شام تک سب انتظام مکمل کر لے۔

اس نے فوراً ایک ٹیکسی رکوائی اور اسے ''ویسٹ ولا'' چلنے کو کہہ کر اس میں بیٹھ گیا۔

جب وہ عمارت میں داخل ہوا تو ابھی گیارہ بجکر ۴۸ منٹ ہوئے تھے۔ اسے کمرے تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ وہ مشین ابھی تک وہاں موجود تھی اور کمرے میں وہی سیلن زدہ فضا تھی۔ اس نے کیبن کا دروازہ کھولتے ہوئے گھڑی کو دیکھا، گیارہ بجکر پچاس منٹ۔ اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور ایک سوئچ کو دبایا مگر خلاف توقع سوئچ بورڈ کی نیلی بتی روشن نہیں ہوئی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا اور باہر جھانکا مگر کمرا اس طرح خالی تھا اور اس میں وہی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ ''گیارہ اپریل ۲۰۱۵ء کی ناگوار بو۔۔۔ کیا مشین خراب ہو گئی ہے۔'' ایک شدید خوف نے اس کے وجود کو گرفت میں لے لیا۔ اس نے پھر کیبن میں داخل ہو کر دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور پھر سوئچ دبایا۔ مگر اب بھی کچھ نہیں ہوا۔ کیبن کے شیشوں سے باہر وہ اس نیم تاریکی کو دیکھ رہا تھا جو غروب ہوتے ہوئے سورج کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بجکر چون منٹ۔ اس نے ایک دوسرے سوئچ کو دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر اسی لمحے نیلی بتی خود بخود روشن ہو گئی اور اس نے دیکھا کہ کمرا ایک دم روشن ہو گیا ہے۔ کیبن کے شیشوں میں سے وہ اس دھوپ کو دیکھ رہا تھا جو اچانک کمرے کے فرش پر نمودار ہو گئی تھی۔ کمرے کے

دوسرے کونے میں لورنگ ایک کرسی پر نیم دراز نظر آرہا تھا اور اس کے قریب میز پر ٹائم پیس پڑا تھا جس میں گیارہ بجکر پچپن منٹ ہوئے تھے۔ ٹھیک دو گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔

بورن نے کیبن کا دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ یہ وہی کمرا تھا اور وہی دن ۱۶ اپریل ۲۰۱۵ء۔ اس نے لورنگ کو آواز دینا چاہی۔ مگر وہ سو رہا تھا۔ گیس کے چولہے پر کافی کی کیتلی رکھی تھی جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ بورن نے آہستگی سے گیس بند کی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ''لورنگ واقعی جینئس ہے۔'' اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

دفتر میں پہنچتے ہی اس نے اپنے فیلڈ اسسٹنٹ کو بلایا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کرونین! میری بات غور سے سنو۔ اسی وقت جا کر میرے تمام شیئرز، تمام بانڈز اور سارا اسٹاک بیچ دو۔ مگر خیال رہے کہ ادائیگی صرف نقد رقم یا مصدقہ چیک کے ذریعے ہونی چاہیے۔''

کرونین نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مارکیٹ میں تیزی کا ریلہ ہے۔ لوگ تو شیئرز خریدنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں اور آپ انہیں فروخت کرنے کا حکم دے۔۔۔''

''وقت ضائع مت کرو۔'' بورن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ اپنے تمام اسٹاف کو اس کام پر لگا دو۔ اور جب تک یہ مکمل نہ ہو جائے باقی سب کام بند کر دو۔

☆☆☆

بورن لنچ کے وقفے میں بھی باہر نہیں گیا۔ کھانا اس نے اپنے کمرے میں ہی کھایا، اور اس دوران بھی ٹیلی فون اس کے ہاتھ میں رہا۔ مس النگ کو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ سوائے فیلڈ اسسٹنٹ کے کسی کو اندر نہ آنے دے اور نہ ہی کسی سے ٹیلی فون ملائے۔

کرونین اسے ہر چند منٹ کے بعد فون پر بتا رہا تھا کہ فلاں فلاں شیئرز فروخت ہو چکے ہیں۔ شام کے قریب کرونین نے بتایا کہ نقد رقم یا مصدقہ چیک حاصل کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ تاہم مارکیٹ بند ہونے تک سارا کام مکمل ہو گیا۔ بورن نے کرونین کو فون پر حکم دیا کہ وہ تمام نقد رقم اور چیک لے کر فوراً اس کے پاس آ جائے۔

مصدقہ چیک نیویارک کے درجن بھر مختلف بینکوں کے تھے۔ بورن نے اپنے بارہ مستعد کارکنوں کو چیک دیے اور ان سے کہا کہ وہ فوراً ان بینکوں میں جا کر چیک کیش کرائیں اور یہ نقد رقم مختلف بینکوں کے سیف ڈپازٹ لاکرز میں محفوظ کر دیں۔

پھر اس نے بینکوں کو فون کر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ بورن بہت بڑا بزنس مین تھا۔ اس لیے تقریباً ہر بینک کا وائس پریذیڈنٹ اسے جانتا تھا انہوں نے بورن کو یقین دلایا کہ انتظامات قطعی تسلی بخش ہیں اس کی رقم محفوظ رہے گی۔ اور وہ جب چاہے اپنے لاکرز سے نکال سکتا ہے۔

☆☆☆

بورن نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ آج وہ ایک کامیاب شخص تھا۔ مطمئن اور فتح مند۔ اب مارکیٹ میں کوئی بھی قیامت ٹوٹے اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے سامنے کی دیوار میں لگے کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھا۔ جس پر ابھی تک آج کے آخری بھاؤ کے ہندسے جگمگا رہے تھے۔ اسے آج دن بھر اس کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ نیویارک کے بھاؤ آج معمولی کمی کے ساتھ بند ہوئے تھے۔ اسی طرح شکاگو اور سان فرانسسکو کے نرخوں میں بھی غیر متوقع تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ ٹوکیو، لندن، پیرس اور ایشیا کے نرخ اسی طرح تھے۔ مگر بورن جانتا تھا کہ کل کی صبح ان کے گوشواروں میں بھی انقلاب لے آئے گی۔

بورن نے بیوی کو فون کر کے بتایا کہ وہ آج

رات گھر نہیں آسکے گا۔ پھر وہ اطمینان سے ٹہلتا ہوا دفتر سے نکلا اور مارکیٹ کے ریستوران میں داخل ہوگیا۔ کھانا کھا کر واپس آتے ہوئے وہ مارکیٹ ہال کے اس گوشے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ٹوکیو کی مارکیٹ کے نرخ موجود رہتے ہیں۔ وہاں جا کر اس نے تازہ ترین گوشوارہ دیکھا تو اسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آخر کار ٹوکیو کے بھاؤ بھی گرنا شروع ہوچکے ہیں۔ اس نے چند گھنٹے پہلے مستقبل کی لائبریری میں جو کچھ دیکھا تھا وہ حقیقت تھا۔

کچھ دیر اپنے دفتر میں بیٹھنے کے بعد وہ شب بسری کے لیے اپنے کلب کی طرف چلا گیا۔ جہاں وہ پچھلے کئی روز سے جانے کا سوچ رہا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے نہیں جاسکا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ بہت جلد جاگا۔ اس نے جلدی سے ناشتا کیا اور کلب سے باہر آگیا۔ باہر کی فضا بہت سرد تھی۔ اس نے فٹ پاتھ پر رک کر اپنی جیب سے دستانے نکالے اور پہننے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے گزشتہ دن کے سارے واقعات ایک خواب تھے۔ پھر اس نے سوچا اگر آج پھر دام چڑھ گئے تو کیا ہوگا۔ مگر اسی وقت ایک ہاکر اس کے قریب سے اخبار لہراتا ہوا گزرا۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

''شیئرز کے نرخوں میں زبردست کمی۔ گزشتہ پانچ سالوں کی سب سے بڑی مندی۔۔۔''

بورن زیرِ لب مسکرایا اور مارکیٹ کی طرف چل دیا۔ وہاں بروکروں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ ان کے چہرے فق تھے اور وہ سب زور زور سے چلا رہے تھے۔ بورن نے دیکھا کہ چند ایک نے نائٹ گون پہن رکھے ہیں، ان کے پاؤں میں سلیپر تھے اور غالباً انہوں نے صبح اٹھ کر منہ بھی نہیں دھویا تھا۔

''مسٹر بورن! یہ سب کیونکر ہوا۔'' لفٹ میں ایک بروکر نے اس سے پوچھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر اچانک اور اتنی تیزی سے بھاؤ کیسے گر گئے؟''

''حیرت تو مجھے بھی ہے۔'' بورن نے اطمینان سے کہا۔ ''مگر شکر ہے میں محفوظ ہوں۔''

''ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے کہ تم اس کے نقصان سے بچ گئے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے بروکر نے ایسی نظروں سے بورن کی طرف دیکھا جن میں نفرت اور حسد کے سوا کچھ نہ تھا۔

مارکیٹ ہال میں لگی اسکرین تباہی کی داستان سنا رہے تھے۔ پیرس اور لندن کے گوشواروں پر ہر منٹ کے بعد پہلے سے کم تر نرخ جگمگا رہے تھے۔ آج یہاں موجود ہر شخص اپنے شیئرز بیچنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر خریدار کہاں تھے۔

''کیا بات ہے مسٹر ولارڈ! کیا اپنا آفس بیچ رہے ہو۔ بولو کتنے میں سودا کرتے ہو۔'' بورن نے ایک شیئرز ایجنٹ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے پوچھا جو کل تک اس کا سب سے بڑا حریف تھا۔ مگر آج اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بورن کے اس طنز کے جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ شکست خوردہ بے جان مسکراہٹ۔

جب وہ دفتر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کا تمام اسٹاف پہنچ چکا ہے اور موکلوں کی بھیڑ ان کے گرد جمع ہے۔ وہ بڑی مستعدی سے ان کے سب کوائف درج کر رہے تھے۔

نو بجے کاروبار کے آغاز کی گھنٹی بجی اور پھر جیسے جہنم کا دروازہ کھل گیا۔ مارکیٹ میں اس قدر غل غپاڑا مچا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ لوگ سب سے پہلے شیئرز بیچنے کے لیے دھینگا مشتی کر رہے تھے اور کمپیوٹر اسکرین کے ہندسے ہر سیکنڈ کے بعد چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔

بورن یہ سب دیکھ رہا تھا اور مسرت و اطمینان کی لہریں اسے نئی زندگی بخش رہی تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب ایک بہت ممتاز بینکار اس کے دفتر میں آیا اور اس نے بورن سے درخواست کی کہ وہ شیئرز بزنس کو اس تباہی سے بچانے کے لیے کچھ مدد کرے۔ اس کا خیال تھا کہ بورن اگر کم از کم دس کروڑ ڈالر کی رقم مارکیٹ میں شو کر دے تو مارکیٹ سنبھل جائے گی۔ اور اس اقدام

سے اگر مارکیٹ میں تیزی نہ بھی آسکی تو مندی کا یہ تیز رفتار ریلہ ضرور تھم جائے گا۔ مگر بورن جانتا تھا کہ یہ سب بے کار ہے۔ وہ چاہے کتنی بھی رقم شو کر دے اب قیمتوں میں کمی کا یہ رجحان نہیں رک سکتا۔ کوئی کتنی ہی کوشش کرے مگر مندی کا یہ ریلہ تو اب مہینوں بلکہ برسوں چلے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستمبر ۲۰۱۶ء میں بھی یہ نرخ ۱۲۷ اور ۱۹ سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

بینکار آخر نا کام ہو کر چلا گیا۔

''مسٹر لورنگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں جناب!'' فون پر مس النگ کی آواز سنائی دی۔ ''کیا میں انہیں اندر بھیج دوں۔''

''ٹھیک ہے بھیج دو۔''

لورنگ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور ٹریڈ جرنل کا ایک پرچا اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''مجھے فوراً پانچ لاکھ کی رقم چاہیے۔'' اس نے آتے ہی کہا۔

بورن نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اور قدرے تلخ لہجے میں بولا۔ ''رقم۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو لورنگ! تمہیں معلوم نہیں مارکیٹ کا کیا حال ہے۔ پیسہ ناپید ہو چکا ہے ہر طرف شیئرز سرٹیفکیٹس ہیں۔ بولو کس کمپنی کے چاہئیں؟''

''مسٹر بورن۔۔۔!'' لورنگ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے اور مجھے پانچ لاکھ ڈالر ابھی چاہئیں۔''

''لورنگ میں تمہارے ساتھ پہلے ہی بہت تعاون کر چکا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے اب میں یہ سلسلہ جاری نہیں رکھ سکوں گا۔'' بورن کا لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا تھا۔ ''میرے ڈھائی لاکھ ڈالر تم پر واجب الادا ہیں۔ مگر میں ان سے دست بردار ہوتا ہوں اور آج سے میرا تمہارے ساتھ تمہارے منصوبے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔''

''میں تباہ ہو جاؤں گا۔'' لورنگ کا لہجہ یکلخت بہت دھیما ہو گیا۔ ''تم جانتے ہو، میں نے یہ سارا منصوبہ بینک کے قرضے سے بنایا تھا اور آج وہ رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ رقم انہیں ابھی اور اسی وقت چاہیے ورنہ وہ اس مشین کو توڑ دیں گے اور میری لیبارٹری کو نیلام کر دیں گے۔''

''میں کچھ نہیں کر سکتا مسٹر لورنگ! آج ہر شخص کو روپے کی ضرورت ہے۔ بینکوں نے چیک بھنانے سے معذوری ظاہر کر دی ہے اور کرنسی کا بحران آچکا ہے۔ میں تمہیں کہاں سے رقم دوں؟''

''مگر مسٹر بورن۔۔۔! انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر دو گھنٹے کے اندر میں نے رقم کا بندوبست نہ کیا تو وہ ٹرک لے کر آئیں گے اور میرا سارا سامان اٹھا لے جائیں گے۔ میرے پاس کچھ کمپنیوں کے شیئرز تھے۔ وہ میں نے انہیں پیش کیے مگر شیئر کی آج کیا وقعت ہے۔ کاغذ کے بے مایہ پرزے۔ مسٹر بورن! تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔'' لورنگ نے التجا کی۔

''میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آخر اس میں میرا کیا دوش ہے۔''

بے چارا آدمی

بیمار آدمی سے بیوی بولی: ''اس بار آپ جانوروں کے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

شوہر بولا: ''وہ کیوں؟''

بیوی: ''روز صبح مرغے کی طرح جلدی اٹھ جاتے ہو۔ گھوڑے کی طرح بھاگ کے آفس چلے جاتے ہو، گدھے کی طرح دن بھر کام کرتے ہو۔ لومڑی کی طرح ادھر اُدھر سے معلومات بٹور کر رپورٹ بناتے ہو۔ بندر کی طرح باس کے اشارے پہ ناچتے ہو۔ گھر آکر اپنی فیملی پر کتے کی طرح چلاتے ہو اور پھر بھینسے کی طرح سو جاتے ہو، انسانوں کا ڈاکٹر تمہیں کیا خاک ٹھیک کرے گا۔''

رشتہ

استاد: ''بتاؤ زمین اور چاند کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟''

شاگرد: ''بہن بھائی کا۔''

استاد: ''وہ کیسے؟''

شاگرد: ''کیوں کہ لوگ چاند کو ماموں اور زمین کو ماں کہتے ہیں۔''

''تمہارا کوئی دوش نہیں۔'' لورنگ نے اچانک ہنستے ہوئے کہا۔ ''مسٹر بورن، یہ سب کیا دھرا ہی تمہارا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ٹریڈ جرنل کا پرچا بورن کی میز پر پھیلا دیا۔ ''اسے غور سے پڑھو۔''

بورن نے شہ سرخی پر نظر ڈالی۔

''شیئرز کے نرخوں میں زبردست کمی۔ گزشتہ پانچ سالوں میں سب سے بڑی مندی۔ تیزی کا تاریخی ریلہ آج ختم ہوگیا۔ بینکوں نے چیک بھنانے سے معذوری ظاہر کردی۔ دلالوں پر شیئرز ہولڈروں کی یلغار۔''

یہ وہی سرخی تھی جو کل دوپہر اس نے مستقبل کی لائبریری میں مائیکرو اسکوپ کے ذریعے دیکھی تھی۔ مگر کل کی طرح آج اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے شہ سرخی کے نیچے پڑھنا شروع کیا۔

''سب سے پہلے سینٹرل مائننگ اور یونا یورینیم کے نرخوں میں کمی ہوئی اور اس کے بعد دنیا بھر میں شیئرز کے دام گرنا شروع ہوگئے۔ بازار سے کرنسی نوٹ غائب ہوگئے۔ مندی کا یہ ریلہ کل شام سے شروع ہوا اور تجارتی حلقوں نے بتایا ہے کہ اس ریلے کے آغاز کی اصل وجہ ڈبلو۔ جے بورن ایسوسی ایٹس کا غیر متوقع اقدام ہے۔ بورن ایسوسی ایٹس نے کل دوپہر کے بعد اچانک اپنے کروڑوں ڈالرز کے شیئرز مارکیٹ میں فروخت کردیے اور یوں اس غبارے میں پہلی پن چبھو دی جو روز بروز پھولتا جارہا تھا۔ بازار میں اچانک اتنی بڑی تعداد میں شیئرز آجانے کی وجہ سے قیمتیں ایک دم گر گئیں اور اس کے ساتھ ہی دنیا بھر میں شیئرز کی فروخت کا ایک ایسا مقابلہ شروع ہوگیا جس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے۔ دنیا بھر کے تجارتی ماہرین بورن ایسوسی ایٹس کے اس غیر متوقع اقدام پر حیرت کا اظہار کررہے ہیں اور اس مندی کا ذمہ دار بورن ایسوسی ایٹس کو قرار دے رہے ہیں۔ ان تمام ماہرین کا متفقہ خیال یہ ہے کہ اگر بورن ایسوسی ایٹس یہ احمقانہ قدم نہ اٹھاتی تو یہ تیزی ابھی مزید کئی مہینوں تک جاری رہ سکتی تھی۔ ملک کے مشہور ماہر تجارت مسٹر جانسن نے ہمارے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ بورن ایسوسی ایٹس نے نہ صرف دنیا کے بے شمار تاجروں کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے، بلکہ خود اپنے منافع میں بھی بے پناہ کمی کرلی ہے۔ مسٹر جانسن نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ مسٹر بورن اگر اپنے شیئرز چند ہفتوں کے بعد فروخت کرتے تو بلاشبہ کروڑوں ڈالر مزید کما سکتے تھے۔ لیکن گزشتہ شام انہوں نے جو ڈرامائی حرکت کی، اس نے دنیا بھر میں ہلچل مچادی۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے تاجروں نے بینکوں پر یلغار کردی۔ جس کے نتیجے میں۔۔۔''

''کیا اب بھی تم یہ کہتے ہو کہ تمہارا کوئی دوش نہیں۔'' لورنگ نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ مگر بورن یہ سوچ رہا تھا کہ کاش کل لائبریری میں وہ ایک منٹ اور ٹھہر جاتا۔ کاش اس نے پوری خبر پڑھ لی ہوتی اگر اس نے ایسا کرلیا ہوتا تو اسے کل اپنے شیئرز فروخت نہ کرنا پڑتے اور چند ہفتے کے بعد ان شیئرز کی قیمت میں کروڑوں کا مزید اضافہ ہوچکا ہوتا۔

مگر بورن اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ کیونکہ لورنگ کے ہاتھ اس کی پتلی گردن کو گرفت میں لے چکے تھے۔ ''تم ہی میری تباہی کے ذمہ دار ہو، اور تمہاری وجہ سے ہی اتنے لوگوں کو پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے۔'' لورنگ چلا رہا تھا۔

بورن کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے چیخنا چاہا، مگر آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر میز پر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ اگلے لمحے مس النگ کمرے میں داخل ہوئی، مگر یہ منظر دیکھ کر چلاتے ہوئے پھر باہر نکل گئی۔

کچھ دیر کے بعد بورن کے بے شمار ملازم بھاگتے ہوئے اندر آئے۔ ان کے پیچھے موکلوں کا ہجوم تھا۔ مگر چند لمحوں کی تاخیر ہوچکی تھی۔

اور یہی لمحے قاتل تھے۔

داستان حوصلے کی

عنبرین ناز

وہ بھی دشت حالات میں کھلے
آسماں تلے آگئی تھی اور اس نے
آندھیوں میں بھی سفر کرکے دکھا
دیا کہ ہمت مرداں تو مدد خدا۔

ایک باحوصلہ عورت کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی معاشرتی کہانی

میرے گھر میں کل تین افراد تھے، ابا، اماں اور میں۔ ہمارا گھر اونچی سی ایک پہاڑی پر تھا۔ میں چونکہ اکلوتی تھی اس لیے لاڈلی بھی بہت تھی۔ گھر میں غربت تو تھی مگر ابا اور اماں کی محبت نے یہ کمی پوری کردی تھی۔ ہر طرف خوشیاں تھیں، سکون تھا۔ ان دنوں ابا تو کچھ زیادہ ہی خوش تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے۔ ''اب تو اکیلی نہیں رہے گی۔ ہمارے گھر میں ایک ننھا مہمان آنے والا ہے۔''

پھر اچانک گھر میں گویا زلزلہ آ گیا۔ سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ آیا تو کوئی نہیں، ماں چلی گئی، ہمیشہ کے لیے۔

عزیز رشتے دار کچھ دن رسم دنیا نبھانے کو رہے، پھر ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ اب سارے گھر میں یا تو ابا ہوتے یا میں یا پھر ہمارے مویشی اور اماں کی پالی ہوئی ڈھیر ساری مرغیاں۔ میری عمر آٹھ دس سال تھی۔ کام مجھے کوئی آتا نہیں

تھا۔ ابا ہی سارے کام کرتے تھے، مجھے جانور چرانے بھیج دیتے یا مرغیوں کی رکھوالی کرنا اور انہیں بند کرنا میرا کام رہ گیا تھا۔

اماں کی زندگی میں بھی ابا انڈے لے کر نیچے بستی میں بیچنے جاتے تھے۔ اب بھی وہ یہی کام کرتے تھے۔ وقت تو جیسے تیسے گزر رہا تھا مگر گھر بہت ویران سا لگنے لگا تھا۔ میں جانور چراتے ہوئے، کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر ماں کو یاد کر کے خوب روتی۔ میرا دل چاہتا انہیں سے ماں کو ڈھونڈ کر لے آؤں۔

کئی سال تک زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ میں ان دنوں تیرہ چودہ سال کی تھی۔ جب ابا مجھے لے کر رشتے داروں کے گھر شادی میں گئے۔ ان کا گاؤں کچھ میل دور تھا۔ وہاں قریب کے کسی گاؤں کی کوئی لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کچھ دن بعد وہ مرد اس لڑکی کو چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ لڑکی کسی نہ کسی طرح گاؤں واپس آ گئی۔ گھر والوں نے اسے مارا پیٹا اور گھر میں بند کر دیا، ایک تو وہ تماشا بن گئی، پھر گاؤں کے لوگ انہیں طعنے دینے لگے کہ کیسے بے غیرت لوگ ہیں۔ لڑکی منہ کالا کر آئی ہے اور یہ اسے قتل کرنے کے بجائے گھر میں لیے بیٹھے ہیں۔ انہیں غیرت سے کیا مطلب۔

ابا کے رشتے دار زور دیتے رہتے تھے کہ دوسری شادی کراؤ۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر زور دیا۔ وہ اصل میں ابا کی شادی اس لڑکی سے کروانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ابا کو پوری بات نہیں بتائی، صرف اتنا کہا کہ لڑکی کا باپ بہت مجبور ہے، چپ چاپ نکاح کر کے بیٹی کو رخصت کر دے گا۔ تم بس ہاں کر دو۔

ابا کے بہن بھائی بھی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی رشتے داروں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ دراصل وہ سب جان چھڑانا چاہتے تھے۔ لوگ انہیں طعنے دیتے تھے کہ کیسے بہن بھائی ہیں، بھائی کا گھر اجڑا مگر یہ لوگ پوچھتے بھی نہیں۔ وہ بے چارہ گھر اور باہر کے سب کام خود ہی کرتا ہے۔ ابا کو صرف یہ بتایا گیا کہ لڑکی عمر میں تم سے کافی چھوٹی ہے۔ مفت میں شادی ہو رہی ہے، ظاہر ہے بری وغیرہ تو بنانی نہیں ہے۔ ویسے کا بھی کوئی چکر نہیں ہے۔ ایسا موقع پھر کب ملے گا۔

ان کے اصرار پر آخر ابا راضی ہو گیا۔ وہیں نکاح ہوا۔ واپسی پر ہمارے ساتھ نئی اماں بھی تھیں۔ گھر آ کر میں نے اسے غور سے دیکھا، خاصی بد صورت سی تھی، میری ماں تو خوب صورت تھی۔ میں بھی شکل و صورت میں ماں پر گئی تھی۔ نئی ماں اپنا موازنہ مجھ سے کرتی تو مارے حسد کے سلگنے لگتی۔ ابا کہتے کہ اسے ماں کہا کر۔ میں اسے ماں کہتی تو وہ طوفان آتا کہ تھمنا مشکل ہو جاتا۔ نئی ماں کا نام رشیدہ تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصی بڑی تھی مگر دیدہ دلیری سے خود کو میری ہم عمر کہا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ میرا نام لیا کرو۔ میں اس کا نام لیتی تو پاس پڑوس کی عورتیں بھی مجھ ہی کو برا بھلا کہتیں۔ ابا کے سوا میرا تو کوئی پرسان حال بھی نہیں تھا۔ ایک خالہ رشیدہ گاؤں میں بیاہی تھی، دوسری کی شادی شہر میں ہوئی تھی مگر وہ دونوں تو خود دبوسی تھیں۔ ایک ماموں بھی تھا۔ وہ بیوی سے اتنا ڈرتا تھا کہ بہنوں کا نام تک نہیں لیتا تھا، ہاں وہ شہر والی خالہ کے پاس کبھی کبھار چکر لگا لیا کرتا تھا۔ شہر والے خالو کسی ایسے سرکاری محکمے میں تھے جہاں رشوت کا بازار گرم تھا۔ رشوت کی کمائی سے انہوں نے انتہائی شان دار گھر بنا لیا تھا۔ گاڑی بھی تھی، آج کل انہی لوگوں کی تو قدر ہے جن کے پاس پیسا ہو۔ خواہ وہ پیسا کسی بھی ذریعے سے آیا ہو۔

میرے لیے ان خالاؤں اور ماموں کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ بہر حال مجھے رشیدہ کے ساتھ گزارہ کرنا تھا۔ چند ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ رشیدہ کو اس شخص کی بے وفائی کا دکھ ہے جو اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، جن حالات میں اس کی شادی ابا سے ہوئی، اسے اس کا بھی دکھ تھا، پھر یہ کہ ابا اسے پسند نہیں آئے تھے۔ اسے تو ہمارا گھر بھی پسند نہیں آیا تھا۔ شاید اسے اور بھی کسی بات پر صدمہ ہو مگر وہ سب کا غصہ مجھ پر اتارتی تھی۔ یونہی مزید چار برس بیت گئے۔

پھر نہ جانے کیسے اچانک رشیدہ مجھ پر مہربان ہوگئی۔ اس وقت تک اس کے تین بچے ہو چکے تھے، مجھے اس کے بچے بھی سنبھالنا پڑتے تھے۔

ایک دن میں بچوں کو سلا کر فارغ ہوئی تھی کہ رشیدہ میرے پاس آئی اور ملائمت سے بولی۔ ''رضیہ مجھ سے دوستی کرے گی؟''

میں نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا، یہی سمجھی کہ یہ اس کی کوئی نئی چال ہے۔ ''میں۔۔۔ تمہاری۔۔۔ دوست؟''

شروع شروع میں تو مجھے یقین نہ آیا مگر جب وہ واقعی میرے ساتھ سہیلیوں کی طرح پیش آنے لگی تو مجھے یقین کرنا پڑا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روز کی مار پیٹ، گالم گلوچ اور ڈھیر سارے کاموں سے کچھ تو جان چھوٹے گی، اس لیے وہ مجھے خود سے بڑا کہتی تو مان جاتی۔ اس نے جب دوبارہ دوستی کی بات کی تو میں خوشی خوشی مان گئی۔

''اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہماری کسی بات کا تیرے ابا کو پتا نہ چلے، ہم ہر معاملے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔'' رشیدہ نے کہا۔

مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا، میں نے فوراً اس کی یہ شرط مان لی۔

رشیدہ نے کہا۔ ''مجھے اسی گھر میں رہنا ہے چار پیسے ہاتھ میں ہوں تو میں گھر کی حالت سدھاروں۔ ہماری کچھ زمین بے کار پڑی ہے۔ ایسا کرتے ہیں اس پر سبزیاں اگاتے ہیں۔ اس سے کچھ پیسے ہاتھ میں آئیں گے۔''

ہماری چار پانچ کنال زمین تھی۔ رشیدہ نے اس پر کیاریاں بنا کر سبزیاں لگا دیں۔ اس کے پاس کچھ روپے بھی تھے، ان پیسوں سے اس نے کچھ مرغیاں مزید خرید لیں۔ ابا پہلے کی طرح انڈے فروخت کرنے جایا کرتے تھے۔ زمین ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ابا کے جانے کے بعد رشیدہ دن میں کئی بار زمین پر جاتی تھی۔ کبھی پودوں کو پانی دینے، کبھی گوڈی کرنے۔ اکثر وہ گھنے درختوں کی طرف یہ کہہ کر چلی جاتی کہ دل گھبرا رہا ہے۔

ایک دن یونہی رشیدہ سبزیاں دیکھنے گئی ہوئی تھی۔ میں گھر کے کام میں مصروف تھی۔ ہمارے گھر کی چار دیواری نہیں تھی۔ میں کمرے سے باہر آئی تو مجھے ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ مجھے اشارے کر رہا تھا۔ میں ڈر گئی کہ یہ چاہتا کیا ہے۔ میں اتنی وحشت زدہ ہوئی کہ گھر اور بہن بھائیوں کو یونہی چھوڑ کر بھاگی اور رشیدہ کے پاس پہنچی تو وہاں ایک نیا تماشا منتظر تھا۔ وہ کسی مرد کے ساتھ تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔ مرد بھی بوکھلا کر بھاگ گیا۔

رشیدہ نے اپنا لباس درست کیا اور خوشامد بھرے انداز میں بولی۔ ''دیکھ، ابا کو کچھ مت بتانا۔ ہم تو آپس میں دوست ہیں۔ تیرے ابا کو پتا چلے گا تو وہ نہ جانے کیا کرے۔'' وہ یونہی خوشامدیں کرتی ہوئی گھر تک آگئی۔

میں نے اسے تسلی دی کہ گھبراؤ مت، میں ابا کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔

میری تسلی پر اس کے حواس بحال ہوئے تو میرے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے اس آدمی کے بارے میں بتایا جسے دیکھ کر میں بھاگی تھی۔ اس نے مرد کا حلیہ پوچھا، پھر ہنس کر بولی۔ ''میرے پیچھے آیا ہوگا۔ تو نظر آئی تو تجھ پر ڈورے ڈالنے لگا۔''

میں تو خاصی خوف زدہ تھی، مگر رشیدہ نے مجھے اتنی خوب صورتی سے سمجھایا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ اس نے مردوں سے دوستی کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ میں ان غلط باتوں کو درست سمجھنے لگی۔ میرا ڈر خوف نکل گیا۔۔۔ بس ایک جھجک سی رہ گئی۔

اب رشیدہ اپنے کسی دوست سے ملنے جاتی تو مجھے بتا کر جایا کرتی تھی۔ اس دوران میں کوئی آجاتا اور رشیدہ کے بارے میں پوچھتا تو میں بے دھڑک جھوٹ بول دیتی، کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیتی۔ رشیدہ مجھے انہی ملاقاتوں کے قصے نمک مرچ لگا کر سنایا کرتی۔ میں اب بھی پہلے کی طرح گھر کے تمام کام کرتی تھی، سارا دن کام کر کر کے تھکن سے چور

ہو جاتی مگر اتنا ضرور تھا کہ اب رشیدہ مجھ سے لڑتی نہیں تھی۔ نہ خود مجھے مارتی، نہ الٹی سیدھی شکایتیں کرکے ابا سے پٹواتی۔ میں اسی میں خوش تھی۔

رشیدہ کی گندی صحبت میں رہ کر اور اس کی باتیں سن سن کر میرا جی بھی چاہنے لگا کہ میری بھی کسی مرد سے دوستی ہو، کوئی مجھے بھی چاہے مگر رشیدہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ میں اپنے طور پر سوچتی رہتی تھی کہ کس سے دوستی کروں۔ آس پاس کے جن مردوں کو میں جانتی تھی، انہی کے بارے میں سوچتی تھی مگر یہ سوچ ذہن میں ہی رہ جاتی۔ ابھی تک کسی مرد سے میرا واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے مجھ میں ایک جھجک سی تھی۔

ابا تو دن بھر انڈے اور سبزیاں بیچتا تھا۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے، رشیدہ انہیں بھی کھیلنے کے لیے باہر بھیج دیا کرتی تھی۔ گھر میں ہم ہی ہوتے تھے۔ ایک دن رشیدہ کسی مرد سے مل کر آئی تو بولی۔ ''رضیہ آج تو میں پھنستے پھنستے بچی۔''

''کیسے۔۔۔؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہ جو ہماری پڑوسن ہے شیداں، وہ اچانک آ گئی۔ شکر ہے اس کی نظر کمزور ہے ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے مگر کبھی تو بندہ پھنس سکتا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اب میں مردوں سے باہر نہیں ملوں گی۔ اس میں بہت خطرہ ہے۔ گھر میں ہمارے علاوہ ہوتا ہی کون ہے۔ اب میں مردوں کو یہیں بلا لیا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا۔'' اس نے میری حمایت چاہی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر ہمت کرکے بولی۔ ''تو اچھی دوست ہے رشیدہ! خود تو پتا نہیں کس کس سے ملتی ہے۔ میں تیرا ساتھ دوں، تیرے راز چھپاؤں گھر کے کام بھی میں کروں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میری کسی مرد سے دوستی ہو۔ اچھی دوست ہے تو، میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔''

''ہائے۔۔۔! ایسا سوچنا بھی نہیں۔'' رشیدہ نے خوف زدہ ہو کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''تیرے ددھیال اور ننھیال والے ویسے تو تجھے پوچھتے نہیں مگر کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو میں پھنس جاؤں گی۔''

''تجھے تو کبھی کچھ نہیں ہوا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

''تو ابھی لڑکی ہے، دنیا کی اونچ نیچ کا تجھے کچھ پتا نہیں۔ صرف مجھ سے سن سن کر باتیں بنا سکتی ہے، تجھے ان مردوں کی فطرت کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہے۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو دور سے میٹھا سیب نظر آتے ہیں، قریب جاؤ تو پتا چلتا ہے۔''

میری سمجھ میں رشیدہ کی باتیں نہیں آئیں، میں منہ بنا کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس کے بعد بھی کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

کبھی کبھار ہمارے گھر کوئی رشتے دار بھی آ جایا کرتا۔ ایک دن شہر والی خالہ کا منجھلا بیٹا شیراز آ گیا، اس نے بتایا کہ اس کے ابا نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ نویں میں پاس ہی نہیں ہوتا تھا۔

خالہ کا سب سے بڑا بیٹا بھی پانچویں چھٹی سے بھاگ گیا تھا۔ خالو نے گاؤں میں اس کی شادی کرکے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ باقی تین بیٹے اس کے ساتھ شہر میں تھے اور پڑھتے تھے۔ اب خالہ کا ایک بیٹا بھاگ کر ہمارے گھر آ گیا تھا۔

''تو بھائی کے گھر چلا جا۔'' رشیدہ نے تجویز دی۔

''ابا نے اسے منع کر دیا ہے کہ مجھے گھر میں نہ گھسنے دے۔'' شیراز منہ بنا کر بولا۔ ''مامی! اب تو بھی مجھے گھر سے نکال رہی ہے۔''

''نہیں شیراز!'' رشیدہ مسکرائی۔ ''یہ پہلے تیری خالہ کا گھر تھا، رضیہ کا ابا رشتے میں تیری ماں کا بھائی بھی لگتا ہے۔۔۔ تو اب یہ تیرے ماموں کا گھر ہے۔ میں نے تو یونہی کہا ہے۔ تیرا ابا مزاج کا سخت ہے۔ کل کلاں کو ہمیں آ پکڑے تو۔۔۔؟''

''وہ یہاں نہیں آئے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہاں کوئی سہولت نہیں ہے میں بھلا کیسے رہ سکوں گا۔''

پہلے پہل تو رشیدہ نے اس کی خوب آؤ بھگت کی مگر جلد ہی بے زار ہو گئی۔ اس کی آزادی میں جو خلل پڑ رہا تھا۔ اس نے شیراز کو ابا کے ساتھ بستی میں

بھیجنا شروع کردیا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔
''رضیہ! میں چاہتی ہوں تیرے لیے شیراز ٹھیک رہے گا، شہر میں اتنا اچھا گھر ہے۔ عیش کرائے گا تجھے۔ موٹر میں گھومنا اس کے ساتھ۔''
''خالو مان جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔
''کیسے نہیں مانے گا، بس میں شیراز سے تیری بات کروادیتی ہوں۔''
پھر رشیدہ، شیراز کو پتا نہیں کیا پٹیاں پڑھاتی رہی وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ ادھر وہ مجھے سمجھاتی کہ اس سے ایسے باتیں کرو، ایسے باتیں کرو۔ آہستہ آہستہ میری بھی جھجک دور ہوگئی پھر میں اور شیراز تو ایک دوسرے میں گم ہی ہوکر رہ گئے۔ اب تو وہ ابا کے ساتھ بھی نہیں جاتا تھا۔ رشیدہ نے یہ سب کرتو دیا مگر اس کا اپنا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ ہر وقت بے چین، بے چین رہتی تھی۔ شیراز کی وجہ سے وہ کسی کو گھر بھی نہیں بلاسکتی تھی۔ اس نے شیراز کو مشورہ دیا کہ گھر والوں کو لے کر رشتہ مانگنے آؤ۔ دیر مت کرو۔ اس نے کچھ اس طریقے سے یہ بات کی کہ شیراز فوراً شہر چلا گیا۔
اس نے گھر جاکر میرے بارے میں بات کی۔ خالہ تو مان گئیں مگر حکم تو خالو کا چلتا تھا۔ وہ پرلے درجے کے بدمزاج اور لالچی تھے۔ انہوں نے صاف انکار کردیا۔ شیراز ماں کے پیچھے پڑ گیا تو خالہ مجبور ہوگئیں اور بہانے سے گاؤں آگئیں۔ اس نے ابا سے بات کی۔ ابا نیم راضی ہوگئے۔ رشیدہ نے مشورہ دیا کہ راتوں رات ان دونوں کا نکاح کردیتے ہیں کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ وہ بہت چالاک بلکہ مکار عورت تھی۔ اس نے سب کچھ اپنی مرضی سے کروایا۔
اس کی ایک سوتیلی بہن کافی دور ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ رشیدہ ہم سب کو لے کر وہاں چلی گئی اور میرا نکاح شیراز سے کردیا گیا۔ خالہ وہیں سے واپس شہر چلی گئیں۔ شیراز چند دن چھپ کر ہمارے گھر رہا، پھر وہ بھی واپس چلا گیا۔
رشیدہ نے مشہور کردیا کہ اس نے میرا نکاح اپنے کسی رشتے دار سے کرادیا ہے۔ وہ کراچی میں ملازمت کرتا ہے۔
اب شیراز کو مجھ سے ملنا ہوتا تو پیغام بھیج دیتا۔ ہم رشیدہ کی بہن کے گھر دو چار دن رہتے، پھر وہ اپنے گھر چلا جاتا اور میں اپنے گھر آجاتی۔ جب میں آجاتی تو رشیدہ سب کو یہی بتاتی کہ کراچی سے اس کا شوہر آیا ہوا تھا۔ رضیہ اس سے ملنے گئی ہے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیسی شادی ہے، پھر لڑکا یہاں کیوں نہیں آتا۔ رشتے داروں نے خوب خوب باتیں بنائیں۔ آخر سب تھک ہار کر خاموش ہوگئے۔
پھر میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ بیٹے کی پیدائش پر خالہ شہر سے خوب تحفے تحائف لے کر آئیں۔ شیراز بھی ماں کے ساتھ یوں آیا جیسے خالہ زاد کو بچے کی مبارک باد دینے آیا ہو۔ خالہ نے بتایا کہ شیراز سے چھوٹے بیٹے فاروق کی شادی انگلینڈ کی کسی لڑکی سے ہورہی ہے۔ لڑکی کا باپ خالو کا دوست تھا۔ ان کا سارا خاندان انگلینڈ میں تھا، کاروباری لوگ تھے، فاروق بھی شادی کے بعد انگلینڈ جانے والا تھا۔ خالہ چاہتی تھیں کہ میں بھی شادی میں شرکت کروں اس لیے انہوں نے فاروق کی شادی ملتوی کردی تھی۔
''لڑکی اور فاروق ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اسی کی مرضی سے شادی ہورہی ہے۔'' شیراز خالہ کی طرف دیکھ کر مجھ سے بولا۔
''خالہ! فاروق کی مرضی چل گئی، خالو کو مجھ میں کیڑے نظر آئے تھے۔'' مجھے غصہ آگیا۔
''تو خالو کی نظر میں اس جیسی نہیں ہے نا'' خالہ بے بسی سے بولیں۔
میری حالت سنبھلی تو خالہ نے مجھے شادی میں شرکت کے لیے شہر بلالیا۔
شادی میں شیراز آتے جاتے بچہ مجھ سے لے کر اسے پیار کرنے لگتا۔ ایک بار خالو نے دیکھ لیا تو منہ بنا کر بولے۔ ''تو کیا آتے جاتے بھانجے کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ کہا تھا کہ باہر ٹینٹ لگوادے۔''
''بھانجے کو'' میں اور شیراز بے بسی سے ایک

دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

ایک عورت بولی۔ ''لگتا ہے شیراز کو اس بچے سے بہت پیار ہے۔''

''بھانجا ہے تو پیار تو ہوگا۔'' خالو نے کہا۔ ''یہ لڑکی شیراز کی خالہ زاد ہے، گاؤں سے آئی ہے۔''

یہ سن کر شیراز غصے میں مٹھیاں بھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اصولاً تو پہلے شیراز کی شادی کرنا چاہیے تھی۔'' ایک اور عورت بولی۔ ''پرائے بچے اٹھائے پھر رہا ہے۔''

اس بات پر خالو پھٹ پڑے۔ ''زرافے جیسا قد ہے، اس شیراز کا مگر عقل نام کو نہیں ہے۔ نہ تعلیم، نہ نوکری، نہ کوئی اور خوبی۔ اس زرافے کو کون قبول کرے گا۔ یہ کوئی کام دھندا کرے تو شادی کے بارے میں بھی سوچا جائے۔''

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شیراز اکیلے میں ملا تو میں اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گئی اور خالو کی کہی ہوئی بات بتادی۔

''ذرا ذرا سی بات دل پر نہ لیا کرو۔'' شیراز نے کہا۔

''میں تیرا ہوں، فکر مت کر۔ میں کہیں شادی کرنے نہیں جارہا۔''

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو میں بیٹے کو لے کر گاؤں لوٹ آئی۔

شادی میں خالو نے محسوس کرلیا تھا کہ شیراز مجھ پہ کچھ زیادہ ہی ملتفت ہے۔ بچے کو بھی وہ سارا وقت گود میں لیے پھر رہا تھا۔ وہ تجربے کار آدمی تھے۔ انہیں مجھ پہ اور شیراز پہ شبہ ہوگیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ انہوں نے شیراز کے کہیں آنے جانے پر پابندی لگادی۔ رشیدہ مجھے ورغلانے لگی کہ شیراز باپ کے کہنے پر کہیں شادی، منگنی کے چکر میں ہوگا اسی لیے تو آیا نہیں۔ تو اس سے طلاق لے لے۔ میں نے رشیدہ کی ہر بات مانی تھی مگر اس بات پر اسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ اپنے دوستوں کو اب بھی گھر بلاتی تھی۔

ایک دن اتفاق سے میں نے اس کی باتیں سن لیں۔ وہ کمرے میں کسی مرد کے ساتھ تھی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ تو فکر مت کر۔ تیرا کام ہوجائے گا۔ بس میں نے اس کی یہ شادی ہی اس لیے کرائی تھی کہ اسے طلاق ہوجائے اور وہ رلتی پھرے۔ پھر وہ تجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔''

اس کی یہ زہریلی باتیں سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ وہ رشیدہ جس کے کالے کرتوتوں پر میں پردے ڈالتی رہی، اس نے مجھے اس کا یہ صلہ دیا تھا۔

میں ایک بار پھر امید سے تھی۔ انہی دنوں میں ایک بیٹی کی ماں بھی بن گئی۔ خالہ اور شیراز کو اطلاع دی گئی مگر وہاں سے کوئی نہیں آیا۔ میں ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ بچی شدید بیمار ہوگئی۔ رشیدہ نہ جانے اسے کہاں لے گئی۔ واپس لے کر آئی تو بتایا کہ میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا ہے، دوا بھی لے آئی ہوں۔ ٹھیک ہوجائے گی مگر بچی اسی دن مرگئی۔

ایک تو شیراز کی بے رخی، پھر بچی کی موت کا صدمہ۔ میں اس بری طرح بلک بلک کر روئی کہ ابا گھبرا کر اسی دن شیراز کو لینے شہر چلے گئے۔

دوسرے ہی دن شیراز ابا کے ساتھ گاؤں آگیا۔ میں نے اسے رشیدہ کی ساری باتیں بتادیں، شیراز نے کہا۔ ''اب میں تمہیں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ ہم کل ہی شہر جائیں گے۔''

شیراز جوش میں آکر مجھے اور بچے کو شہر لے تو آیا مگر وہاں پہنچ کر اسے ہوش آیا کہ نہ جیب میں پیسے ہیں، نہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا ہے۔ وہ ہمیں کہاں رکھتا۔ وہ کافی دیر لاری اڈے پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر بہت سوچنے کے بعد بولا۔ ''تم یہیں رکو، میں کسی بہانے سے ابا سے پیسے لے کر آتا ہوں۔''

شیراز کے جانے کے بعد مجھے خوف نے گھیر لیا۔ پہلی دفعہ اس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں ایک دکان کے تھڑے

پر بیٹھی تھی۔ آتے جاتے لوگ مجھے گھور رہے تھے۔

خدا خدا کر کے شیراز واپس آیا اور بولا۔ ''ابا سے تو پیسے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی، چوری کر کے لایا ہوں۔ امی سے کہہ آیا ہوں، دوست کی والدہ بیمار ہیں، رات کو وہیں رکوں گا۔''

''تو خالہ ہی کو ساری بات بتا آتے۔'' میں نے کہا،

''وہ اپنے سیدھے پن میں اگل بیٹھیں تو میں پھنس جاؤں گا۔'' شیراز نے کہا۔

رات گئے تک شیراز کرائے کا مکان تلاش کرتا رہا، اسے ایسے مکان کی تلاش تھی جس کا کرایہ نہایت کم ہو۔ خاصی تلاش کے بعد ہمیں چھوٹا سا ایک مکان مل گیا۔ اس میں مختصر سا صرف ایک کمرا اور چھوٹا سا صحن تھا۔ کچن وغیرہ کی سہولت نہیں تھی البتہ گیس پانی اور بجلی موجود تھی۔ اس سے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ پہلی رات ہم گندے فرش پر سوئے۔

صبح صبح شیراز نکل گیا۔ میں نے گھر کی صفائی ستھرائی کی۔ بھوک کے مارے برا حال تھا۔ شیراز صبح کا گیا دوپہر کو لوٹا۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ بھوکی پیاسی تھی، میری بھڑاس نکل چکی تو شیراز کہنے لگا۔ ''غصہ کیوں کرتی ہو۔ میں بارہ سو روپے کی نوکری کرتا ہوں۔ وہ بھی ابا لے لیتے ہیں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ابا گھر سے نکلیں تو میں پیسے چراؤں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ابا نکلے ہیں تو پیسے چرا کر لایا ہوں۔''

''اب تم چوریاں کر کے ہی گزارا کرنا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ایسے کب تک کام چلے گا۔''

''ابھی تو کام چل جائے گا۔'' شیراز نے کہا۔

''اپنے دوست سے دو چارپائیاں مانگ کر لایا ہوں۔ گھر سے بستر چرائے ہیں، دو چادریں لایا ہوں، دو چار برتن، کھانا اور بچے کے لیے دودھ بھی لایا ہوں۔''

''خالہ نے دیکھا تو نہیں؟''

''وہ سوگئی تھیں۔'' اس نے کہا۔

شادی

پہلا دوست: ''یار! میں جس لڑکی کو پیار کرتا تھا اس سے میری شادی نہیں ہوئی۔''

دوسرا دوست: ''تم نے اس کو بتایا تھا کہ تمہارے ابو بہت پیسے والے ہیں؟''

پہلا دوست: ''ہاں یار......''

دوسرا دوست: ''تو پھر؟''

پہلا دوست: ''تو پھر کیا! اس نے میرے ابو سے شادی کر لی۔''

پاگل رشتہ

ڈاکٹر (پاگل سے): ''تم پاگل کیسے ہوئے؟''

پاگل: ''میں نے ایک بیوہ سے شادی کی اس کی جوان بیٹی سے میرے باپ نے شادی کر لی میرا باپ میرا داماد بن گیا یوں میری بیٹی میری ماں بن گئی، اس کے گھر بیٹی ہوئی یوں وہ میری بہن ہوئی مگر میں اس کی نانی کا شوہر تھا اس لیے وہ میری نواسی بھی ہوئی اس طرح میرا بیٹا اپنی دادی کا بھائی بن گیا اور میں اپنے بیٹے کا بھانجا اور پھر۔۔۔۔''

ڈاکٹر: ''اٹھ اور باہر نکل، تو مجھے بھی پاگل کرے گا۔''

میرا گھر

استاد عدیل سے: ''سورج دور ہے یا تمہارا گھر؟''

عدیل: ''میرا گھر۔''

استاد: ''وہ کیسے؟''

عدیل: ''جناب اس لیے کہ میں اپنا گھر یہاں سے نہیں دیکھ سکتا لیکن سورج کو بڑی آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔''

وہ اپنی چوری کا حال سنا رہا تھا اور مجھے غصہ آ رہا تھا۔

پھر اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ شیراز کبھی آتا تھا، کبھی موقع نہ ملتا تو نہ آتا۔ اس کی چوریوں سے گزارا ممکن نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر ماں بننے والی تھی۔ پڑوس کی ایک عورت سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ وہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ شوہر کی ملازمت نہیں ہے۔ میں بھی کام کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی کام مجھے بھی لا دو۔ اس نے مجھے لحافوں میں ڈورے ڈالنے سکھا دیے اور کہا کہ تم یہ کام شروع کر دو۔

پھر میں لحافوں میں ڈورے ڈالنے لگی۔ کبھی کام مل جاتا، کبھی کئی کئی دن تک نہ ملتا۔ میں اس کام سے بھی مایوس ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔

پڑوسن نے میری پریشانی دیکھی تو کہنے لگی۔ ''ایسا کرو، لکھ کر دروازے پر لگا دو کہ یہاں لحافوں میں ڈورے ڈالے جاتے ہیں۔''

مجھے تو لکھنا پڑھنا آتا نہیں تھا۔ میں نے اسی سے ایک بڑے سے کاغذ پر لکھوا کر دروازے پر لگا دیا۔ اسی وقت شیراز آ گیا۔ اسے وہ کاغذ دیکھ کر غصہ آ گیا۔ اس نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور چیخ کر بولا۔ ''میں ابھی مرا تو نہیں گیا ہوں۔ یہ بھی کوئی کام ہے۔ تم ذرا صبر کرو۔ میں تمہیں سب کچھ لا دوں گا۔''

''اور کتنا صبر کروں۔'' میں چیخ کر بولی۔ ''تمہاری چوریوں سے کب تک گزارا ہوگا۔ تم نہیں آتے ہو تو ہم بھوکے پڑے رہتے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔'' پھر مجھے خیال آیا کہ میں مرغیاں بھی تو پال سکتی ہوں۔ انڈے بیچ کر گزارا کر لیں گے۔ میں نے شیراز سے کہا تو وہ بھی مان گیا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' وہ خوش ہوگیا۔

اس کے پاس سو روپے تھے۔ وہ اسی وقت دو چوزے لے آیا۔ ہم دونوں انہیں دیکھ دیکھ کر منصوبے بنانے لگے کہ آج دو ہیں کل چار مرغیاں ہوں گی۔ آہستہ آہستہ بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی۔

اچانک چوزوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ باہر بھاگی تو دونوں چوزے دو بلیوں کے منہ میں دبے ہوئے تھے۔ وہ دیوار پر بیٹھی تھیں۔ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھتوں چھتوں نکل گئیں۔

شیراز افسردہ سا اپنے گھر چلا گیا اور میں کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ پڑوسی کی عورت بازار جا رہی تھی۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئی۔ وہاں پیاس لگی تو ہم نے شربت والے سے شربت لے کر پیا، شربت والے کے پاس ریزگاری اور نوٹوں کا ڈھیر تھا۔ وہیں مجھے خیال آیا کہ ہم شربت بھی تو بیچ سکتے ہیں۔

شیراز گھر آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''کل بازار میں مجھے پیاس لگی تو میں نے شربت پیا تھا۔ شربت والے کے پاس نوٹوں اور ریزگاری کا ڈھیر تھا۔ یہ کام تو تم بھی کر سکتے ہو۔''

''ہاں، کام تو مشکل نہیں۔'' شیراز پرخیال انداز میں بولا۔ ''زیادہ پیسے بھی خرچ نہیں ہوں گے۔ ٹھیک ہے، میں بھی یہی کام کرتا ہوں۔''

شیراز نے اِدھر اُدھر سے کچھ معلومات کی، پھر کہیں سے ایک دیگچہ لے کر سڑک کے کنارے جا بیٹھا۔

میں خوش تھی کہ چلو آمدنی کا کوئی ذریعہ تو ہوا۔ میں تصور ہی تصور میں شاپنگ کر رہی تھی، اچھی اچھی چیزیں خرید رہی تھی۔ بہترین کھانے کھا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو شیراز کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ خالی دیگچہ لیے کھڑا تھا۔ میں خوش ہوگئی کہ اتنی جلدی سارا شربت بک گیا۔ وہ منہ لٹکائے ہوئے گھر میں آ گیا۔

''کتنے پیسے ملے شیراز؟'' میں نے پوچھا۔

''شربت بیچنے کا موقع ہی کہاں ملا۔ اچانک مجھے ابا دکھائی دیے۔ میں تو گھبرا گیا۔ پہلے تو سوچا کہ دیگچہ چھوڑ کر بھاگ جاؤں مگر یہ بھی کسی سے مانگ کر لایا تھا۔ اسے کہیں چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ بس گھبراہٹ میں سارا شربت پھینک دیا اور دیگچہ لے کر

بھاگا۔ اگر ابا مجھے دیکھ لیتے تو میری شامت آجاتی۔''

میرے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''خالو ٹھیک کہتے ہیں۔ تم نرے زرافے ہو، اپنے بھائیوں کو دیکھو، دو ملک سے باہر چلے گئے، تیسرا افسر بن گیا، تم یہ ذرا سا کام نہیں کرسکتے۔''

''اچھا کل کچھ کرلوں گا۔ ابھی تو مجھے سکون سے بیٹھنے دو۔''

اگلے دن تو آدھے گھنٹے بعد ہی شیراز خالی دیگچہ اٹھائے لوٹ آیا۔ میں تو خوشی کے مارے بے ہوش ہورہی تھی مگر اس کو منہ لٹکائے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے پوچھا۔ ''آج کیا ہوا؟''

''ہمارا پڑوسی چاچا کرم دین آگیا تھا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔'' شیراز افسردگی سے بولا۔

''پھر۔۔۔؟'' میرا دل دھڑکنے لگا۔

''اسے دیکھتے ہی میں نے شربت گرادیا اور دیگچہ لے کر کھسک آیا۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

شیراز بھی میرے پاس آبیٹھا۔ ''تجھے پیسوں کی پڑی ہے، ابا میرے لیے کسی لڑکی کی تلاش میں ہے، جو خود پیسے والی اور شہر کی ہو۔''

''تو اسی لیے شربت گراتا پھر رہا ہے۔'' میں رونے لگی۔

''ہاں، بلیوں کو بھی میں نے ہی بلایا تھا کہ چوزے کھا جاؤ۔'' وہ بھی چیخا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہے۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں کہ ابا سے پیچھا کیسے چھڑاؤں۔''

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' میں نے آنسو صاف کیے۔ ''تم گھر سے بھاگ جاؤ۔''

''کیا۔۔۔؟'' اس نے حیرت سے مجھے گھورا۔

''افوہ۔۔۔ بھاگ کر یہاں آجانا، مجھے بھی سکون ملے گا، رات ڈر ڈر کر گزارتی ہوں۔''

پھر حالات وہیں آگئے، پڑوسن سے بات کی تو اس نے مجھے سیدھی سلائی سکھادی کہ کپڑے جوڑ دیا کرو۔ باقی کام میں خود کیا کروں گی، کچھ پیسے لے لینا۔

میں وہ کام کرنے کو بھی تیار ہوگئی اور پڑوسن کا کام کرنے لگی۔ پڑوسن مجھے کچھ پیسے دے دیا کرتی تھی۔ میں وہ جمع کرتی رہی، کھانے پینے کا سامان تو جیسے تیسے شیراز لادیا کرتا تھا۔ اس عرصے میں میرے تین بچے ہوگئے تھے، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ دونوں بڑے بچے اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گئے تھے مگر شیراز کو اس کا خیال نہیں آیا۔ مجھے تو یوں بھی کچھ پتا نہیں تھا۔

اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے میں نے کچھ مرغیاں خرید لیں۔ انڈوں کا کاروبار اب تک میرے ذہن سے نہیں نکلا تھا۔ پڑوسن سے کاغذ پر لکھوا کر دروازے پر لگادیا کہ یہاں دیسی انڈے ملتے ہیں۔ لوگ خود ہی آکر لے جایا کرتے۔ شیراز نے پہلے تو شور مچایا پھر خاموش ہوگیا۔

اس دن تو گویا قیامت ہی آگئی۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں گھبرا کر دروازے پر گئی تو سناٹے میں رہ گئی۔ وہاں خالو کھڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجرم بنا شیراز بھی کھڑا تھا۔ نہ جانے انہیں کہاں سے میرے بارے میں علم ہوگیا تھا۔ وہ دندناتے ہوئے اندر آئے اور مجھے بے نقط سنانے لگے۔

ڈر تو مجھے بہت لگ رہا تھا میں نے سوچا کہ کبھی تو راز فاش ہونا ہی تھا، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں گھر لے جائیں۔ اس مصیبت سے تو جان چھوٹے گی۔

خالو تو جیسے انگارے چبا رہے تھے۔ ''تو آوارہ اور بدچلن عورت! تو نے اور تیرے باپ نے مل کر اس احمق زرافے، عقل کے اندھے کو پھنسالیا کہ تو میرے گھر میں عیش کرے، یہ زرافہ بے وقوف ہوسکتا ہے مگر میں نہیں ہوں۔ میں تجھ جیسی بدکردار عورتوں کو خوب جانتا ہوں۔ بھلا ہو اس بے چاری رشیدہ کا۔ وہ بہت نیک عورت ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتایا

ہے۔''

میں نے زہر خند سے سوچا، ''رشیدہ اور نیک عورت۔۔'' نہ جانے خالو کیا بول رہے تھے۔ میرا ذہن تو رشیدہ میں الجھا ہوا تھا۔ شاید وہ میرا انتظار کرتی رہی کہ میں لوٹ آؤں گی، آخر تھک ہار کر مجھے تماشا بنانے آ گئی کہ کہیں میں خالو کے گھر میں عیش نہ کر رہی ہوں۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مجھے خالو پر حیرت ہو رہی تھی۔ بد اچھے ہو گئے اور بدنام برے، بدمعاشوں پر شرافت کا ٹھپا لگ گیا اور شریف بدمعاش بن گئے۔ میرا سارا وجود کانپنے لگا۔

وہ زرافہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ جیسے گونگا اور بہرہ ہو۔ خالو کہہ رہے تھے۔ ''چل بیٹا! تجھ ہی سے غلطی ہو گئی کوئی بات نہیں، مرد کچھ دن عیش کرنے کے لیے ایسی شادیاں کر ہی لیا کرتے ہیں، تیری اصل شادی وہ ہو گی جو ہم دھوم دھام سے کرائیں گے۔'' پھر وہ میری طرف پلٹا۔ ''جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ اس قسم کی شادیوں کے لیے وہ کیا محاورہ ہے بھئی، وہی جو دیسی عورتوں کے لیے بھی کہتے ہیں، رات گئی بات گئی۔'' خالو ہنسے۔ زرافہ یونہی کھڑا رہا۔

''خالو!'' میں پوری قوت سے چیخی۔ ''بس کریں، ٹھیک ہے میں وہ مور ہوں جو جنگل میں ناچا مگر میں کسی کو ٹھگے سے نہیں آئی، یہ زرافہ تو بے غیرت بن کر سن رہا ہے مگر میری برداشت جواب دے گئی ہے۔ آپ نے اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔'' خالو نے میری بات سنی اَن سنی کر دی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں پھر چیخی۔ ''ٹھہریں! آوارہ اور بدچلن کی وضاحت تو کرتے جائیں۔ میری بدچلنی اور بدکرداری کہاں دیکھی آپ نے۔ میں نے کیا آوارگی کی؟''

میری بات سن کر خالو گڑبڑا گئے مگر بولے کچھ نہیں۔ شیراز کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

میرے پورے وجود میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی، شیراز میرے سامنے آئے اس کا تو میں وہ حشر کروں گی کہ یاد رکھے گا مگر شیراز نے پلٹ کر ہماری خبر بھی نہ لی۔ پڑوسن کہتی، تم فون کرو، میں نے کہا میں کیوں کروں، اس نے زیادتی کی ہے اسے آنا چاہیے۔ مجھے تو رشیدہ پر بھی غصہ تھا لیکن میں اس کا بھی کیا بگاڑ سکتی تھی۔ مجھے تو مستقبل کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ اب کہیں کوئی ٹھکانا بھی تو نہ تھا۔ تین تین بچوں کا ساتھ۔ میں آنے والے وقت کے تصور ہی سے لرز رہی تھی۔

اس وقت بھی میں یہی سوچ رہی تھی، سوچ کیا رہی تھی، اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی۔ دل ہی دل میں اللہ سے دعا بھی کر رہی تھی کہ اچانک دروازہ پر دستک ہوئی اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ لباس سے خاصی خوش حال دکھائی دے رہی تھی۔

''میں یہاں سے کچھ فاصلے پر رہتی ہوں۔ دیسی انڈے چاہیے تھے۔'' وہ خود ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ میں گم صم سی فرش پر بیٹھی تھی۔ عورت نے کہا۔ ''آج گھر میں بھی کوئی نہیں تھا ورنہ کسی کو بھیج دیتی، گاڑی بچے لے گئے ہیں، گھر تلاش کرتے کرتے میں تھک کر۔۔۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''تم رو رہی ہو؟''

پتا نہیں اس کے لہجے میں کیا بات تھی، میں بالکل ہی بے قابو ہو گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ عورت اٹھ کر میرے لیے پانی لے آئی اور مجھے تسلیاں دینے لگی۔ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے مجبور کرنے پر بتانا پڑا۔

''تم میرے گھر میں کام کرو گی۔ کھانا پینا، کپڑے اور تنخواہ بھی دوں گی۔''

''اس شہر میں میرے سسر کی بہت عزت ہے، خواہ جھوٹی ہی سہی۔ ابھی تو شیراز نے صرف یہاں آنا چھوڑا ہے۔ میں نے آپ کے گھر کام کیا تو فوراً طلاق بھجوا دے گا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کچھ سلائی وغیرہ کا کام آتا ہے۔'' عورت نے پوچھا۔

''نہیں جی، مجھے بھلا کون سکھاتا۔''

''میری بیٹی کا بوتیک ہے، اسے کاریگروں کی ضرورت ہے۔ تم گھر بیٹھ کر بھی کام کرسکتی ہو۔''

''آپ کی بیٹی کا۔۔۔ کیا ہے جی۔'' میں سمجھ نہیں پارہی تھی۔

''تم ایسا کرو۔'' اس نے جواب دینے کی بجائے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے گھر کا پتا سمجھاتی ہوں، تم میرے گھر آجاؤ۔ بیٹی سے ملوادوں گی، شاید وہ تمہارے لیے کوئی کام نکال لے۔''

''باجی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' میری آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ ''میرا اور ان بچوں کا کچھ آسرا ہوجائے گا۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

''ارے احسان کیسا۔ تم کام کروگی بھئی، کوئی خیرات نہیں لوگی۔'' انہوں نے محبت سے کہا اور پتا سمجھادیا۔

میں اسی دن باجی کی بیٹی سنبل سے ملی۔ اس نے مختلف کام بتائے مگر مجھے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ پھر سنبل کہنے لگی۔ میں خود ڈیزائنر ہوں۔ ایسا کرو، تم یہ قمیص اور دوپٹا لے جاؤ۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ اس پر کیسا کام ہوگا۔ وہ کام تم خود نہیں کروگی بلکہ کسی ایسی عورت سے کروانا جو یہ کام جانتی ہو۔ چیزیں سب میری ہوں گی۔ سوٹ بنوا کر لاؤ، پھر بات ہوگی۔

سوٹ تو میں لے آئی مگر مجھے پتا کچھ نہیں تھا۔ پڑوسن سلائی کرتی تھی۔ سوچا، وہ بتاسکتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ واقعی وہ ایک دو عورتیں کو جانتی تھی جو میرا کام کرسکتی تھیں۔ سنبل نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ پیسے اچھے دے گی۔ میں نے ان عورتوں سے بات کی تو وہ کام کرنے پر راضی ہوگئیں۔

وہ سوٹ دیکھ کر سنبل بہت خوش ہوئی۔ شہر کے بیچوں بیچ اس کا بوتیک تھا جو خاصا چلتا تھا، پھر سنبل کپڑے سلائی بھی کرنے کا سوچ رہی تھی۔ میں کام والی عورتوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھی۔ اب مجھے کام کرنے والے مرد کاریگر بھی مل گئے تھے۔ سنبل سے کام لاکر میں ان لوگوں کو دیتی اور ان سے سنبل کو، منافع میرا ہوتا تھا۔ یعنی مزدوری دے کر جو پیسے بچتے وہ میرے ہوتے تھے۔ یوں زندگی کچھ بہتر انداز میں گزرنے لگی۔

ایک دن خالہ میرے گھر آگئیں، شیراز بھی ساتھ تھا، اتنے مہینوں بعد وہ آیا تھا۔ میں نے غصے میں خالہ کا بھی لحاظ نہیں کیا اور شیراز کو خوب سنائیں۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

''بیٹا! یہ باپ کے ہاتھوں مجبور تھا۔'' خالہ رونے لگیں۔ ''اور وہ تمہاری لمحے لمحے کی خبر رکھتے رہے کہ تم کرتی کیا ہو، رشیدہ نے نجانے ان کے کان میں کیا پھونک دیا تھا۔ تم بوتیک کا کام کروانی پھر رہی ہو، چھوڑو، تمہارا حق میں تمہیں دوں گی۔'' یہ کہہ کر خالہ نے اپنا ہینڈ بیگ ٹٹولا۔ اس میں زیور کے دو ڈبے تھے۔ رقم کی ایک گڈی تھی۔ خالہ نے زیور اور رقم میری گود میں رکھ دی پھر کہنے لگیں۔ ''شیراز کے لیے لڑکی تلاش کرتے کرتے تمہارے خالو کی ملاقات ایک دولت مند بیوہ سے ہوگئی ہے۔ اب اس سے خود شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ بچے تو میرے ساتھ ہیں، میں نے انگلینڈ والوں کو بھی بتادیا ہے بڑا بیٹا تو اگلے ہفتے تک آرہا ہے۔ میں اب اپنے حق کے لیے بھی لڑوں گی اور تمہارے لیے بھی۔''

جی تو چاہا پوچھوں خود کو چوٹ لگی تو اب میرا خیال آیا ہے مگر خالہ بہت دکھی ہورہی تھیں اس لیے میں چپ ہوگئی۔

دو دن بعد پتا چلا کہ شیراز کی بہن کا رشتہ آیا تھا، وہ لوگ غریب تھے خالو نے انہیں بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا۔ اگلی رات شیراز کی بہن اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔

میں شیراز کے گھر چلی گئی۔ خالو کی حالت بہت بری تھی، مجھے انہوں نے گھور کر دیکھا تو میں نے کہا۔

''فکر مت کریں۔ میں ابھی چلی جاؤں گی۔ افسوس کرنے آئی ہوں۔''

''تمہیں تو بات کرنا بھی آ گئی ہے۔'' خالو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وقت بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔'' میں سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''ویسے خالو! میں تو بدچلن ہوں، شرافت کی باتیں تو مجھے نہیں آتیں، پھر میرے باپ نے غلطی یہ کی کہ میرا نکاح کر کے رخصت کیا ورنہ شاید میں کچھ بتا سکتی کہ ایسی حالت میں عزت کو کس طرح بچایا جائے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور خالو کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر بیٹھے پہلو بدل رہے تھے۔ ''ابھی یہ بات آپ کے کسی بیٹے کو نہیں معلوم، صرف اس زرافے کو معلوم ہے مگر وہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔''

میری بات سن شیراز نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''ڈریں اس وقت سے جب دوسرے بیٹوں کو پتا چلے گا۔ آپ کا آفیسر بیٹا سرکاری کام سے لاہور گیا ہے، کل پرسوں تک آ جائے گا۔ انگلینڈ والا بھی آ رہا ہے، اس کے غصے کو بھی آپ جانتے ہیں۔ آپ نے زبردستی اسے انگلینڈ بھیجا مگر وہ سسرال کے سائے میں نہیں رہا، اپنا کماتا ہے۔'' میں نے خالو کی طرف دیکھا۔ خالو کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ ''اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے آنے سے پہلے لڑکی کو گھر لے آئیں اور اسی لڑکے کے ساتھ باعزت طور پر رخصت کر دیں۔''

میری بات سن کر خالو کچھ دیر تک میری بات پر غور کرتے رہے، پھر ان کی جان میں جان آئی۔ ''رضیہ! میری بچی! مجھے معاف کر دے۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' وہ شیراز کے ساتھ فوراً کہیں جانے کو تیار ہو گئے۔

میں گھر چلی آئی۔ میں بہت خوش تھی کہ اب خالو نے معافی مانگ لی ہے۔ مجھے خود گھر لے کر جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ بیٹی والے معاملے سے نمٹ کر وہ پھر پہلے جیسے ہو گئے البتہ شیراز کو میرے پاس بھیج دیا۔ کچھ مدد خالہ نے کی، کچھ شیراز کے بھائیوں نے، کچھ ہم دونوں نے محنت کی اور ہم نے پانچ مرلے زمین خرید کر اپنا مکان بنا لیا اور بچوں کو بھی اسکول میں داخل کروا دیا۔

شیراز کے سب بھائی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ حتیٰ کہ خالو نے بیٹی کو سکھ دینے کے لیے بے روزگار داماد کے لیے بھی ملازمت کا بندوبست کر دیا ہے۔ دوسرے بیٹوں سے بھی کچھ نہ کچھ لے کر بیٹی کو دے دیتے ہیں۔ ہماری حالت اب بھی سب سے گئی گزری ہے، وہی کھینچ تان کر زندگی گزر رہی ہے۔

پچھلے دنوں خالو کو اچانک انجائنا کی تکلیف ہو گئی۔ شیراز ہی خالو کی خدمت کرتا رہا۔ وہ اسپتال سے گھر آئے، تب بھی شیراز ہی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

ایک رات شیراز حیران پریشان سا گھر آیا۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگا۔ ''آج پتا ہے کیا ہوا۔ ابا واش روم میں تھے، مجھے ان کی دوا لانا تھی، پرچی کہیں رکھ کر بھول گیا تھا اور وہی تلاش کر رہا تھا کہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے کچھ کاغذات ہاتھ لگے، وہ پانچ مکانوں کے کاغذات تھے، ابا نے وہ مکان اپنے اور میرے بھائیوں کے پیسوں سے بنائے ہیں مگر ایک ایک مکان ہم سب بھائیوں کے نام ہے۔ میں نے ایڈریس نوٹ کر لیے تھے۔ وہی مکان دیکھ کر آ رہا ہوں۔ بہت اچھے مکانات ہیں۔ ان کی ڈائری سے پتا چلا کہ وہ تم سے نفرت نہیں کرتے، انہیں بس یہ دکھ ہے کہ شیراز کی شادی دوسری اولاد کی طرح دھوم دھام سے نہیں ہوئی اور وہ اس شادی میں شریک نہیں ہوئے اس لیے یونہی بولتے رہتے ہیں۔'' یہ سب سن کر میں اللہ کے حضور سجدے میں گر گئی۔

آخر میری قربانیاں رنگ لائی تھیں۔ سچ ہے۔ اللہ کے یہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں ہے۔ پہلے میں رشیدہ کو بددعائیں دیتی تھی کہ یہ ظلم اسی نے مجھ پر کیا تھا مگر اب تو اس کے لیے بھی دعا نکلتی ہے دل سے۔

سہیل اطمینان سے نیچے اترا اور سوالیہ نظروں سے ..... ڈرائیو کرنے والے غیر ملکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے سہیل کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سب بلڈنگ میں داخل ہو گئے۔

•

راز

انیس الرحمٰن

اس شمارے کی ایک دل چسپ جاسوسی کہانی

محکمہ خارجہ کے ہیڈ کلرک رشید نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تھکن سے بھرپور انگڑائی لی اور اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل بند کر کے قریب پڑے ہوئے بیگ میں رکھ لی آفس بالکل خالی ہو چکا تھا۔ چھٹی کے وقت جب اس کے ساتھیوں نے اس سے چلنے کو کہا تھا تو اس نے کام کی زیادتی کا بہانہ بنا دیا تھا۔ اس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر راہداری میں نکل آیا۔ راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا جس میں سیکورٹی آفیسر بیٹھا کرتا تھا۔ ہر شخص کو باہر جانے سے پہلے اس کمرے میں سے گزرنا پڑتا تھا۔

''مسٹر رشید! کیا میں یہ بیگ دیکھ سکتا ہوں۔'' سیکورٹی آفیسر نے کہا۔

''ضرور کیوں نہیں .....'' رشید نے بیگ آفیسر کی طرف بڑھایا۔

آفیسر نے کھڑے ہو کر بیگ لیا اور کھول کر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''مسٹر رشید! آپ کے بیگ میں یہ فائل کیسی ہے۔''

اچانک رشید نے اس کی طرف چھلانگ لگائی اور اس کو ساتھ لیتا ہوا فرش پر گرا۔ گرتے گرتے اس نے سیکورٹی آفیسر کی گردن پر اپنی انگلیاں جما دیں اور گرفت کو سخت کرتا چلا گیا۔ سیکورٹی آفیسر نے اس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ مگر رشید پر کچھ ایسی جنونی کیفیت طاری تھی کہ آفیسر کی گردن کو مرنے کے بعد ہی چھٹکارا ملا۔ رشید نے اسے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اپنے کپڑے ٹھیک کیے۔ میز پر سے بیگ اٹھا کر بند کیا اور اطمینان سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

سہیل اور رشید گہرے دوست تھے اور مدت سے ایک ہی فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ دونوں ہی اکیلے تھے۔ قریبی رشتہ داروں میں سے بھی کوئی موجود نہیں تھا۔

سہیل کسرتی جسم کا خوب صورت قد آور جوان تھا۔ امپورٹ اسپورٹ کے کاروبار میں اس نے خاصی ترقی کی تھی۔ اس نے کئی دفعہ رشید کو اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی مگر نہ جانے کیوں رشید نے ہر دفعہ اسے ٹھکرا دیا..... دونوں شطرنج کے دھنی تھے اور خالی اوقات میں شطرنج ہی کھیلا کرتے تھے۔ کمرے میں ہر وقت ایک بساط بچھی رہتی اور مہرے سجے رہتے۔ کبھی کبھی تو ایک بازی کئی کئی دن چلتی رشید کا دوسرا شوق جوئے کا تھا اور جوئے میں ہارنا اس کا مقدر تھا۔ مگر وہ کھیلنے سے باز نہیں آتا تھا۔

سہیل صوفے پر لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ کہانی خاصی دلچسپ تھی مگر اس کا دل پڑھنے میں قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ مستقل رشید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا اور وہ غائب تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ جس دن رشید غائب ہوا اسی دن اس کے آفس کا سیکورٹی آفیسر بھی قتل ہو گیا اور ایک انتہائی اہم فائل بھی آفس سے غائب تھی۔ آفیسر کا قتل اور فائل کی چوری دونوں رشید ہی سے منسوب کیے جا رہے تھے۔

سہیل نے اس کو ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کر لی تھی اور وہ ناکام رہا تھا۔

اس وقت وہ کتاب پڑھتے پڑھتے اچانک اچھل پڑا۔ سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ دراصل اس کے زیر مطالعہ کہانی روحوں سے متعلق تھی۔ مگر جب اسے احساس ہوا کہ وہ آواز ٹیلی فون کی گھنٹی کی تھی تو خود ہی جھینپ گیا۔

''سہیل۔''! اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں شہلا بول رہی ہوں..... کیا بات ہے تم کئی دن..... سے دفتر میں نہیں آئے اور گھر پر بھی نہیں ملے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ایسا ہی ضروری کام تھا کہ میں تم سے بھی نہیں مل سکا۔''

''ایسا کون سا کام ہو سکتا ہے کہ تم مجھے بھی فراموش کر دو۔''

''میں تمہارے پاس آ رہا ہوں وہیں بتاؤں گا۔'' سہیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو پھر جلدی آؤ..... میں انتظار کر رہی ہوں۔'' شہلا نے ریسیور رکھ دیا۔

سہیل نے بھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ کال بیل کی آواز گونجی۔

''یہ کون آ مرا۔'' سہیل نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا..... اور جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کے سامنے رشید کھڑا تھا اپنی منفرد مسکراہٹ کے ساتھ۔

''تم.....!'' سہیل کو جھٹکا لگا۔

''کیوں..... تعجب ہوا مجھے دیکھ کر.....'' رشید نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''کیا نہیں ہونا چاہیے تھا..... آخر تم اتنے دن کہاں غائب رہے اور یہ فائل اور قتل وغیرہ کا کیا چکر ہے۔'' سہیل نے لگاتار سوال داغے۔

''دھیرج..... دھیرج میرے بھائی..... سب کچھ بتادوں گا مگر ابھی نہیں..... ابھی تو مجھے دو ایک کام اور نمٹانا ہیں۔'' سہیل نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔

''تمہاری یہ غیر متوقع آمد میرے لیے اتنی سنسنی خیز ہے کہ اگر میں نے شہلا سے ملاقات کا وعدہ نہ کرلیا ہوتا تو تمہاری کہانی سننے کو ضرور رکتا۔ بہرحال میں جلد ہی لوٹنے کی کوشش کروں گا۔''

''نہیں تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ..... بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہو۔''

''ہاتھ تھکا ہوا تو ہوں لیکن ایک کام بیحد ضروری ہے۔ تم نے ملنے کے لیے اتنا بیتاب تھا کہ بھول گیا۔ خیر اب میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ راستے میں اتر جاؤں گا۔ اچھا وہ کام اسی وقت ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے تم بیٹھو میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سہیل اندرونی کمرے کی طرف مڑ گیا۔

خوب صورت شہلا سہیل کی سیکرٹری تھی اور ایک اوسط درجہ کی بلڈنگ میں اکیلی رہ رہی تھی۔ اس کی بیمار ماں سیٹی ٹوریم میں داخل تھی کوئی قریبی عزیز نہ تھا اور چوتھے اس مشکل وقت میں پیٹھ دکھا گئے تھے..... ماں کی بیماری ہی نے شہلا کو سڑکوں کی خاک چھنوائی تھی..... اسی گردش دوراں میں وہ سہیل سے ٹکرا گئی..... سہیل نے اس کے حالات سے متاثر ہو کر اسے اپنی سیکرٹری بنا لیا تھا..... پہلے تو وہ اس سے صرف متاثر ہی ہوا تھا لیکن پھر اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے جو بالآخر گہری محبت میں تبدیل ہو گئے اور اب ان دونوں کو ماں کے تندرست ہونے کا انتظار تھا۔

''تو پھر رشید تمہیں نہیں ملا۔'' شہلا نے کافی کا کپ سہیل کی طرف بڑھایا۔

''ملا تھا..... جب میں یہاں آ رہا تھا اسی وقت وہ بھی آ گیا۔ ہم دونوں گھر سے ساتھ ہی چلے تھے مگر وہ راستے میں اتر گیا۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ اس دوران اس پر کیا گزری مگر اس نے کچھ نہیں بتایا کہنے لگا' انتظار کرو بعد میں بتاؤں گا۔''

''تو پھر کل سے تو دفتر آؤ گے نا۔'' شہلا نے پوچھا۔ ''بہت کام جمع ہو گیا ہے۔''

''اوں' نہہ! دفتر کی باتیں دفتر میں..... اور یہ تم وہاں کہاں بیٹھی ہوں' یہاں قریب آ کر بیٹھو۔'' سہیل کے لہجے میں شوخی آ گئی۔

شہلا نے مسکرا کر انکار میں سر ہلا دیا۔ سہیل نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کر خود ہی اس کے پاس جا بیٹھا۔ ایک ہاتھ اس کے شانے پر پھیلایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ سہیل کے سینے سے لگ گئی اور اپنے ہاتھ..... اس کی پیٹھ پر پھیلا دیے..... سہیل نے اس کو اپنے سینے سے اور قریب کرلیا۔

ابھی انہیں راز و نیاز کرتے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

''یہ کباب میں ہڈی کہاں سے آ گئی۔'' سہیل نے برا سا منہ بنایا۔

''پتا نہیں کون ہے۔'' شہلا نے سہیل کی گرفت سے نکلتے ہوئے کہا۔

''تم بیٹھو میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سہیل دروازے کی طرف بڑھا' ابھی اس نے دروازہ پوری طرح کھولا بھی نہیں تھا کہ رشید اسے دھکا دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے داہنے ہاتھ سے اپنا پہلو دبا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے خون میں تر تھے۔

''یہ کیا ہوا.....'' سہیل نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے رشید کو سہارا

دے کر کوچ پر لٹا دیا۔

''انہوں نے مجھے گولی ماردی۔'' رشید کمزور آواز میں بولا۔

''میں ڈاکٹر شاہد کو لے کر آتی ہوں۔ وہ یہیں قریب ہی رہتے ہیں۔'' شہلا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور باہر کی طرف دوڑی۔

''ڈاکٹر کچھ نہیں کرسکتا سہیل! خون بہت بہہ چکا ہے۔ تم میری بات غور سے سن لو۔'' رشید نے کہا۔

''تم بولو نہیں۔ بولنے سے کمزوری اور بڑھ جائے گی۔'' سہیل نے سمجھایا۔

''میری بات سنو سہیل کیونکہ پھر میں کبھی نہ بول سکوں گا۔ پوری بات سن لو بیچ میں مت بولنا۔'' رشید کی آواز ہلکی ہوگئی اور سانس پھولنے لگی۔

سہیل نے اضطراب کے عالم میں پہلو بدلا اور کچھ بولتے بولتے رک گیا۔ شاید اس نے بھی یہی سوچا ہو کہ رشید کا بیان سن لینا چاہیے۔ رشید نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم جانتے ہو جوئے کی لت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ روپے کی ضرورت رہی ہے۔ میری تنخواہ سے وہ ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں محکمے کے راز ایک دیسی عیسائی رابرٹ کے ہاتھ فروخت کیا کرتا تھا۔ اس سے مجھے اتنی آمدنی ہو جایا کرتی تھی کہ میں بے فکری سے جوا کھیلا کرتا تھا۔ اب سے کچھ دن پہلے رابرٹ نے ایک خاص فائل کا مطالبہ کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس فائل میں کیا ہے۔ یہ فائل محکمہ خارجہ کے سیکرٹری کے پاس رہا کرتی تھی۔ میں نے اسے وہیں دیکھا تھا۔ اس فائل کا معاوضہ مجھے امریکی کرنسی میں ملک سے باہر پچاس ہزار ڈالرمل رہا تھا۔ کافی بڑی رقم تھی میں للچا گیا اور فائل پہنچانے کی حامی بھرلی۔ دوپہر کو جب لنچ کا وقفہ ہوا اور سیکرٹری صاحب کھانا کھانے اپنے گھر گئے تو میں نے وہ فائل ان کے دفتر سے نکال لی۔ میں نے سیکورٹی آفیسر کو مارنے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا مگر سچویشن ایسی ہوگئی کہ مجھے اس پر حملہ کرنا پڑا۔ پھر بھی میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہوگیا ہے بہرحال فائل مجھے دوبئی میں رابرٹ کے پاس دو فسکی روز نیف کو پہنچانی تھی۔ وہیں مجھے معاوضہ ملتا۔ ساری باتیں پہلے ہی طے ہوگئی تھیں۔'' رشید خاموش ہوکر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

اس کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی لیکن وہ اپنی مضبوط قوت ارادی کے بل پر سب کچھ بتاتا چلا جارہا تھا۔ کئی لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

''رات کو مجھے دوبئی روانہ ہونا تھا۔ میں پہلے گھر گیا تھا مگر تم موجود نہیں تھے۔ گھر پر مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال آیا کہ شاید یہ فائل بہت ہی اہم ہو اور اس کے غیر ملکی ہاتھوں میں پہنچنے سے کوئی بڑا قومی نقصان ہو جائے..... میں اس خیال کی وجہ نہیں بتا سکتا۔ ظاہر ہے میں محب وطن تو تھا نہیں۔ پہلے بھی غداری ہی کرتا رہا تھا۔ جب اس خیال کی یورش بڑھی تو میں نے فائل میں سے اصلی کاغذات نکال لیے اور دوسرے کاغذات جو میں نے پہلے پائے تھے اس میں لگا دیئے۔ دوبئی میں میں نے نقلی فائل دوفسکی کے حوالے کی اور!..... مجھے پانی دو حلق خشک ہو رہا ہے۔'' رشید بولتے بولتے چپ ہوگیا اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور بدن پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ زبان میں لکنت پیدا ہوگئی تھی۔

''باقی باتیں پھر کر لینا۔'' سہیل نے پانی پلاتے ہوئے کہا۔

''پوری بات تو سن لو..... وقت بہت کم رہ گیا ہے اس نے پانی پی کر گہری سانس لی۔ ''میں نے دوفسکی سے رقم لے کر انہیں اصلی کاغذات سمیت دوبئی کے قومی بینک کے لاکر میں رکھ دیا۔ لاکر کا نمبر ایک سو ستر ہے اور وہ رشید عاقل کے نام سے لیا گیا ہے۔ لاکر کی چابی گھر میں شطرنج پر

'سیاہ بادشاہ' میں رکھی ہے تمہیں معلوم ہے! یہ مہرے میں ہی خرید کر لایا تھا۔ سارے مہرے کھوکھلے ہیں اور شیشی کی طرح کھل جائے ہیں۔ جب تم یہاں آنے کے لیے کپڑے بدلنے گئے تھے تو میں نے وہ چابی بادشاہ میں رکھ دی تھی پھر میں راستے میں تمہاری گاڑی سے اس لیے اتر گیا تھا کہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا' ہوسکتا تھا تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا۔ دراصل دوفسکی کے آدمی میرے تعاقب میں تھے۔ وہ دبئی میں بھی سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہے تھے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں نے جو فائل انہیں دی ہے نقلی ہے اور اصلی فائل میں نے لاکر میں رکھ دی ہے۔ میں اپنی دانست میں ان کو غچہ دے کر یہاں آرہا تھا۔ جب میں یہاں کی گلی میں مڑا تو سامنے رابرٹ کھڑا تھا۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ مگر وہ پستول چلا چکا تھا۔ گولی لگتے ہی میں زمین پر گر گیا۔ اسے چابی کی تلاش تھی۔ مگر وہ ہوتی تو ملتی۔ پھر وہ مجھے ٹھوکر مارتا ہوا بھاگ گیا۔ کیونکہ فائر کی آواز کے باعث اسے خدشہ ہوگا کہ کچھ لوگ وہاں آنکلیں گے۔ وہاں سے میں' بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا۔'' یہ کہہ کر رشید خاموش ہوگیا اور نقاہت سے آنکھیں بند کرلیں۔

سہیل نے بھی ایسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا..... شہلا ابھی تک نہیں آئی تھی..... اچانک رشید کے جسم نے جھرجھری سی لی اور بالکل ساکت ہوگیا۔ سہیل گم صم بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور شہلا ڈاکٹر کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ سہیل نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر! تم نے بہت دیر کر دی۔ رشید تو بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اس کی ہر تکلیف ختم ہوگئی ہے۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''آئی ایم ساری مسٹر..... مس شہلا جب میرے گھر پہنچیں تو میں دوسرے مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا اسی لیے دیر ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں..... جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔'' سہیل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''پولیس کو فون پر اس کی اطلاع دینا ضروری ہے۔'' شہلا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

اس نے جیسے ہی اپنے فلیٹ کے سامنے کار روکی ایک پستول کی نال کھڑکی میں سے جھانک آئی۔

''مسٹر سہیل! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ برابر والی سیٹ پر چلے جائیں.....'' کسی نے انگریزی میں کہا۔

سہیل نے گردن گھما کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی سفید فام تھا اور لہجے سے امریکی معلوم ہو رہا تھا۔ سہیل نے اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر جیسے ہی سیٹ بدلی تو دو آدمی جو نہ جانے کہاں چھپے ہوئے تھے پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہ دونوں بھی غیر ملکی ہی تھے پستول والے شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد کار شہر کے ایک بارونق علاقے میں ایک بلڈنگ کے سامنے رکی۔ پہلے پچھلی سیٹ سے دونوں آدمی اترے اور ایک نے آگے بڑھ کر سہیل کی طرف کا دروازہ کھولا۔ دوسرے آدمی کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی گرفت پستول پر ہے۔ سہیل اطمینان سے نیچے اترا اور سوالیہ نظروں سے..... ڈرائیو کرنے والے غیر ملکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے سہیل کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سب بلڈنگ میں داخل ہوگئے۔ تیسری منزل پر ایک امریکن ٹائپ رائٹر کمپنی تھی..... اس کے ڈائرکٹر کے دروازے پر پہنچ کر آگے والے آدمی نے دستک دی اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے باقی لوگ سہیل

کو گھیرے میں لیے ہوئے داخل ہوئے۔

کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی میز تھی جس کے گرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میز کے پیچھے ایک جسیم اور قد آور غیر ملکی کھڑا تھا۔

''خوش آمدید مسٹر سہیل۔'' غیر ملکی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں گراہم ہوں پیٹر گراہم ایف بی آئی کے ایشین ونگ کا انچارج۔''

سہیل نے آگے کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ''یہ سارا کھیل میری سمجھ میں نہیں آیا مسٹر گراہم۔''

''ہمیں علم ہے کہ آپ کے دوست رشید نے جو فائل محکمہ خارجہ سے چرائی تھی' وہ دبئی بینک کے لاکر میں ہے۔ روسی ایجنٹ نے رشید کو جس وقت گولی ماری تھی اور اس کی تلاشی لی تھی' میرے آدمی اس کے قریب ہی تھے پھر میرے آدمیوں کے مشاہدے میں یہ بھی آیا کہ رشید زخمی حالت میں آپ تک پہنچا تھا' مرتے وقت رشید کے پاس صرف آپ ہی تھے کیونکہ وہ گولی لگنے کے کافی بعد تک زندہ رہا تھا اس لیے یقیناً اس نے آپ کو چابی کے بارے میں بتایا ہوگا ہمارا اندازہ ہے کہ چابی آپ کے فلیٹ میں کسی جگہ ہے۔''

''آپ خواہ مخواہ تقریر کر رہے ہیں مسٹر گراہم۔'' سہیل نے درمیان سے بات کاٹی۔ ''مجھے کسی چابی کا علم نہیں ہے۔''

''بہتر ہوگا مسٹر سہیل کہ آپ خود ہی چابی کا پتا بتا دیں۔ اس میں آپ کا فائدہ ہے۔''

''جب مجھے کسی چابی کا علم ہی نہیں تو پتا کیا بتا سکتا ہوں۔'' سہیل نے حجت کی۔

''آپ کو اس چابی کے پچیس ہزار ڈالر مل سکتے ہیں مسٹر سہیل۔'' گراہم نے پیش کش کی۔

اچانک سہیل نے سوچا کہ اس جھگڑے میں پڑنے سے بہتر ہے کہ قصہ ختم کرے اور چابی گراہم کو دیدے۔ لیکن پھر اس کو خیال آیا کہ..... اس لاکر میں کاغذات بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ اہم بھی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے گراہم کے پاس ان کا پہنچنا ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ لہٰذا بہتر یہ ہی ہوگا کہ کسی طرح ان غیر ملکیوں سے جان بچا کر دوبئی پہنچا جائے۔ لاکر سے رقم نکال کر اپنے قبضے میں کی جائے اور کاغذات لاکر اپنی حکومت کے حوالے کر دیے جائیں۔

یہ سب کچھ سوچ کر اس نے گراہم سے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی چابی نہیں ہے۔''

''اچھی بات ہے مسٹر سہیل! آپ کل تک اچھی طرح سوچ لیں۔'' گراہم نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''لیکن بہرحال آپ کو مثبت فیصلہ ہی کرنا پڑے گا ورنہ چابی دوسری طرح حاصل کرلیں گے جو ظاہر ہے بہتر صورت نہیں ہو گی..... اب آپ جا سکتے ہیں۔'' گراہم نے گفتگو ختم کی اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

سہیل نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور وہ باہر نکل گیا۔ کھلے آسمان کے نیچے پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے گلوخلاصی ہو سکے گی۔

☆

سہیل نے گھر پہنچ کر دروازے کے آہنی قفل میں چابی گھمائی تو محسوس کیا کہ تالا کھلا ہوا ہے۔ اس نے تالے کا لٹو گھمایا اور آہستہ آہستہ دروازہ کھولا کمرے میں بالکل تاریکی تھی وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا ایک دم روشنی ہوگئی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں چند لمحوں کے بعد جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے دیکھا کہ سامنے صوفے پر ایک غیر ملکی ریوالور تانے بیٹھا ہے۔ دائیں بائیں دو مقامی آدمی ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور چہرے ہی سے غیر مہذب معلوم ہوتے تھے۔ اس نے ایک طائرانہ نظر چاروں

طرف ڈالی..... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زلزلہ آیا ہو' کمرے کی کوئی ایک چیز بھی اپنی جگہ پر نہیں تھی اور یہی حالت سامنے والے کمرے کی تھی اس نے گھبرا کر کونے میں شطرنج کی میز کی طرف دیکھا۔ میز الٹی پڑی تھی اور مہرے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

''تم چابی کے بارے میں بتانا پسند کرو گے مسٹر سہیل۔'' غیر ملکی نے خاموشی کو توڑا۔

سہیل نے اطمینان کی سانس لی! اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں ابھی چابی نہیں ملی۔ سہیل نے غیر ملکی کے لہجے پر غور کیا۔ غالباً وہ کوئی روسی تھا۔

''عجیب بات ہے! چابی نہ ہوگئی مصیبت ہو گئی۔ سارا زمانہ ہی پیچھے پڑ گیا ہے۔ ابھی ایک کو بھگت کر آ رہا ہوں اب آپ سے نبٹوں۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''میں نہیں جانتا چابی کہاں اور کس کے پاس ہے۔''

''بہت خوب اچھی ایکٹنگ کر لیتے ہو۔'' غیر ملکی نے مسکرا کر کہا۔

''لیکن ابھی خود ہی بتا دو گے کہ چابی کہاں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے سہیل کے داہنی طرف کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا..... وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور سہیل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ایک تو اس کی..... جسامت بھی کافی تھی اور دوسرے وہ کھڑا بھی اس طرح ہوا تھا کہ صوفے پر بیٹھا ہوا غیر ملکی اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

''بتا دو مسٹر سہیل! چابی کہاں ہے۔'' وہ غرایا۔

سہیل نے لاپروائی سے شانے اچکائے تو وہ ایک دم آگے بڑھا اور سہیل کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ سہیل اچھل کر پیچھے ہٹا مگر پھر بھی گھونسہ لگ ہی گیا۔ اس طرح لگنے والا گھونسہ بھی کئی میگاٹن طاقت کا تھا۔ سہیل دہرا ہو گیا۔ اس کے حواس منتشر ہو گئے تھے لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کر آہستہ آہستہ سیدھا ہوا..... اس نے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کو گھور کر دیکھا اور پھر برقی سرعت سے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر جوابی مکہ رسید کیا۔ یہ حملہ کچھ اتنا ہی اچانک تھا کہ دیوہیکل شخص اپنا توازن کھو بیٹھا اور لڑکھڑا کر پیچھے بیٹھے ہوئے غیر ملکی پر اس طرح جا گرا کہ صوفہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ یہ دیکھ کر سہیل کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے پستول نکالا اور نالی کی طرف سے پکڑ کے دستہ اس کے سر پر رسید کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے سہیل بغیر کسی طرف دیکھے ڈھیر ہو گیا۔

ادھر دیوہیکل شخص بڑی مشکل سے اٹھا اور پھر اس نے ہاتھ پکڑ کر غیر ملکی کو کھڑا کیا..... غیر ملکی نے جو سہیل کو زمین پر پڑے دیکھا تو اس آدمی کی طرف مڑا جس نے سہیل کو بے ہوش کیا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا رابرٹ۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔

''میں نے سوچا مسٹر سالنجوف کہ چابی رشید کے پاس بھی نہیں تھی اور یہاں گھر میں بھی نہیں ملی تو یقیناً اس کے پاس ہی ہو گی اور بے ہوشی کی حالت میں اس کی تلاشی آسانی سے لی جا سکے گی اور پھر یہ تکلیف دہ بھی ہوتا جاتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ پاس کھڑے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف مڑا۔ ''اس کی تلاشی لو اچھی طرح بلکہ کپڑے اتار کر۔''

وہ آدمی نیچے جھکا اور ایک ایک کر کے سہیل کے تمام کپڑے اتار دیئے' کوٹ رابرٹ نے اٹھا لیا اور اس کی ایک ایک سلائی ادھیڑ دی مگر چابی کو ملنا تھا نہ ملی دوسری طرف باقی کپڑوں کا پوسٹ مارٹم بھی مکمل ہو چکا تھا اور وہاں بھی مایوسی ان کا مقدر بنی تھی۔

''لعنت ہو اس پر! پتا نہیں چابی کہاں چھپائی ہے۔'' رابرٹ نے زمین پر پڑے ہوئے سہیل کو ٹھوکر ماری۔ ''میرا خیال ہے سر! اب ہم چلیں'

اسے پھر دیکھیں گے کیونکہ ہوسکتا ہے کوئی اور ٹپک پڑے۔'' اس نے سالیخوف سے کہا۔

''ہوں! چلو مگر ایک آدمی باہر چھوڑ دو جو یہاں کی نگرانی کرتا رہے۔'' سالیخوف دروازے کی طرف بڑھا پھر اچانک رک گیا۔

''میرا خیال ہے رابرٹ تم خود ہی نگرانی کرو..... اور ہاں! آخری دفعہ یہاں کی تلاشی اور لے لو۔''

کافی رات گزر چکی تھی جب سہیل کی آنکھ کھلی اس نے فوراً اپنا سر ٹٹول کر دیکھا سلامت تھا' وہ ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیتابی سے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن سیاہ بادشاہ کہیں دکھائی نہیں دیا اسے اپنی برہنگی کا قطعی احساس نہیں تھا وہ تو پاگلوں کی طرح کمرے میں دوڑتا پھر رہا تھا ایک ایک چیز اٹھا کر پھینک رہا تھا کہ شاید کہیں بادشاہ مل جائے۔ مگر تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس نے سمجھ لیا کہ ان لوگوں کو چابی مل گئی تھی اور وہ لے گئے وہ تھک کر فرش ہی پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ برہنہ ہے۔ اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی پھر اپنے کپڑوں کو دیکھا جو فرش پر پڑے تھے لیکن وہ قطعی طور پر اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ..... پہنے جا سکتے..... وہ کاہلی سے اٹھا اور دوسرے کپڑے نکالنے کے لیے اندرونی کمرے میں داخل ہوا..... ابھی اس نے الماری کھولی ہی تھی کہ اس کی نظریں دروازے کے پٹ کے پیچھے پڑی ہوئی ایک سیاہ سی چیز پر پڑی وہ تیزی سے بڑھا اور اس کو اٹھا لیا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس بادشاہ کا سر الگ کیا۔ اندر خول میں ایک چابی جگمگا رہی تھی' اس نے مہرے کو ویسے ہی بند کر کے دروازے کے پیچھے ڈال دیا۔

دن کے گیارہ بجے ہوں گے جب وہ بستر سے اٹھا..... اٹھتے ہی اس نے دروازے کے پیچھے نظر ڈالی..... بادشاہ بدستور وہیں پڑا تھا..... غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بادشاہ کو اٹھایا اور اس میں سے چابی نکال لی..... پھر غسل خانے میں سے روئی اور چپکنے والے ٹیپ کے رول نکال لایا۔ رول میں سے تھوڑی سی روئی کاٹی اور اس میں چابی کو لپیٹا پھر مزید روئی رکھ کر بائیں بازو کے نیچے پسلیوں پر اس کو ٹیپ سے چپکا لیا۔ بظاہر دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زخم ہوگا جس پر ٹیپ چپکا ہوا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ کار میں بیٹھ کر چل دیا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

رابرٹ کچھ اتنی ہی احتیاط سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سہیل کی کار ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جہاں کوئی شریف آدمی داخلے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس علاقے کی دنیا ہی الگ تھی۔ پورے شہر کے جرائم پیشہ شخص یہاں ملتے تھے۔ عجیب لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل تک ہو جاتے تھے۔ مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کچھ بول سکتا یہاں پر ایک عدد تھانہ بھی موجود تھا مگر پولیس کو کبھی تھانے سے باہر نہیں دیکھا گیا۔ خدا جانے اس کی کیا وجہ تھی وہ بھی غنڈوں سے ڈرتے تھے یا پھر.....

اسی علاقے میں پیڈرو کا ہوٹل بھی تھا پیڈرو اور سہیل کی ملاقات کاروبار کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔ پیڈرو باہر سے شراب وغیرہ منگاتا تھا جو سہیل ہی کے توسط سے آتی تھی۔

ہوٹل اس وقت تقریباً خالی پڑا تھا۔ لیکن پیڈرو اپنے آفس میں موجود تھا۔

''اوہ! سہیل صاحب۔'' پیڈرو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کیوں تکلیف کی مجھے بلا لیا ہوتا۔''

''تم سے ایک بہت ہی ضروری کام تھا..... اور میں انتظار قطعی نہیں کرسکتا تھا اس لیے خود ہی چلا آیا۔'' سہیل نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب

دیا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم وہ کام کر سکو گے۔''

''اگر پیڈرو کے بس میں ہوگا تو کوئی وجہ نہیں کہ نہ ہو سکے۔''

''میں غیر قانونی طور پر دبئی جانا چاہتا ہوں..... وہاں مجھے ایک کام ہے جو انتہائی اہم نوعیت کا ہے..... کام مکمل ہونے پر مجھے واپس بھی آنا ہے اب تم بتاؤ میری کیا مدد کر سکتے ہو۔''

''بس اتنی سی بات..... آپ پیڈرو کے پاس آئے ہیں اور پیڈرو کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اٹھایا۔ نمبر ملا کر کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر ایک علاقائی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ یہ ساری گفتگو سہیل کے سر پر سے گزر گئی۔ بات ختم کر کے پیڈرو نے ریسیور رکھ دیا اور سہیل کی طرف مڑا۔

''آج شام چار بجے ایس ایس نندنی دوبئی جا رہا ہے۔ اس جہاز کا کیپٹن میرا دوست ہے اور پہلے بھی ایسے کام کرتا رہا ہے۔'' پیڈرو نے تفصیل سے سمجھایا۔ ''آپ چار بجے سے پہلے اس کے پاس پہنچ جایئے گا۔ یہ جہاز دو دن دوبئی رکے گا اور پھر یہیں واپس آئیگا۔ آپ اسی جہاز سے واپس بھی آ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے دو دن میرے کام کے لیے کافی ہیں۔''

''آپ ٹھیک وقت پر بندرگاہ پہنچ جایئے گا باقی تفصیلات کیپٹن دارابتا دے گا..... رہا خرچے کا حساب کتاب تو وہ بعد میں ہو جائے گا میں خود بھی کیپٹن سے مل لوں گا۔''

''ایک بات اور!'' سہیل نے اچانک کہا۔ ''کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں میں نہیں چاہتا کہ ان کو پتا چلے کہ میں دوبئی جا رہا ہوں۔''

''آپ ایسا کیجئے کہ پہلے یہاں آ جایئے۔'' پیڈرو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر مڑ کر اپنے پیچھے لگی ہوئی الماری کھولی اس میں کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں جن پر کوٹ اور چسٹر ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے درمیان والی کھونٹی کو اوپر کی طرف اٹھایا۔ الماری کا پچھلا حصہ درمیان میں سے گھوم گیا۔ یہ دروازہ ایک سنسان گلی میں کھلتا تھا۔

''اس گلی میں آپ کو ایک کار تیار ملے گی..... آپ اس پر بندرگاہ جا سکتے ہیں۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ پیڈرو۔'' سہیل کا لہجہ تشکر سے بھرپور تھا۔ ''تم نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی۔''

''ہم تو آپ کے خادم ہیں صاحب آج آپ نے پہلی بار تو کسی کام کو کہا اور ہم وہ بھی نہ کرتے! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

☆☆☆

''باس! آج دن میں سہیل اپنے گھر سے ایک بدمعاش پیڈرو کے پاس گیا تھا۔'' رابرٹ نے ٹیلی فون پر سالیخوف کو رپورٹ دی۔ ''پیڈرو مڈل ایسٹ کے لیے آدمی اسمگل کرتا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا۔'' سالیخوف کی آواز آئی۔

''میرا خیال ہے کہ سہیل اب دوبئی جانا چاہتا ہے اور اسی لیے پیڈرو سے ملا تھا۔ میں بندرگاہ بھی گیا تھا وہاں پتا چلا کہ آج شام چار بجے ایک جہاز دبئی جا رہا ہے..... جہاز کا کیپٹن پیڈرو کا دوست ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سہیل اسی جہاز سے دوبئی جا رہا ہے۔''

''جی ہاں یقیناً یہی بات ہے۔''

''جہاز کا نام کیا ہے۔''

''ایس ایس نندنی۔''

''ٹھیک ہے تم نگرانی جاری رکھو میں ان سب باتوں کی اطلاع دوفسکی کو دے دیتا ہوں وہ جو مناسب سمجھے گا کرے گا۔'' یہ کہہ کر سالیخوف نے ریسیور رکھ دیا۔

رابرٹ بوتھ سے نکلا اور سہیل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

سہیل نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے شہلا کو فون کیا اور اس سے فوراً پہنچنے کو کہا۔ اس کے بعد اپنا پستول نکالا اور کھول کر صاف کیا۔ پھر گولیاں بھر دیں۔ اپنا کوٹ اتار کر چمڑے کی جیکٹ پہنی اور اس کی اندر کی جیب میں کچھ فالتو راؤنڈ رکھ لیے۔ پھر الماری کھول کر نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اور انہیں کھول کر تھوڑے تھوڑے نوٹ مختلف جیبوں میں رکھ لیے..... مسہری کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا اور الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر اس میں رکھنے لگا۔

ابھی اس نے سوٹ کیس بند ہی کیا تھا کہ کال بیل بجی اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا شہلا تھی۔

''کیوں کیا بات ہے۔ کچھ پریشان نظر آتے ہو۔'' اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''میں دوبئی جا رہا ہوں آج ہی۔''

''کیا مطلب۔''

''میں آج شام دوبئی جا رہا ہوں..... اس کام کو پورا کرنے جو رشید ادھورا چھوڑ گیا ہے۔''

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔'' شہلا نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''میری بات اطمینان سے سنو۔'' سہیل نے شہلا کو کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ ''میرا دوبئی جانا بہت ضروری ہے۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا اگر میں کسی وجہ سے واپس نہ آ سکا۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔'' شہلا روہانسی ہو گئی۔

''بھئی فرض کرو ایسی بات ہو ہی جائے تو..... اسی لیے میں نے یہ چیک بک سائن کر دی ہے۔ یہ سارے چیک سادے اور بیرر ہیں۔ یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔''

''مجھے نہیں چاہیے۔'' دولت اس کو تم ساتھ ہی لے جاؤ۔'' شہلا کو غصہ آ گیا۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ آخر میری غیر موجودگی میں آفس یا کسی اور کام کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑ ہی سکتی ہے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گی بہت سے بل وغیرہ بھی دینا ہیں یہ سب کون کرے گا! کیسے ہو گا چلو اچھے بچوں کی طرح چیک بک رکھ لو شاباش۔'' سہیل نے اس کا گال تھپتھپایا شہلا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بیٹھی رہی۔

سہیل کھڑکی کے قریب گیا اور پردہ ہٹا کر سڑک پر نظر ڈالی۔ دو آدمی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے مستقل طور پر بلڈنگ کے دروازے کی طرف گھور رہے تھے ان میں ایک تو گراہم کے ساتھی تھا اور دوسرا وہی شخص جس نے سہیل کو کمرے میں بیہوش کیا تھا۔

''ابھی میں ایک ہنگامہ کرنے والا ہوں' تم گھبرانا نہیں۔'' سہیل نے کہا۔

''کیا کسی قیمت پر یہ نہیں ہو سکتا کہ تم نہ جاؤ۔'' شہلا نے بات کاٹی۔

''ہاں اب ایسا نہیں ہو سکتا۔'' سہیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور بڑھ کر شہلا کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ ''دیکھو میرا انتظار کرنا میں ضرور آؤں گا۔''

شہلا نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اقرار میں گردن ہلائی کافی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے پھر سہیل نے خود کو الگ کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے پستول نکالا اور نال سامنے کی طرف اٹھائی اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

☆☆☆

باہر کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں نے اچانک سہیل کے فلیٹ سے دو فائروں کی آوازیں سنیں اور ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف

دیکھا اور اندر کی طرف دوڑے...... دونوں ساتھ ہی دروازہ کھول کر فلیٹ میں داخل ہوئے مگر یہاں بالکل سکون تھا، شہلا ایک صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

''وہ کہاں ہے۔'' رابرٹ نے پوچھا۔

شہلا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اس کی سرخ آنکھیں اب بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''وہ تو گیا۔''

اچانک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی...... رابرٹ اور دوسرا آدمی کھڑکی کی طرف لپکے۔ سہیل اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو چکا تھا رابرٹ تیزی سے باہر کی سمت بھاگا دوسرا آدمی جو غیر ملکی تھا شہلا کی طرف مڑا۔

''میرا نام کوپر ہے مس......''

''شہلا......'' شہلا کے منہ سے اچانک نکلا۔

''تو مس شہلا آپ بتائیں گی کہ مسٹر سہیل کہاں گئے ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''اگر آپ ان کا پتا بتا دیں گی تو یہ ان کے حق میں اچھا ہوگا۔''

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' شہلا کا انداز معصومیت سے بھرپور تھا۔

''تو پھر آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''وہ کیوں۔''

''میں آپ کو اپنے باس کے پاس لیے چلتا ہوں...... وہی آپ سے سچ بات اگلوائیں گے۔''

''مگر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' شہلا نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

''ضد نہ کریں. ورنہ مجبوراً مجھے سختی کرنی پڑے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے پستول نکال لیا۔

شہلا نے کوئی اور راہ نہ پاتے ہوئے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''اچھا...... چلو۔''

جب یہ دونوں گراہم کے آفس پہنچے تو وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا ان کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کیا بات ہے مسٹر کوپر......! یہ کون ہے۔'' اس نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔

''سر! سہیل ہمیں دھوکہ دے کر فرار ہو گیا اور یہ اس کی محبوبہ شہلا ہیں...... مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور جانتی ہیں کہ سہیل کہاں گیا ہے۔''

''کیوں مس شہلا! آپ کو معلوم ہے سہیل کہاں گیا ہے۔'' گراہم اس کی طرف مڑا۔

''نہیں اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔'' شہلا نے انکار میں گردن ہلائی۔

''فکر نہ کریں مس شہلا...... سہیل کی زندگی خطرے میں ہے اور ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' گراہم نے شہلا کو سمجھایا۔ ''دیکھئے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔''

☆☆☆

جس وقت گراہم اور اس کے ساتھی بندرگاہ پہنچے تو کیپٹن دارا کا جہاز ساحل چھوڑ چکا تھا...... گراہم نے مایوسی سے اپنے ہاتھوں کو ملا اور واپس کار کی طرف مڑ گیا۔

ادھر رابرٹ فون پر سالیوف کو بتا رہا تھا۔

''سر! سہیل جہاز پر سوار ہو گیا ہے اور جہاز اب ساحل چھوڑ چکا ہے۔ اب بتایئے کیا کیا جائے۔''

''تم واپس آجاؤ...... تمہارا کام اب ختم ہو چکا ہے۔ جہاز پر ہمارا آدمی موجود ہے وہ خود سہیل سے چابی وصول کر لے گا......'' سالیوف نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

جہاز پہنچ کر سب سے پہلے سہیل کی ملاقات جس شخص سے ہوئی وہ تھرڈ آفیسر تنویر تھا جس نے بتایا کہ کیپٹن دارا اس وقت مصروف ہے اور بعد میں اس سے ملاقات کرے گا۔ پھر وہ کیبن تک اس کے ساتھ آیا اور کیبن کو باہر سے بند کر کے چلا گیا۔ سہیل نے بہت کوشش کی کہ دروازہ کسی طرح کھل جائے۔ مگر وہ نہ کھلا۔ آخر تھک کر وہ کونے میں پڑے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا

اور کیبن کا جائزہ لینے لگا۔ بڑا مختصر سا کیبن تھا۔ ایک بستر ایک چھوٹی میز اور ایک آرام کرسی' بس یہ تھی کل کائنات..... سہیل بستر پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھ لیے۔ وہ شدید الجھن میں تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ اس کے کیبن کو کیوں مقفل کیا گیا تھا۔

سات بجے کے قریب دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ سہیل نے گردن موڑ کر دیکھا یہ تنویر تھا۔

''آپ کو کیپٹن نے بلایا ہے۔''

سہیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اس کے پیچھے چلدیا۔ کیپٹن اپنے کیبن میں اکیلا تھا..... تنویر اسے وہاں پہنچا کر واپس چلا گیا۔

''مسٹر سہیل! مجھے یقین ہے کہ آپ کو جہاز پر کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔'' اس نے پوچھا۔

''تکلیف تو نہیں' ہاں الجھن ضرور ہوئی۔'' سہیل نے جواب دیا۔ ''آخر میں قید میں کیوں ہوں۔''

''آپ قید نہیں ہیں بلکہ احتیاط ایسا کیا گیا ہے..... آپ غیر قانونی طور پر دوبئی جا رہے ہیں آپ کا آزادی سے جہاز پر گھومنا اور چلنا پھرنا آپ کے لیے اور پھر ہمارے لیے بھی بہتر نہیں ہے میں آپ سے فوراً نہیں مل سکا تھا آپ کو یہ بات سمجھا تا اس لیے آپ کو کیبن میں بند کر دیا گیا تھا۔''

''خیر..... ٹھیک ہے۔''

''دوسری بات دوبئی میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔'' کیپٹن نے بتایا۔ ''یہ پتا ہے۔'' اس نے ایک کارڈ سہیل کی طرف بڑھایا۔ ''اس پتا پر آپ کو ایک لڑکی سمیعہ ملے گی۔ اس کے پاس ایک ہی کمرہ ہے اور آپ کو اس کے ساتھ ہی ٹھہرنا ہوگا اس کو آپ کے پہنچنے کی اطلاع دیدی گئی ہے۔''

سہیل نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لیا اور پتا دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر سہیل اب آپ جا سکتے ہیں..... اور ہاں اپنے کیبن سے باہر مت نکلیے گا اب آپ کو بند نہیں کیا جائے گا۔''

رات کا کھانا کیبن میں ہی آ گیا تھا۔ سہیل نے کھانا ختم کیا ہی تھا کہ تنویر پہنچ گیا' اس کے ہاتھ میں تاش کی ایک گڈی تھی۔ جسے وہ مسلسل پھینٹ رہا تھا۔

''تاش کھیلیں گے سہیل صاحب۔''

''نہیں! اس وقت میرا ذہن اس قابل نہیں کہ تاش کھیل سکوں..... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

''مسٹر سہیل میں نے سنا ہے کہ آپ پیسے کے چکر میں دوبئی جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب۔''

''آپ خود سمجھ دار ہیں..... ویسے آپ کے پاس کونسا خزانے کی چابی ہے اگر وہ مجھے دیدیں تو کیسا رہے۔'' تنویر کھڑا ہوا مسلسل تاش پھینٹ رہا تھا۔

سہیل چونک پڑا اور جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

''کیسا خزانہ۔''

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ کے پاس دوبئی بینک کے لاکر کی چابی ہے اس لاکر میں خاصی بڑی رقم اور قیمتی معلومات ہیں اطلاع دینے والے نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں وہ چابی ہر قیمت پر آپ سے حاصل کرلوں۔''

''یہ اطلاع تم کو کس نے دی۔''

''یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں..... دوفسکی روز نیف نے۔''

''اوہ تو تم اس کے گرگے ہو۔''

''آپ کی دعا سے..... تو پھر لایئے چابی۔''

تنویر نے ہاتھ بڑھایا۔ سہیل نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ اٹھائی اور پوری طاقت سے تنویر کے پیٹ میں ماری' تنویر کیبن کے دیوار سے ٹکرایا..... سہیل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تنویر نے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور وہیں سے سہیل پر کھینچ مارا..... سہیل چاقو

سے بچنے کے لیے ترچھا ہوا مگر پھر بھی چاقو اس کے بائیں شانے میں اتر گیا۔ درد کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی اس نے فوراً پستول نکالا اور تنویر کی طرف فائر کر دیا' تنویر کی آنکھیں پھٹیں اور پھٹی ہی رہ گئیں' گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ فائر کی آواز سن کر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے کیپٹن بھیڑ کو چیرتا ہوا آیا پہلے تنویر کی طرف دیکھا مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا پھر اس نے فوراً سہیل کے کندھے سے چاقو کھینچ لیا اور بھیڑ کی طرف رخ کیا۔

''چلو تم سب لوگ یہاں سے جاؤ..... اور ڈاکٹر کو بھیج دو۔''

لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ کیپٹن نے اپنی جیب سے رومال نکال کر زخم پر رکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہوئی تھی۔''

''پانچ ہزار روپے مانگ رہا تھا جب میں نے انکار کیا تو دھمکیاں دینے لگا کہ ساحل پر اترتے ہی پکڑوا دوں گا وغیرہ وغیرہ جب میں نے برا بھلا کہا اور کہہ دیا کہ اس کی جو مرضی میں آئے کرے تو اس نے چاقو نکال لیا بلکہ مار بھی دیا میں کیا کرتا مجبوراً پستول چلانا پڑا۔''

''ہوں!'' کیپٹن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تنویر کے بارے میں پہلے بھی شکایتیں مل چکی ہیں وہ پہلے بھی مسافروں کو اسی طرح تنگ کر چکا تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔''

اتنے میں کیبن کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر بائیں ہاتھ میں بیگ..... اٹھائے اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر ان کے کندھے پر زخم ہے اسے دیکھیے۔ میں لاش اٹھوانے کا انتظام کرتا ہوں۔'' کیپٹن ڈاکٹر سے مخاطب ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر سہیل کی جیکٹ اتاری پھر قمیض بھی اتارنے لگا تھا کہ سہیل نے روک دیا۔

''ڈاکٹر قمیض نہیں اتاریے بلکہ اوپر سے پھاڑ کر ڈریسنگ کر دیجیے۔ میں بعد میں بدل لوں گا۔ اس وقت تکلیف زیادہ ہے۔ قمیض اتارنے سے اور بڑھ جائے گی۔''

ڈاکٹر نے قمیض کو شانے پر سے پھاڑا۔ زخم دھو کر ڈریسنگ کر دی اور گلے میں پٹی ڈال کر ہاتھ اس میں لٹکا دیا۔ پھر اپنے بیگ سے تین مختلف قسم کی گولیاں نکالیں اور سہیل کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ گولیاں کھا لیجیے مسٹر سہیل اور لیٹ جائیے ان سے آپ کی تکلیف بھی کم ہو جائے گی اور آپ سو بھی جائیں گے۔''

سہیل نے گولیاں کھا لیں اور بستر پر لیٹ گیا اس مرتبہ صرف ایک ہی ہاتھ سر کے نیچے تھا۔

☆☆☆

اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور اب کوٹ پہن رہا تھا۔ پورے بازو میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں آخر اس نے کوٹ پہن ہی لیا۔ پستول نکال کر چیک کیا۔ جو چیمبر خالی تھا' اس میں نئی گولی ڈالی اور کوٹ کی داہنی جیب میں رکھ لیا۔ اب وہ کرسی پر بیٹھا کپتان کا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس سے کہہ کر گیا تھا کہ ہم دو بجے پہنچنے والے ہیں۔ لہٰذا وہ تیار ہو جائے۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد کپتان آیا اور سہیل کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا..... راہداری طے کر کے یہ لوگ زینے پر پہنچے جو نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر دونوں ایک بڑے ہال میں پہنچے جو اوپر سے کھلا ہوا تھا۔ یہاں کارگو رکھا جاتا تھا لیکن اس وقت وہاں کچھ نہیں تھا۔

''مسٹر سہیل آپ یہ پیٹی دیکھ رہے ہیں۔'' کپتان نے لکڑی کی ایک قد آدم خالی پیٹی کی طرف اشارہ کیا جو ایک طرف سے کھلی ہوئی تھی۔

''آپ کو اسی پیٹی میں بند ہو کر شہر پہنچنا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ابھی آپ اس پیٹی میں بند کر دیے

جائیں گے۔ پھر کرین کے ذریعے آپ کو ساحل پر اتار دیا جائے گا۔ وہاں ایک پک اپ پر میرے آدمی آپ کو شہر پہنچا دیں گے' شہر میں ایک گودام ہے۔ وہاں آپ کو پیٹی سے نکالا جائے گا۔ پرسوں دس بجے اس گودام سے اسی طرح واپس یہاں پہنچا دیا جائے گا آپ کو ہر حالت میں دس بجے تک وہاں پہنچ جانا ہے کیونکہ اس کے بعد میرا کوئی آدمی وہاں نہیں رہے گا اور گیارہ بجے جہاز بھی ساحل چھوڑ دے گا۔''

''ٹھیک ہے..... دو دن میرے کام کے لیے کافی ہیں۔'' سہیل نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''چلیے تو پھر پیٹی میں کھڑے ہو جایئے۔''

سہیل آگے بڑھا اور پیٹی میں داخل ہو گیا پیٹی اس کے قد سے بڑی تھی' اس لیے وہ آرام سے کھڑا ہو گیا۔ پیٹی میں ہک بھی لگے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاص اسی مقصد کے لیے بنوائی گئی ہو اس کے اندر داخل ہونے کے بعد دو آدمیوں نے ایک تختہ اٹھایا اور اس کو پیٹی کے کھلے ہوئے حصے پر رکھ کر کیلوں سے جڑ دیا..... پیٹی پر چاروں طرف 'مجھے سیدھا رکھیے اور احتیاط سے اٹھایئے' لکھا ہوا تھا۔ تختے کی جڑائی کے بعد کیپٹن نے اشارہ کیا اور کرین نے پیٹی اٹھانی شروع کر دی۔

ساحل پر ایک کھلی ہوئی پک اپ تیار کھڑی تھی جس کے قریب تین آدمی موجود تھے پیٹی کو جیسے ہی گاڑی پر بار کیا گیا وہ تینوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

پیٹی کے تختوں کے درمیان کافی جگہ تھی جس کی وجہ سے سہیل کو ہوا بھی مل رہی تھی اور وہ چاروں طرف آسانی سے دیکھ بھی سکتا تھا۔

گاڑی کو چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی تھی مگر شہر کا کوئی پتا نہ تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی نے پکی سڑک بھی چھوڑ دی اور کچے میں مڑ گئی۔ سہیل کو مسلسل دھچکے لگ رہے تھے۔ پھر اچانک گاڑی رک گئی۔ سہیل الجھن میں پڑ گیا۔ یہ تو ریت کے ٹیلوں سے ڈھکا ہوا کوئی ویرانہ تھا ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے سوچا اور پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ پھر کچھ اس قسم کی آواز آئی جیسے کوئی کیلیں نکال رہا ہو جلد ہی تختہ الگ ہو گیا۔

''ہینڈز اپ!'' سہیل نے بڑی پھرتی سے پستول کا رخ اپنے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف کر دیا اور بولا۔ ''چلو ایک طرف ہٹو۔'' پھر وہ پک اپ سے نیچے کود گیا لیکن جیسے ہی اس کے پیر زمین سے لگے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا انجانے میں چوٹ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے زمین بوس ہوتے ہی وہ تینوں اس کی طرف جھپٹے۔ جیب میں جتنی بھی نقدی موجود تھی نکال لی اور ایک پک اپ میں بیٹھ کر یہ جا' وہ جا۔

کافی دیر بعد اس کو ہوش آیا اس نے گھبرا کر اپنی پسلی ٹٹولی' چابی اپنی جگہ موجود تھی پھر اس نے پستول ڈھونڈا وہ بھی ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے بازو میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے اس نے دانت پر دانت جما لئے۔ بڑی مشکل سے کھڑا ہوا جھک کر پستول اٹھایا اور ایک طرف چل دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ان تینوں آدمیوں نے اس کے ساتھ یہ حرکت کیوں کی۔ وہ تھے تو جہاز ہی کے آدمی ان کا تعلق دشمن سے ہرگز نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوتا تو وہ چابی تلاش کرتے مگر انہوں نے صرف نقدی اڑا لینے پر اکتفا کیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس قسم کی حرکتیں ان لوگوں کے ساتھ کرتے ہوں جو غیر قانونی طور پر دوبئی آئیں ظاہر ہے ایسے لوگ فریاد کے لیے پولیس کے پاس نہیں جا سکتے وہ سوچتا رہا اور چلتا

رہا جیسے ہی وہ ایک موڑ پر گھوما اسے اپنے سامنے شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

☆☆☆

''اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوئی۔'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں اپنے آپ سے کہا۔ ''پہلے بھی دادا نے لوگ بھیجے تھے مگر وہ تو ہمیشہ وقت پر پہنچ گئے اس مرتبہ نہ جانے کیا بات ہو گئی۔''

سمیعہ بھی غضب تھی.....! سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں پھر اس پر جسم ایسا متناسب کہ نظر پڑے تو اس وقت تک نہ ہٹے جب تک کوئی دوسرا ٹھوکا نہ دے لباس کے معاملے میں بھی کافی باسلیقہ تھی۔ ہمیشہ چست ترین لباس پہنتی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہن کر سلوایا ہو خاصا وسیع کاروبار تھا۔ کیپٹن دارا کی کمیشن ایجنٹ تھی۔ اس کے بھیجے ہوئے لوگ پہلی رات اسی کے ہاں گزارتے تھے۔ اس طرح اس کا معاوضہ دوگنا ہو جایا کرتا تھا۔ کمیشن کے ساتھ ساتھ رات کا ایڈوانس الگ پھر خالی اوقات میں شہر..... بڑے حلقوں میں وہ کافی پسند کی جاتی تھی۔

اس نے بیٹھے بیٹھے برابر کی میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا ابھی پیکٹ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر کھڑے ہوئے نوجوان کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''اف! ایسا شاندار نوجوان تو برسوں ہی میں آتا ہے۔'' اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''اور یہاں کے شیخ..... ان میں تو بس بھوسا ہی بھرا ہوتا ہے۔''

اس نے پہلے سے زیادہ گہری نظروں سے نوجوان کا جائزہ لیا اور محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ نوجوان کچھ پریشان تھا۔ چہرے پر سفید پھیلی ہوئی تھی اور جسم کانپ رہا تھا۔

''میں..... میں سہیل ہوں اور مجھے کیپٹن دارا نے بھیجا ہے۔'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور الفاظ بڑی مشکل سے نکل رہے تھے۔

''آؤ! اندر آ جاؤ..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' پھر اچانک اس کی نظر سہیل کی قمیض پر پڑی جو خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہو کر بولی۔ ''تم تو زخمی معلوم ہوتے ہو۔''

''ہاں..... چاقو کا زخم ہے راستے میں لٹیرے مل گئے تھے۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا سمیعہ نے فوراً اسے سہارا دیا۔ اپنا بایاں ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈالا اور اس کا ہاتھ اپنے شانوں پر پھیلا کر سہارے سے مسہری تک لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد سہیل کی سانسیں کچھ درست ہوئیں تو اس نے کہا۔

''میں اپنا زخم دھونا چاہتا ہوں۔''

''میں یہیں دھو دیتی ہوں۔'' سمیعہ کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور تھا۔

''نہیں نہیں میری حالت اتنی خراب نہیں کہ تمہیں تکلیف دوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی ایک کونے میں واش بیسن لگا ہوا تھا۔ ابھی اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور اس کا انجام۔ ایک دھماکہ جو اس نے گرنے سے ہوا تھا سمیعہ مسکراتی ہوئی اٹھی۔ پہلے ہیٹر آن کر کے پانی رکھا پھر سہیل کے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے تھوڑا سا اٹھایا اور گھسیٹتی ہوئی کرسی تک لے گئی۔ اتنے بھاری آدمی کو اور وہ بھی بے ہوشی کی حالت میں کرسی پر ڈالنا اچھا خاصا مسئلہ تھا لیکن اس نے یہ مرحلہ بھی طے کر ہی لیا اور کسی نہ کسی طرح سہیل کو کرسی پر بٹھا دیا اس کھینچا تانی میں زخم

سے خون پھر جاری ہو گیا تھا اس نے پہلے سہیل کا کوٹ پیچھے کیا پھر قینچی سے قمیض شانے پر سے کاٹ دی' پانی گرم ہو چکا تھا اس نے زخم دھو کر ڈریسنگ کر دی۔

تھوڑی دیر بعد سہیل نے آنکھیں کھولیں۔ سمیعہ مسہری پر نیم دراز اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا حال ہے۔'' سمیعہ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہاں مسہری پر آ جاؤ۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اٹھا نہیں جا رہا ہے۔''۔ سہیل کی آواز سے نقاہت کا احساس ہوتا تھا۔

سمیعہ مسہری سے اتری۔ ''لاؤ اپنا ہاتھ مجھے دو۔'' یہ کہ کر وہ جھکی اور سہیل کا بازو اپنے شانوں پر پھیلا لیا۔ ''اب اٹھو۔''

سہیل نے کھڑے ہونے کی کوشش کی..... سمیعہ نے اسے اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ آخر وہ کھڑا ہو گیا..... سمیعہ اس سے بالکل لپٹی ہوئی تھی' اس کے بدن کی خوشبوئیں سہیل کو معطر کر رہی تھیں مگر اسے تو اپنا ہی ہوش نہیں تھا کوئی اور ہوتا تو کیا کچھ نہ کر بیٹھتا..... وہ مسہری پر پہنچ کر گر گیا سمیعہ نے اسے سیدھا کیا اور چادر گردن تک اڑھا دی پھر اپنے پرس میں سے دو گولیاں نکالیں اور اس کو کھلا دیں۔

سہیل کو ہلکا ہلکا بخار ہو گیا تھا۔ رات میں بخار اور تیز ہو گیا ساتھ ہی ساتھ سرسامی کیفیت بھی طاری ہوتی گئی۔ جیسے جیسے بخار کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا ہذیان بکنے کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ سمیعہ سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی خاموشی سے سنتی اور سگریٹ کا دھواں اڑاتی رہی۔ سہیل نے رشید کی موت سے اسٹارٹ لیا اور اب تک کے تمام واقعات دہراتا چلا گیا۔

سہیل کی آنکھ کھلی تو سمیعہ سامنے کرسی پر پڑی سو رہی تھی۔ اس کے سونے کا انداز کچھ اتنا پرکشش تھا کہ سہیل بےخود ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اچانک اس کی چیخ نکل گئی..... بازو میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی تھی..... شاید اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی تھی..... چیخ سے سمیعہ کی آنکھ کھل گئی..... اس نے اپنی خمار آلود نگاہیں اوپر اٹھائیں اور سہیل مسحور ہو گیا اسے اپنی تکلیف کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا ہوا.....'' جلترنگ سا بجا۔

''کچھ نہیں..... ہاتھ دب گیا تھا۔'' وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا بولا۔

''اب کیسی طبیعت ہے۔'' سمیعہ نے کھڑے ہوتے ہوئے پلکیں گرائیں۔ اس کی انگڑائی کچھ ایسی ہی قیامت خیز تھی۔

''ٹھیک ہے بخار بھی اتر گیا اور اب درد بھی کم ہے۔''

''بینک کب جاؤ گے۔'' اس نے چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا بینک۔'' سہیل چونک پڑا۔

''وہی جس میں پچاس ہزار ڈالر رکھے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' سہیل کے منہ سے بےساختہ نکلا۔

''خود ہی پوری کہانی سنائی اور اب پوچھتے ہو کیسے معلوم ہوا۔''

سہیل چند لمحے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آہستہ سے کہا۔ ''گیارہ بجے جاؤں گا۔''

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد سہیل پھر لیٹ گیا۔ سمیعہ اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔

''بینک سے واپس کب آؤ گے۔ میں انتظار کروں گی۔'' سمیعہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''بس کام ختم ہوتے ہی آجاؤں گا......
اور ہاں! ایک قمیض اور ایک کوٹ کی ضرورت ہے۔''

''قمیض تو ہے لیکن کوٹ نہیں ہے...... ہاں ایک جیکٹ ہے بعض لوگ اپنے کپڑے بھول جاتے ہیں۔''

''چلے گی بس تم جلدی سے نکال لاؤ۔''

''تھوڑی دیر اپنے پاس بیٹھنے تو دو۔'' سمیعہ نے منہ بنایا۔

''بعد میں! پہلے کام ہو جائے۔''

گیارہ بجے سے پہلے ہی سہیل تیار ہو گیا۔ قمیض تو اس کے جسم پر ٹھیک آ گئی مگر جیکٹ کچھ چھوٹی تھی اس لیے بٹن نہیں لگ سکے۔ اس کا ہاتھ گلے میں ایک پٹی کے ذریعے لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کی انگلی میں بھی پٹی بندھوالی تھی۔ سمیعہ نے جب اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ بینک میں دستخط کرنے پڑتے ہیں لہٰذا اگر زخمی ہاتھ سے گڑبڑ بھی ہو جائے تو چلے گی' اس نے پستول جیکٹ کی جیب میں رکھا اور روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''احتیاط سے...... ہاں!'' سمیعہ نے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی باہیں ڈالیں اور سہیل نے گردن جھکا کر اس کے مرطوب ہونٹوں کی گرمی اپنے ہونٹوں میں جذب کر لی۔

وہ جس وقت دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کی نظریں کونے میں کھڑے گراہم کے ساتھی پر پڑیں...... وہ چونک پڑا مگر اس نے خود کو سنبھالنے میں بمشکل چند لمحے صرف کیے اور اطمینان سے اس کی طرف بڑھا اس نے سہیل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو خود بھی اس کی طرف بڑھا' سہیل اس کے قریب پہنچا اور بغیر کچھ کہے سیدھے ہاتھ کا گھونسہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا...... وہ بغیر کوئی آواز نکالے ڈھیر ہو گیا دروازے میں کھڑی ہوئی سمیعہ نے یہ منظر دیکھ کر تالیاں بجائیں...... سہیل نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

لاکر روم بینک کے تہہ خانے میں بنا ہوا تھا۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک لوہے کا جنگلا تھا بالکل حوالات کی طرح! جنگلے کے پیچھے ایک ڈیسک کلرک بیٹھا تھا جس کے برابر میں ایک رائفل بردار چوکیدار کھڑا تھا۔

''میں اپنے لاکر میں سامان نکالنا چاہتا ہوں۔'' سہیل نے کلرک سے کہا۔

''نام اور نمبر بتائیے۔''

''ایک سو سترہ...... رشید عاقل۔''

کلرک نے قریب رکھے ہوئے کارڈ کیبنٹ سے ایک کارڈ نکالا اسے دیکھا اور چوکیدار کو اشارہ کیا۔ اس نے جنگلے کا دروازہ کھول کر سہیل کو اندر بلا لیا کلرک نے سہیل کا نیچے سے اوپر تک جائزہ لیا۔

''آپ کا ہاتھ زخمی معلوم ہوتا ہے ہاں

یہ کیا رشید؟''

''ہاں! کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

''اوہ......! مجھے یہ جان کر افسوس ہوا۔ آپ کا ہاتھ زخمی ہے لیکن اس کارڈ پر آپ کے دستخط بہت ضروری ہیں۔''

سہیل نے غور سے کارڈ کو دیکھا۔ اس پر رشید کے دستخط پہلے سے موجود تھے۔ اس نے ڈیسک سے قلم اٹھایا اور اوپر والے دستخط دیکھتے ہوئے تقریباً ویسے ہی دستخط نیچے کر دیے۔ کلرک نے کارڈ اٹھا کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے رکھ لیا۔

''آئیے۔'' اس نے میز کی دراز سے ایک چابی نکالی۔

میز کے پیچھے ایک اور سلاخوں والا دروازہ تھا اسے کھول کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے...... کمرے میں ایک طرف والٹ کا

دروازہ تھا جس پر نمبروں والا تالا لگا ہوا تھا۔

کلرک نے آگے بڑھ کر نمبر ملائے پھر دروازے کے برابر دیوار پر لگا ہوا لوہے کا پہیہ گھمایا۔ جس سے دروازہ کھل گیا۔ اندر کمرے میں ایک طرف بہت سے کیبن بنے ہوئے تھے اور باقی تین اطراف میں لاکرز پھیلے ہوئے تھے۔ کلرک ایک لاکر کے قریب پہنچا اور چابی لگا کر گھمائی لاکر کھل گیا اس میں ایک ٹین کا بکس رکھا تھا سہیل نے وہ بکس نکال لیا۔

''یہ سامنے کیبن بنے ہوئے ہیں آپ وہاں جا کر اپنی چیزیں بکس میں سے نکال لیں۔'' کلرک نے لاکر بند کرتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ کام مکمل کر چکیں تو یہ بٹن دبا دیجئے گا۔'' اس نے دروازے کے پاس لگے ہوئے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں دروازہ کھول دوں گا۔''

سہیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کلرک نے والٹ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر بند کر دیا۔ سہیل نے ایک کیبن میں جا کر بکس کھولا جو اوپر تک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

☆

دوفسکی روز نیف ساحل ہی سے سہیل کے پیچھے لگا ہوا۔ تھا اس کو سمیعہ کے گھر تک پہنچا کر وہ سیدھا بینک آ گیا تھا اور کل سے اب تک بینک کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ اس نے سہیل کے اندر جانے کے بعد تھوڑی دیر انتظار کیا اور پھر وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ ایک لاکر اپنے نام کرائے پر لیا اور کارڈ لے کر نیچے تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ ڈیسک کلرک نے کارڈ لے کر چابی اور لوہے کا ایک بکس اس کو دیا اور اس کے ساتھ لاکرز روم میں پہنچ کر بولا۔ ''آپ کیبن میں جا کر اپنا سامان اس بکس میں بند کر دیں۔ پھر گھنٹی بجا کر مجھے بلا لیجئے گا۔'' اس نے گھنٹی کا بٹن دکھایا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

دوفسکی نے غائر نظروں سے کیبنوں کی طرف دیکھا مگر وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ سہیل کس کیبن میں ہے۔ وہ ایک کیبن میں گھسا اور دروازے میں جھری پیدا کر کے کھڑا ہو گیا پستول اس کے ہاتھ میں تھا کچھ ہی دیر بعد ایک کیبن کا دروازہ کھلا سہیل بکس اور کاغذ کا تھیلا بغل میں دبائے باہر نکلا۔

''ٹھہرو.....!'' دوفسکی نے باہر نکل کر اس کو ٹوکا۔ سہیل اچھل پڑا پھر پلٹ کر دیکھا۔ ''کون ہو تم..... اور یہ کیا مذاق ہے۔'' اس کا اشارہ پستول کی طرف تھا۔

''جواب نہیں معصومیت کا!..... یہ تھیلا مجھے دیدو۔'' دوفسکی نے سہیل کے بغل میں دبے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم ہو کون..... ویسے تم گولی نہیں چلا سکتے پکڑے جاؤ گے۔'' سہیل غیر محسوس انداز میں دروازے کی طرف کھسک رہا تھا۔

''میں دوفسکی ہوں دوسری بات! والٹ کسی بھی بینک کے ہوں ہمیشہ ساؤنڈ پروف ہوتے ہیں۔ اس لیے میرے پکڑے جانے کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔''

سہیل اتنی دیر میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا کرتے ہو.....'' دوفسکی چلایا اور فائر کر دیا۔ گولی لگتے ہی سہیل بغیر گھنٹی بجائے زمین پر گر پڑا۔ مگر گرتے گرتے بھی اس نے اپنا پستول نکال لیا اور دوفسکی پر فائر کر دیا۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں لگی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ زمین پر پڑے پڑے سہیل کو احساس ہوا کہ گولی تو اس کے لگی ہی نہیں وہ حیران ہو کر اٹھا۔ خود کو ٹٹول کر دیکھا صحیح سالم تھا۔ دیوار کو دیکھا وہاں بھی کوئی نشان نہیں تھا بڑا پریشان ہوا۔ آخر گولی کہاں گئی' اس نے تھیلا اور بکس اٹھایا۔ بکس میں کوئی چیز

بولی۔ اس نے بکس کو دیکھا تو اس میں ایک طرف سوراخ تھا اور دوسری طرف گڑھا پڑ گیا تھا۔ اس نے بکس کو چوم لیا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس نے بکس کو دوفسکی کی لاش پر رکھا اور لاش کو کھینچ کر کیبن میں بند کر دیا۔ بٹن دبا کر کلرک کو بلایا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

بینک کی سیڑھیاں اتر کر اس نے سواری کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں..... سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی..... اس نے سوچا کہ آگے بڑھ کر شاید کوئی سواری مل جائے..... ابھی اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اس کے دماغ میں چاند سورج' مریخ' زہرہ' پتا نہیں کیا کیا طلوع ہوئے اور غروب ہو گئے۔ سر پر پڑنے والی ضرب کچھ اتنی ہی شدید تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہسپتال میں پایا۔ سامنے کرسی پر گراہم بیٹھا ہوا تھا..... وہ سہیل کو ہوش میں دیکھ کر اس کے قریب آیا۔

''کیسے حال ہیں۔''

سہیل کچھ نہ بولا خاموشی سے اس کو گھورتا رہا۔

''تم جیسا بے وقوف آدمی میں نے نہیں دیکھا۔'' گراہم کا لہجہ غصیلا تھا۔ ''وہ چابی ہمیں دیدیتے تو آرام سے اپنے گھر پر ہوتے۔''

''لیکن میں وہ کاغذات اپنی حکومت تک پہنچانا چاہتا تھا۔''

''ہم نے بھی وہ کاغذات تمہاری ہی حکومت کو پہنچائے ہیں۔ ہماری اور تمہاری حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ ان کاغذات میں اسی کی تفصیلات تھیں۔ ان تفصیلات کا وقت سے پہلے ظاہر ہونا تمہارے ملک کے لیے بہتر نہیں تھا اسی لیے ہم اور خود تمہاری حکومت ان کے حصول کے لیے بے چین تھے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ کاغذات صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئے۔'' سہیل کے لہجے میں اطمینان تھا۔

''یہ لو اپنی تھیلی..... اس میں وہ ساری رقم ہے جو تم نے بینک سے نکالی تھی ہم تمہیں پچاس ہزار بھی دے سکتے تھے تم ہم سے کہتے تو.....'' گراہم نے کاغذات کی تھیلی سہیل کی طرف بڑھائی۔

''ایک بات اور مسٹر گراہم..... آپ کو میرے یہاں آنے کا پتا کیسے چلا۔''

''شہلا سے..... وہ اس وقت ہوٹل الفانسو میں ٹھہری ہوئی ہے اور میرے آدمی اس کی حفاظت کر رہے ہیں..... مجھے خطرہ تھا کہ کہیں ڈوفسکی کے آدمی اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔''

گراہم نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور سہیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم یہاں سے ڈسچارج ہو تو اس آدمی سے مل لینا یہ تمہیں تمہارے ملک پہنچا دے گا۔''

''ایک آخری کام اور مسٹر گراہم..... اس رقم میں سے دس ہزار ڈالر نکال کر سمیعہ کو پہنچا دیجیے..... وہی لڑکی جس کے پاس میں ٹھہرا تھا۔''

گراہم نے تھیلے سے رقم نکالی اور فرش پر رکھے ہوئے ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تحفہ کیپٹن دارا نے بھیجا ہے جو تم اس کے جہاز پر چھوڑ آئے تھے۔''

وہ سوٹ کیس..... کرسی پر رکھ کر خدا حافظ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

سہیل نے آنکھیں بند کر لیں اور شہلا کے تصور میں گم ہو گیا۔

شاطر صحافی

شاہین اقبال

اس صحافی کا قصہ جسے
ایک لاش سے قاتل تک بڑا
ہی خوف ناک سفر کرنا پڑا....
وہ صحافی تھا لیکن انتہائی
شاطر.....

جرائم کے خلاف قانون پسندوں کی شان دار جدوجہد ... ایک مکمل ناول

صبح کے چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ ہمارے اخبار کے پبلشر اور ایڈیٹر بشپ نے دفتری اوقات کے خاتمے کا اعلان کیا تو ہم نے اپنی اپنی ہفتہ وار تنخواہ وصول کی اور باہر کی جانب چل دیے۔ صدر دروازہ عبور کرنے سے قبل بشپ نے کوٹ کی جیب سے ایک شیشی نکال کر وہسکی کے دو، تین بڑے بڑے گھونٹ لیے۔

''مجھے آج کچھ رقم چاہیے۔'' میرے ساتھی جیمز نے دبی زبان میں اعلان کیا۔

''ہوں۔'' بشپ چلتے چلتے رک کر غرایا۔ ''کیا ہفتہ وار تنخواہ کے علاوہ۔۔۔؟ یاد رکھو میں عنقریب تمہیں شوٹ کرنے والا ہوں۔''

''اس خبر کی سرخی میں لگاؤں گا۔ کیوں کہ شعبہ قتل کی واردات میرے ذمہ ہے۔'' میں نے مسکرا کر لقمہ دیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ دھمکی وہ کئی بار دے چکا ہے اور اس پر کبھی عمل نہیں کر سکتا۔ پھر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ جیمز کو کبھی شوٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی جسے متوازن رکھنے کے لیے وہ منقش دستے والی ایک چھڑی استعمال کرتا تھا۔ اس لیے ریوالور نکالنے سے پہلے ہی جیمز یقیناً بھاگ کر اس دھند میں غائب ہو جاتا جو لندن کی فضا پر ہر وقت ڈیرا ڈالے رکھتی ہے۔

کہر میں ڈوبی ہوئی دھندلی سی اسٹریٹ لائٹ میں آئینے کی مانند چمکتا ہوا بشپ کا گنجا سر چلتے چلتے اچانک ہی ایک موڑ پر رک گیا۔

''اڈی۔۔۔!'' اس نے چونک کر مجھے پکارا۔ ''یقیناً کوئی شخص دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔''

دھند اتنی شدید تھی کہ ہمیں تین فٹ کے دائرے سے باہر کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن بشپ کی سماعت خطرناک حد تک تیز تھی۔ چنانچہ میں اور جیمز بھی کان لگا کر سننے لگے۔

اسی اثنا میں لمبے بال منہ پر بکھرائے ہوئے ایک طویل قامت شخص سڑک کی دوسری سمت سے بھاگتا ہوا اچانک کسی بھوت کی مانند دھند میں سے نمودار ہوا اور سیدھا بشپ سے آن ٹکرایا۔ اس کی منقش دستے والی چھڑی ہاتھ نے نکل کی پختہ فٹ پاتھ پر گر گئی اور وہ ''کون ہے۔۔۔'' کی تکرار کرتا ہوا میرے شانے سے ٹک گیا۔

''بل کہاں گیا۔۔۔ کہاں ہے وہ؟'' بال چہرے سے ہٹا کر وہ بے ترتیب سانسوں کے ساتھ بمشکل ان الفاظ کو ادا کر سکا اور ہم تینوں کے چہرے غور سے دیکھنے لگا۔ ''تم نے بل کو تو نہیں دیکھا۔''

طویل قامت نے دوبارہ دریافت کیا۔

''کیسے۔۔۔؟'' بشپ نے بدقت تمام اپنی چھتری اٹھائی اور چھتری اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ ''دیکھا ہے۔۔۔ بالکل دیکھا ہے۔ ابھی ایک منٹ پہلے وہ وہاں تھا۔ بشپ نے فٹ پاتھ کی روشن جگہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس نے تمہارے لیے ایک پیغام بھی دیا ہے۔''

قریب تھا کہ وہ شخص سنجیدگی سے استفسا کرنے لگتا مگر جیمز کے حلق سے ایک بے اختیار قسم کا قہقہہ نکل گیا اور طویل قامت شخص بشپ کے کندھے سر کے لیے ایک عدد ناقابل اشاعت لفظ ادا کر کے سڑک کے نشیب میں دوڑتا چلا گیا۔ جلد ہی وہ دھند کی آغوش میں غائب ہوگیا۔

''تم کبھی ایک اچھے اخبار نویس نہیں بن سکتے۔'' بشپ نے اپنا تمام تر غصہ جیمز پر نکالتے ہوئے کہا۔ ''فرض کرو کہ اس شخص کے پاس کوئی اچھی سی کہانی موجود ہوتی۔ مثلاً بل شاید کسی کو قتل کر کے بھاگا ہو یا پھر کسی عورت کا قصہ ہو۔ یہ بھی نہیں تو رقومات اور جواہرات کے سرقے والا مفروضہ تو کہیں نہیں گیا۔ مگر تم نے بے موقع دانت نکال کر بات بگاڑ دی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی چھتری کے سہارے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

''چھوڑو یار! مجھے تو یہ شخص کوئی شرابی دکھائی دیا تھا۔ ذرا زیادہ چڑھا گیا ہوگا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''میں ثابت کرسکتا ہوں کہ اس نے شراب نہیں پی تھی کیوں کہ اس کے منہ سے شراب کی بو نہیں آرہی تھی۔'' بشپ نے بھاری لہجے میں کہا۔۔۔ لیکن میں نے اس کے دعوے کی تائید یا تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں اپنی سیاہ سیڈان جس گیراج میں کھڑی کرتا تھا۔ وہ اخبار کے دفتر سے ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔ ہر روز پیدل وہاں تک جا کر گاڑی حاصل کرنا اور پھر بشپ کے ساتھ گھر جانا میرے معمول میں شامل تھا۔

گیراج پہنچ کر جیمز ہم سے رخصت ہوگیا تو میں نے جیسے ہی گاڑی نکالی۔ بشپ بڑبڑایا۔ ''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ آج کی شدید کہر میں ڈسکی برج پر سے گزرنے والی کسی گاڑی کو حادثہ ضرور پیش آیا ہوگا۔''

میں نے ایک موڑ کاٹ کر ڈسکی برج جانے والی سڑک پر گاڑی کو دوڑانا شروع کردیا۔ شہر کی گنجان آبادی والی فضا کی بہ نسبت اس علاقے میں کہر مزید گہرا اور سیاہی مائل تھا۔ انتہائی محتاط انداز سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں برج پر پہنچا ہی تھا کہ پل کے وسط میں مختلف گاڑیوں کی دھندلی سی روشنیاں دکھائی دیں۔ بشپ کی پیشن گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ پل کے ایک جانب کا جنگلہ ٹوٹ کر گرا ہوا تھا۔ اوپر کھڑے پولیس والوں کی سرچ لائٹس میں دریا کا پانی قدرے صاف اور شفاف دکھائی دے رہا تھا اور پانی سے بھی زیادہ واضح نظر آنے والی ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں جو دریا میں روشن تھیں۔ گاڑی کا کچھ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن تیرنے کی وجہ سے بالائی حصہ نظر آرہا تھا۔

''ایک بہترین خبر۔'' بشپ نے میرا بازو تھام لیا تو میں نے ناچار بریک لگائے اور گاڑی روک کر اتر آیا۔ دوسری جانب سے اپنی مصنوعی ٹانگ اور چھتری کے سہارے بشپ بھی کار سے اتر چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سارجنٹ برڈاک نے ایک لمبا سا سلام جھاڑا اور ہمارے قریب چلا آیا۔

''ہیلو بشپ۔۔۔!'' سارجنٹ نے مسکرا کر کہا۔

''تم شاید ایک عدد ڈیم بننے کے منتظر ہوتا کہ سارا پانی ادھر نکل جائے تو تم اس گری ہوئی گاڑی کے اندر جھانک سکو۔ یہی بات ہے نا؟'' بشپ نے سلام کا جواب دیے بغیر اسے ایک عدد جھاڑ پلائی تو وہ قدرے خجل سا ہوگیا۔

''ایڈی نیچے اترے گا۔۔۔ دو سپاہی اس کے

شانوں کے گرد رسی باندھ کر مضبوطی سے تھامے رکھیں۔'' بشپ نے بغیر سوچے سمجھے اعلان کر دیا اور میں ''نا، نا'' ہی کرتا رہ گیا۔

''ارے جاؤ برخوردار!'' بشپ نے مزید گرہ لگائی۔ ''یہاں ارد گرد کوئی بھی ایسی خاتون موجود نہیں جو تمہارے لیے اس خوب صورت چوکھٹے کو بھیگتے دیکھ کر ہنسنے لگے گی۔'' میرے گال تھپتھپا کر گویا اس نے میری رخصتی کا بھی اعلان کر دیا۔

فوراً ہی دو کانسٹیبل لپک کر نائیلون کی ایک مضبوط رسی نکال لائے اور اسے میری بغلوں کے نیچے سے گزار کر کس دیا۔ اب گویا میں اس خوامخواہ کے قضیے میں غرق ہونے کو تیار تھا۔

''ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ ایڈی!'' بشپ گویا کسی کھیل کا آغاز کر رہا تھا اور میں رسی کے سہارے نیچے اترنے لگا۔ ٹوٹے ہوئے جنگلے سے نیچے پانی صرف پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ جلد ہی میرے پاؤں ڈوبی ہوئی سطح پر جا کر جم گئے۔

''شاباش۔۔۔!'' اوپر سے بشپ کی حوصلہ افزائی نے ایک مرتبہ اور کانوں میں زہر گھولا۔ ''گاڑی کا اگلا دروازہ کھول ڈالو'' اس نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر کار کا دروازہ کسی اڑیل ٹٹو کی طرح جما ہوا تھا اور کسی طور کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اوپر سے پانی میں بھیگنے کے باعث اب مجھ پر کپکپی بھی طاری ہونے لگی تھی۔

بدقت تمام گاڑی کا شیشہ توڑنے میں کامیاب ہوا تو پانی کا ریلا مجھے بھی اندر لے جانے کو بضد ہونے لگا۔ اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے میں نے دروازے کا ہینڈل تلاش کیا اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دھند اور پانی مل جل کر میری بصارت کو بھی مفلوج کیے دے رہے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر ہاتھ پھیلایا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' کار سے منہ نکالتے ہوئے میں نے پل کی جانب دیکھ کر زور سے ہانک لگائی۔

''ذرا اچھی طرح دیکھو۔۔۔'' بشپ نے دیا۔

دبی زبان سے میں نے بشپ کی شان گستاخی کی اور پھر پانی کے ریلے میں اندر گھس گ نشست کے پیچھے ہاتھ پھیرنے سے میری انگلیاں ملائم چیز سے ٹکرائیں۔ یہ کسی کے نرم نرم بال تھے

''کوئی ہے۔'' میں نے نعرہ لگایا۔

''باہر کھینچ لاؤ۔ شاباش!'' بشپ اوپر کھڑا گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، میری قابل حالت سے بے خبر، احکامات صادر کر رہا تھا اور یہا رسی کے دباؤ، پانی کی یلغار اور سردی کی بے رحم مزا پرسی کے باعث میرے حواس جواب دے ر تھے۔

''خدا کے لیے مجھے اوپر کھینچو۔'' میں نے کا میں موجود جسم کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور گاڑی سے اوپر تک لے آیا۔

''اسے بھی ساتھ ہی لیتے آؤ۔'' بشپ نے ایک اور حکم دیا۔ فرمایا۔ ''شاباش ایڈی۔۔۔ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھالو۔''

قریب تھا کہ میں اس جسم کو دوبارہ دریا برد کر دیتا۔ مگر اسی لمحے رسی اوپر کھینچنے لگی اور میں اس بھیگے ہوئے بے حس و حرکت جسم کا منوں بوجھ اٹھائے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر میں نے اس جسم کو چھوڑ دیا۔

''یہ کون ہے؟'' بشپ مجھے نظر انداز کرتا ہوا اسے الٹا سیدھا کرنے میں مصروف ہو گیا اور میں کسی بھیگے ہوئے چوہے کی طرح ٹوٹے ہوئے جنگلے کے نزدیک، پختہ سڑک پر اوندھے منہ لیٹا رسی کی بندشیں کھلوانے میں مصروف ہو گیا۔

''ارے بریڈاک۔'' بشپ کی چہکار سنائی دی۔ ''اس شخص کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

پولیس مین بھی جھک کر اسے دیکھنے لگے

''یہ آدمی تو کل ہیڈ کوارٹر آیا تھا اور تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' بریڈاک کے نائب نے

انکشاف کیا۔ ''اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔''

''وہ دوسرا آدمی کس حلیے کا تھا۔'' بشپ کا اخبار نویسی والا تجسس بے دار ہونے لگا۔

''دوسرا آدمی۔۔۔'' سارجنٹ ستھورن کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''وہ لمبے قد، لمبے بالوں والا ایک شخص تھا۔ عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔''

اس اثناء میں برڈاک نے غیر متحرک جسم کی تلاشی لے کر ایک چرمی بٹوہ نکال لیا۔ اس میں چند بھیگے ہوئے کاغذات اور ایک تعارفی کارڈ بھی تھا۔ ''اس شخص کا نام بل ہے۔۔۔ بل ماربری پیشہ چیف انجینئر اور لینڈ سرویئر فروم اسٹیٹ انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''اوہ تو یہ ہے، وہ بل۔۔۔!'' بشپ نے انگلی اٹھا کر خلا میں دیکھتے ہوئے، تفکر آمیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب۔۔۔؟'' میں نے ناگواری سے دریافت کیا۔ پانی اب میرے کپڑوں سے گزر کر جوتوں میں جا رہا تھا اور میں سردی سے باقاعدہ لرزنے لگا تھا۔

''ارے ایڈی۔۔۔!'' وہ میری ناگفتہ حالت زار سے مکمل بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدستور سراغ رسانی میں ڈوبا ہوا کہنے لگا۔ ''ابھی نصف گھنٹے پیشتر وہ لمبے قد اور لمبے بالوں والا ایک شخص ہمیں راستے میں ملا تھا جو کسی بل نامی آدمی کی تلاش میں تھا۔'' وہ سارجنٹ برڈاک کی جانب مڑا۔ ''چونکہ بقول تمہارے بل نامی یہ شخص کل میری تلاش میں گھوم رہا تھا اس لیے اب یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کے قاتل اور وجہ قتل کو دریافت کروں۔''

''مگر میرا فرض کچھ اور ہے۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے بشپ کے کوٹ کے کالر تھام لیے۔ ''اور وہ یہ کہ اب میں تمہیں اس کی جگہ دریا برد کردوں۔''

''ایڈی۔۔۔!'' وہ چلانے لگا۔ ''میں تمہیں ایک اچھا رپورٹر بننے کی تربیت دے رہا ہوں اور تم ہو کہ۔۔۔'' مگر میں اس کے چیخنے چلانے پر کان دھرے بغیر اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی تک لایا اور دروازہ کھول کر اندر گرا دیا۔ پھر کار اسٹارٹ کر کے ہر ممکن تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

یہ اسی روز کا ذکر ہے کہ میں نے گھر جا کر برانڈی کے متواتر دو تین پیگ چڑھائے میں اپنے دفتر کے کیبن میں بیٹھا، بشپ کا انتظار کرتا رہا۔ اخبار کے مطابق آنجہانی بل ماربری کی کہانی کچھ یوں تھی کہ وہ گزشتہ روز نیوز ایجنسی میں بشپ کو تلاش کرتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا لیکن اس کے بعد بل کی لاش ہی منظر عام پر آسکی تھی اور اس کی موت گاڑی کے حادثے سے نہیں بلکہ سر کے اوپر لگنے والی ایک کاری ضرب کے نتیجے میں واقع ہوئی تھی۔

اخبار سے نظر ہٹا کر میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ سوا سات بجے تھے اور یہ بشپ کی آمد کا وقت تھا۔

''اٹھو ایڈی۔۔۔! ہم باہر چل رہے ہیں۔'' اس نے دفتر میں آتے ہی ہانک لگائی۔

''کہاں۔۔۔؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تمہیں ایک اچھا رپورٹر بنانا چاہتا ہوں۔'' اس نے جھلا کر پیشانی پر ہاتھ مارا۔

بادل ناخواستہ میں نے کاغذات سمیٹے اور فائل بند کردی۔

''منہ کیوں لٹکا رکھا ہے۔'' وہ غرایا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اس حسین چوکھٹے کو عورتیں بے حد پسند کرتی ہیں اور تم خود بھی ان میں گھرے رہنا چاہتے ہو۔۔۔ لہٰذا کسی بھی نوجوان خاتون سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے میں تمہارے اس پرکشش چہرے کا سہارا لینا نہیں بھولتا۔

''نوجوان خاتون۔۔۔'' میں نے اسے چھیڑتے ہوئے دریافت کیا۔

''ہاں۔۔۔ سنا تو یہی ہے کہ مقتول نوجوان بل کی بیوہ ایک نوعمر اور حسین عورت ہے۔''

''مقتول کی بیوہ۔۔۔؟'' میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''اس سے گفتگو کے لیے تو سارجنٹ برڈاک ہی مناسب ہے۔''

''لیکن ہم برڈاک سے پہلے ہی اس حسینہ کے حضور پہنچ جائیں گے، تمہارے توسط سے۔'' اس نے پھر میرے گال تھپتھپائے۔ ''اور اپنے اخبار کے لیے ایک خوبصورت سی سرخی نکال لائیں گے۔''

مجھے معلوم تھا کہ میں اس سے باتوں میں نہیں جیت سکتا۔ چنانچہ میری سیاہ سیڈان جلد ہی اس راستے پر دوڑنے لگی جس کی رہنمائی خود بشپ کلارک کر رہا تھا۔

وہ ایک قدیم طرز کی بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی عمارت تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک جانے والے لوہے کے جنگلے کے آخر میں ایک وسیع و عریض پھاٹک پر ''چیف انجینئر مل ماربری'' کی تختی اپنی پیشانی پر لٹکائے کسی عاشق کے نامراد دل کی طرح خالی خالی سا کھڑا تھا۔ عمارت اور اس کے وسیع احاطے میں لگے ہوئے درخت سبھی زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے تھے۔

سیاہ سیڈان سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے روک کر ہم دونوں اتر آئے اور کھلے گیٹ میں سے ہوتے ہوئے پورچ کو جانے والے راستے پر چلنے لگے۔ اس حویلی نما عمارت کا رنگ و روپ پھیکا پڑ چکا تھا۔ جگہ جگہ اینٹوں کی شکستہ دراڑوں میں سے سبزہ جھانک رہا تھا۔ یکا یک نیم تاریک احاطے میں سے ایک انتہائی خوف زدہ اور دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ ''نہیں۔۔۔ نہیں خدا کے لیے نہیں۔۔۔'' یہ ایک ایسی مردانہ آواز تھی جیسے کسی جنگلی جانور کے پنجے میں گرفتار کوئی معصوم خرگوش آخری بار خوف اور رحم سے بھرپور صدا بلند کرتا ہو۔۔۔ مگر اگلے ہی لمحے ایک مدھم سے فائر کی آواز نے رحم کا مطالبہ کرتی ہوئی اس آواز کو ایک دردناک چیخ میں تبدیل کر کے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور پھر ہر طرف ایسا سناٹا محیط ہو گیا گویا زندگی اپنی تمام تر صداؤں سمیت وہاں سے کوچ کر گئی ہو۔

ہم دونوں احمقوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ ہمیں مداخلت کا موقع ہی نہیں مل سکا لیکن پھر اسی وقت ایک تاریک کھڑکی میں سے ایک بے آواز سایہ لرزتا دکھائی دینے لگا۔

ہم بھی دبے قدموں احاطے کے دوسری طرف قدم اٹھانے لگے۔ اس سائے کا رخ عمارت کے بائیں جانب واقع گیراج کی طرف تھا اور ہم دونوں اسے دیکھنے میں اس بری طرح محو تھے کہ سامنے موجود سوئمنگ پول کا ہمیں اندازہ ہی نہ ہو سکا اور بشپ شڑاپ کی ایک بلند آواز کے ساتھ اس تالاب میں جا گرا۔ خاموش فضا میں وہ آواز بلاشبہ کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ فوراً ہی گیراج کے اوپر واقع ایک اپارٹمنٹ سے چند بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''ایڈی۔۔۔'' پانی میں بھیگا ہوا بشپ کسی گیلے خرگوش کی مانند اپنے جسم کو جھٹک کر مجھے پکارنے لگا۔ ''اس کا پیچھا کرو۔ جانے نہ پائے۔''

''اس کے پاس ریوالور ہے۔'' میں نے احتجاج کرنا چاہا۔۔۔ مگر اس کی تان ''تم کبھی اچھے رپورٹر۔۔۔'' والے جملے تک پہنچنے سے قبل ہی میں نے اس شخص کے پیچھے دوڑ لگانے ہی میں عافیت سمجھی۔

درختوں کا سایہ بے حد گھنا اور تاریک تھا۔ بارہا الجھتے، گرتے اور سنبھلتے ہوئے میں نے اخبار نویسی اور اچھے رپورٹر، دونوں پر کئی مرتبہ لعنت بھیجی اور دوڑتا ہوا عمارت کی پشت پر آ گیا۔ اس طرف بھی ویسی ہی گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ پھر اندر کہیں کوئی دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ کسی کے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس عجیب و غریب ڈرامے اور پراسرار نقل و حرکت کے باعث میں یہ تو جاننا چاہتا تھا کہ عمارت کی پشت پر آنے والا یہ شخص کون ہے۔۔۔ مگر بشپ کے نظریے کے مطابق اس کے سامنے پہنچ کر ہرگز

نہیں۔۔۔ بلکہ تاریکی میں چپ چاپ کھڑے رہ کر۔۔۔ خود بشپ نہ جانے اس وقت پیچھے کہاں رہ گیا تھا۔

قدموں کی تیز آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ آواز گیراج کے سامنے والے کھلے حصے سے آرہی تھی جہاں کسی درخت کا کوئی سایہ نہیں تھا بلکہ زرد اور بیمار چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

عمارت کے جس کونے میں، اس وقت میں کھڑا تھا۔ وہاں سے اس کا صدر دروازہ اور کسی قدر سامنے کا حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اسی جانب سے کوئی شخص گیراج ٹیرس سے نیچے کودا اور پھر شاید گیراج کے کھلے دروازے سے اندر جا گھسا یا کسی اور طرف نکل بھاگا کیوں کہ قدموں کی آہٹ دور ہوتی جارہی تھی لیکن ہلکی سی آہٹ گیراج کے اندر بھی تھی۔ گیراج کے اندر جو کوئی بھی موجود تھا میرے سامنے آئے بغیر اس کا کہیں اور نکل جانا ممکن نہیں تھا۔

یکایک گھنے درختوں کی طرف سے بشپ کی آواز سنائی دی ''ایڈی۔۔۔! تم کہاں ہو۔'' وہ بلند آواز سے مجھے پکار رہا تھا۔

''میں ادھر ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں بول پڑا۔

''اور۔۔۔ وہ کہاں ہے۔'' لفظ ''وہ'' پر اس نے خاصا زور دیا۔

''گیراج میں۔۔۔'' حماقت آمیز انداز میں مجھے کہنا پڑا۔ ''ادھر کیا ہوا ہے۔'' میں نے پوچھ لیا کیوں کہ اتنی دیر تک کی اس کی گمشدگی اور خاموشی معنی خیز تھی۔ وہ یقیناً سب کچھ معلوم کرکے ہی میری تلاش میں آیا تھا۔

''قتل۔۔۔'' وہ چلایا۔ ''اس پر نظر رکھنا اور جیسے ہی نکل کر بھاگنا چاہے بے دریغ فائر کر دینا۔'' بشپ نے بلند آواز میں ہدایات دیں اور لفظ ''فائر'' پر میں اپنی خالی جیبوں اور کھلے ہاتھوں کو دیکھتا رہ گیا۔ ریوالور نام کی کوئی چیز چونکہ میرے پاس نہیں تھی لہٰذا میں نے اس طرح کا خاکا اپنے خالی دائیں ہاتھ کی مدد سے بنایا اور ایک خیالی ریوالور گیراج کی سمت تان کر کھڑا رہا۔

''میں پولیس کو فون کرنے جارہا ہوں۔'' کھٹ کھٹ کرتی ہوئی بشپ کی چھڑی پختہ روش پر کار کی جانب چلنے لگی کیوں کہ ہنگامی ضرورت کے تحت ہم نے سیڈان میں فون بھی لگوا رکھا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ کیا واقعی اندر موجود شخص کو اس فریب کا اندازہ نہیں ہو پائے گا کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اگر اس نے خود ہی گولی چلا دی تو۔۔۔ مارے خوف کے میری پیشانی سرد پسینے سے تر ہونے لگی اچانک قدموں کی آواز ایک بار پھر ابھری کوئی بے حد اطمینان سے چلتا ہوا گیراج سے باہر آرہا تھا۔ ہاتھ بے ساختہ نیچے گراتے ہوئے قریب تھا کہ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا کہ وہ سامنے آگئی اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا برف کا ٹکڑا میں نے زبان پر رکھتے ہی حلق سے نیچے اتار لیا ہو جسم اس خوف ناک گرداب سے نکل آیا۔

زرد چاندنی میں نہائی ہوئی وہ آہستہ آہستہ چلتی میرے قریب آتی گئی اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ میری آنکھیں جیسے جھپکنا بھولتی جارہی تھیں۔

''ہاورڈ۔۔۔!'' گھنٹیوں جیسی آواز میں اس نے یہ نام پکارا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''ہاورڈ تو ادھر ہے۔۔۔ اور اس قابل نہیں کہ جواب میں چل کر تمہارے پاس پہنچ جائے۔'' یہ بشپ تھا جو نہ جانے کب فون کرکے واپس آگیا تھا اور اب گیراج کے دوسرے دروازے سے اس کی نگرانی کر رہا تھا مگر جب باہر آنے والا فرد غیر متوقع طور سے ایک حسین عورت کا روپ دھار گیا تو اسے مجبوراً اپنی شخصیت ظاہر کرنا پڑی۔ ''کسی نے ہاورڈ کو دونوں آنکھوں کے درمیان گولی ماردی ہے۔'' کس نے ہاورڈ کو دونوں آنکھوں کے درمیان گولی ماردی ہے۔'' انتہائی بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ بشپ نے مرنے والے کا تصوراتی خاکا اس حسین ترین اور نازک اندام خاتون کے سامنے پیش کر دیا۔

''ایڈی۔۔۔!'' وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا ''اپنا ریوالور بدستور ہاتھ میں رکھو اور وہیں کھڑے رہو اگر اس خاتون کی چارٹانگیں نہیں ہیں تو پھر ایک اور شخص اندر ہی موجود ہوگا کیوں کہ میں نے دو انسانی سائے دیکھے تھے۔''

''گیراج میں کوئی نہیں ہے۔'' حسین خاتون کے لب کپکپائے اور صدمے کے باعث وہ گر جانے کو تھی کہ میں نے لپک کر اس گل رعنا کو دونوں ہاتھوں پر تھام لیا۔

بشپ معنی خیز نگاہ سے مجھے گھورنے لگا مگر میں اس کی پروا کیے بغیر اسے لے کر عمارت میں داخل ہو گیا اور اندازے سے خواب گاہ کی جانب چلنے لگا۔

سارجنٹ برڈاک اپنے نصف درجن آدمیوں کے ساتھ عمارت میں آن وارد ہوا۔

''فرض کرو بشپ! اگر وہ قاتل اس وقت واقعی وہاں گیراج میں موجود ہوتا اور مجھے گولی مار دیتا تو۔۔۔؟'' میں نے حسین خاتون کی مسہری کے قریب رکھا اسٹول سنبھال کر کہا۔ بیٹھتے وقت میں نے کوشش کی تھی کہ میرا دایاں رخ اس خاتون کے سامنے رہے کیونکہ بشپ کے بقول میں اس طرف سے بے حد پرکشش دکھائی دیتا تھا۔

''تم کون ہو؟'' اس کی انتہائی نحیف آواز ابھری اور میں نے اس کا نازک سا ہاتھ تھام لیا۔

''مجھے اپنا دوست ہی سمجھو۔'' لیکن ابھی میں بمشکل اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ خشکی کے ساتھ بشپ نے گویا اپنی چھڑی ہی پھینک ماری۔

''باہر پولیس موجود ہے اور یہاں ایک قتل ہو چکا ہے۔''

''قتل۔۔۔'' اس کی سانسیں جیسے رک سی گئیں تو میں نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں آہستہ سے دبا دیا۔

''تو کیا ہاورڈ بھی۔۔۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولنے لگی۔ ''مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے کہ باہر سے کسی نے اسے آواز دی تھی۔''

سارجنٹ برڈاک کسی بھی لمحے اس عورت سے سوالات کرنے اندر آیا ہی چاہتا تھا اس لیے میں نے بھی ان آخری لمحوں میں اخبار نویس بننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ جس نے ہاورڈ پر گولی چلائی تھی وہ کون تھا۔ تمہارے باہر آنے سے ایک یا دو لمحے قبل تک وہ اسی گیراج میں ہی تھا جس سے تم باہر آئی تھیں۔''

''میں نے تو بھاگتے قدموں کی آوازیں سنی تھیں کیوں کہ میں اس وقت اوپر سیڑھیوں پر تھی ابھی چند ہی گھنٹے پہلے مجھے اپنے شوہر بل کی موت کا علم ہوا تھا۔ پھر جب میں نے سیڑھیوں پر کھڑکی کی آواز سنی تو خوف زدہ ہو گئی۔''

''یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔'' میں نے فوراً تائید کی۔

''مگر وہ جو کوئی بھی تھا، اندر خواب گاہ میں نہیں آیا۔ بس ایک کھڑکی کھلنے کی آواز سنائی دی اور وہ گیراج کے اپارٹمنٹ کی چھت سے کود کر کہیں غائب ہو گیا اس کے جانے کے چند منٹ بعد میں دروازہ کھول کر باہر آئی اور گیراج کی طرف سے ہوتی ہوئی ہاورڈ کو تلاش کرنے لگی۔''

بشپ کے لباس سے بہنے والا پانی ابھی تک نیچے فرش پر گر رہا تھا لیکن وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے کو جھکا اور بولا۔ ''یہ ہاورڈ کیا یہیں رہتا تھا۔'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ تجسس تھا۔

''نہیں۔۔۔ وہ برمنگھم میں رہتا تھا اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ میرے شوہر بل ماربری کا بہنوئی تھا۔''

''کیسا کاروبار۔۔۔؟'' بشپ نے سوال کیا۔

''ہاورڈ عمارتی لکڑی اور بانس دوسرے ممالک کو بھیجتا تھا۔'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتی مگر سارجنٹ برڈاک اپنے وزنی جوتوں سے اس قدیم مکان کی گویا بنیادیں تک ہلاتا ہوا اندر آ گیا اور اس نے آتے ہی ہم سے چلے جانے کی درخواست کر دی۔ اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ پولیس کی آمد سے قبل ہماری

مداخلت بے جا سے انتہائی ناخوش ہے۔

''ایک منٹ، سارجنٹ۔۔۔!'' بشپ نے اس کی برہمی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو میں مسز ماربری سے صرف ایک سوال اور کروں گا۔'' پھر وہ منہ پھیر کر اس حسین خاتون کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہارا آنجہانی شوہر کل کس غرض سے مجھے تلاش کر رہا تھا؟''

وہ اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گئی اور سادگی سے بولی۔ ''بل تمہیں تلاش کر رہا تھا؟'' وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔ ''یہ بات کس نے کہی ہے؟''

''ہم دونوں اخبار ڈیموکریٹ میں کام کرتے ہیں۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کر دی۔

''اچھا۔۔۔!'' اس نے ایک طویل سانس لی ''میں سمجھی تھی کہ تم پولیس افسر ہو۔۔۔ بہرحال مجھے نہیں معلوم کہ وہ اخبار والوں سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔''

برڈاک نے تیز لہجے میں مسز ماربری کو تنبیہ کی کہ وہ اخباری نمائندوں کے سوالات سے خود کو محفوظ رکھے ورنہ۔۔۔ اور اس کے بعد اس کی برہم آنکھوں کا صرف ایک اشارہ ہی کافی تھا ہم دونوں اٹھے اور خواب گاہ سے باہر آ گئے۔

نیچے کمرۂ نشست میں نصف درجن سپاہی آرام دہ صوفوں پر آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈال کر بشپ سیدھا باورچی خانے میں جا گھسا۔ دونوں چولہے جلا کر اس نے باری باری اپنے سارے کپڑے اتار کر وہاں خشک کیے اور نصف گھنٹے بعد پہلے جیسا مستعد اور تر و تازہ نظر آنے لگا۔

''چلو ایڈی! برڈاک کمرۂ نشست میں واپس آ چکا ہوگا ہم بھی اس کے خیالات سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

مگر برڈاک ابھی اوپر ہی تھا۔ اس کے احکامات کے انتظار میں بیٹھے سپاہیوں کے قریب ہی ہم نے دو نشستیں سنبھال لیں اور ان کی خیال آرائیوں سے اپنے کانوں کو گرمانے لگے اچانک صدر دروازے پر تعینات سپاہی کی آواز سنائی دی وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''سارجنٹ کا حکم ہے کہ کوئی شخص ان کی اجازت کے بغیر اندر نہیں جائے گا۔''

سب لوگ چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔

''کون ہے، تمہارا سارجنٹ۔'' کسی نے حقارت سے پوچھا۔ ''اسے بتاؤ کہ رچرڈ آیا ہے۔۔ رچرڈ ہاورڈ۔'' یہ کہنے کا انداز ایسا ہی تھا گویا رچرڈ ہاورڈ نہیں بلکہ صدر امریکا یا انگلستان کی ملکہ نے نزول فرمایا ہو پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھلا اور وہ اندر آ گیا برفانی علاقوں میں رہنے والوں جیسا چہرہ لیے وہ جب سامنے آیا تو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔

یہ وہی ہاورڈ تھا جو کسی زمانے میں پارلیمنٹ کا ممبر بھی رہ چکا تھا اور آج کل اسی متنازعہ اراضی پر پیدا ہونے والی عمارتی لکڑی اور بانس کا سب سے بڑا بیوپاری تھا جس کے ٹھیکے میں ہونے والی نمایاں دھاندلی پر میں اپنے اخبار میں فیچر لکھ رہا تھا برقی روشنی میں اس کے ہیرے کی ٹائی پن نے ایک تیز شعاع منعکس کی۔ رچرڈ کے عقب میں آنے والے اس کے پرسنل سیکریٹری منحنی سے شخص نے ایک قریبی سپاہی سے با آواز بلند دریافت کیا۔ ''ہمیں نیوٹن ہاورڈ سے ملنا ہے کیا وہ اندر تشریف رکھتے ہیں؟''

''وہ اب عالم بالا میں تشریف رکھتے ہیں۔'' بشپ نے دخل در معقولات کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو ان کا جسد خاکی ابھی تک انہیں میں سے کسی کمرے میں ہوگا۔''

''اوہ، بشپ تم۔۔۔؟'' رچرڈ نامی شخص لپک کر آگے آیا۔

''کیا مسز ماربری نے اسے قتل کر ڈالا۔'' سیکریٹری نما شخص کے اس سنگ دلانہ سوال پر ماحول سناٹے میں ڈوب گیا۔۔۔ پھر اس گمبھیر سناٹے میں چند ثانیے بعد اسی شخص نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔۔۔ میں نے تو۔۔۔ میں نے تو صرف اس مفروضے کے تحت

یہ بات کہی ہے جو آنجہانی نیوٹن نے میرے سامنے دوہرایا تھا۔''

''ہاں۔۔۔ہاں کہتے چلو۔۔۔'' بشپ نے اسے جھجکتے دیکھ کر لقمہ دیا۔ اسے اس انکشاف میں اپنے اخبار کے لیے ایک خوب صورت سرخی دکھائی دے رہی تھی۔

''وہ میرے ہوٹل آیا تھا۔'' رک رک کر وہ شخص بولنے لگا۔ ''اس سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر مجھے اخبارات کے ذریعے بل ماربری کے قتل کا علم ہو چکا تھا۔ نیوٹن ہاورڈ نے مجھے بتایا کہ بل ماربری کی موت سے اس کی بیوہ کو ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی بیمہ پالیسی ملنے کا امکان ہے اور یہ اتنی خطیر رقم ہے کہ جس کے لیے کوئی بھی عورت۔۔۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر غور سے بشپ کو دیکھنے لگا۔ ''میں جو کچھ بھی تمہیں بتا رہا ہوں یہ صرف ذاتی نوعیت کی گفتگو ہے۔ اخبار میں شائع کرنے کے لیے نہیں۔''

''بلاشبہ۔۔۔!'' بشپ نے تائید سے سر ہلا کر اسے یقین دہانی کروائی۔ ''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ نیوٹن نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ بل میری تلاش میں نیوز ایجنسی کیوں گیا تھا؟''

''نہیں۔۔۔اس کے کہنے کے مطابق وہ دونوں ایک کلب میں کل رات گئے تک پینے پلانے میں مصروف رہے۔ پھر بل جلد ہی گھر جانے کے ارادے سے اٹھ گیا اس کا خیال تھا کہ اس کی بیوی اس کی راہ دیکھ رہی ہوگی لیکن نیوٹن ہاورڈ کا کہنا تھا کہ مسز ماربری کو اپنے شوہر کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے بلکہ وہ تو کسی اور شخص معرفت بڑی بڑی رقمیں بھی داؤ پر لگواتی ہے اور اسی شخص کے ساتھ چوری چھپے رقص کی محفلیں بھی سجاتی ہے۔''

آخری جملے اس نے اپنی دانست میں قدرے رازداری برتتے ہوئے نسبتاً دھیمی آواز میں ادا کیے تھے مگر کمرے میں موجود ہر فرد نے انہیں بخوبی سن لیا ہوگا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس معصوم اور انتہائی حسین عورت کی شان میں ایسی بے ہودہ گستاخی کرنے والے کا منہ توڑ کر رکھ دوں۔ شاید بشپ کو میرے اس اندرونی ہیجان کا علم ہو گیا تھا اس نے فوراً ایک ہاتھ میرے گھٹنے پر رکھ کر گویا مجھے خاموش بیٹھنے کی تلقین کی۔

رچرڈ ہاورڈ اس دوران میں خاموش ہی رہا تھا۔ اس کے سیکریٹری کے چپ ہوتے ہی بشپ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، رچرڈ۔۔۔!'' اس نے کہا۔ ''یہ شخص نیوٹن تمہارے ہی توسط سے تمام لکڑی باہر بھجواتا ہوگا اور غالباً تمہاری شراکت ہی سے اس کا کاروبار چل رہا تھا۔'' اس جملے پر رچرڈ کا چہرہ کسی بیمار شخص کی طرح زرد رنگت اختیار کر گیا۔ ''اس کی آج کل یہاں لندن میں آمد کی وجہ بھی شاید تمہارا ہی کوئی معاملہ تھا جو اسے غالباً کسی دوسرے شخص سے طے کرنا تھا۔''

رچرڈ کی آنکھیں ان الفاظ پر سکڑ کر مختصر سی ہو گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک ایسے سانپ کے روبرو کھڑا ہوں جو وار کرنے کے لیے پھن پھیلائے ہوئے ہو لیکن جب وہ بولا تو خود پر قابو پا چکا تھا اور اس کی آواز مطمئن اور کافی نرم تھی۔

''نیوٹن میرے کاروبار کی چند الجھنیں سلجھانے یہاں آیا تھا۔ اس اعتبار سے تمہارا اندازہ درست ہے۔''

اسی لمحے سارجنٹ برڈاک خواب گاہ سے آنے والے زینے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس نے ایک نظر صدر دروازے پر متعین سپاہی پر اور دوسری رچرڈ ہاورڈ اور اس کے ساتھی پر ڈالی تو اس کی پیشانی پر ناگواری کی لاتعداد شکنیں ابھر آئیں مگر اظہار کا موقع دیے بغیر ہی رچرڈ آگے بڑھا اور اپنا تعارف کروانے لگا۔

''تم مجھ سے مل کر یقیناً خوشی محسوس کرو گے، سارجنٹ! مجھے رچرڈ ہاورڈ کہتے ہیں۔ ڈائریکٹر اسٹیٹ بیورو آف کنزرویشن۔۔۔میں یہاں بل ماربری کی تعزیت کے لیے آیا تھا لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ایک اور قتل بھی ہو چکا ہے۔ مجھے واقعی

بے حد صدمہ ہوا ہے۔'' وہ نہ جانے اپنی فصاحت اور بلاغت کے اور کتنے دریا بہانے پر آمادہ تھا مگر بشپ نے میرا بازو تھام لیا اور ہم نے چن کی راہ لی۔

''یہ شخص رچرڈ نہ جانے خود کو کیا کیا ظاہر کر رہا ہے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''مگر مجھے تو اس کی گفتگو سے دال میں کالا ہی نظر آ رہا ہے۔ ایڈی! ذرا سوچ کر بتاؤ کہ اسے دیکھ کر تمہیں کچھ یاد آیا۔ مثلاً ابھی ایک گھنٹے قبل جو شخص گیراج والے اپارٹمنٹ سے جست لگا کر روپوش ہو گیا تھا کہیں وہ یہی تو نہیں تھا۔۔۔؟''

''میں نے تو اس کی ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔'' میں نے بے بسی سے جواب دیا۔

''مگر میں تو کچھ ایسا ہی نظریہ جین ماربری کے بھی گوش گزار کر آیا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے اس کے دونوں شانے جھنجھوڑ ڈالے۔ ''کیا مطلب۔ تم اس سے کیا کہہ آئے ہو اور کس وقت۔''

''اسی لمحے جب تم کمرے سے نکل رہے تھے اور سارجنٹ برڈاک کچھ فاصلے پر تھا، میں نے اس کی کان میں یہ بات ڈال دی کہ اسے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ قاتل عنقریب گرفتار کر لیا جائے گا کیوں کہ تم نے اسے خوب اچھی طرح پہچان لیا ہے مگر فی الحال بات اسی تک محدود رہنی چاہیے۔''

''اوہ، میرے خدا۔۔۔'' میں نے جھلا کر پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''تم نے اس سے یہ جھوٹ کیوں بولا فرض کرو کہ وہ خود بھی قاتل سے باخبر ہو اور اس کے ذریعے قاتل کو بھی اطلاع ہو جائے تو کیا ہوگا؟ اوہ، میرے خدا۔۔۔ تم نے مجھے مروا ڈالا، بشپ!''

''اسی لیے تو میں نے تمہیں بھی بتا دیا ہے کہ تم ذرا محتاط رہو۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ذرا محتاط۔۔۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''اب میں ہر لمحہ محتاط رہوں گا اور خود کو محفوظ نہیں سمجھوں گا تاوقتیکہ وہ قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا۔''

☆☆☆

اور واقعی نصف شب سے ذرا دیر قبل اخبار کے دفتر سے ایک بلاک کے فاصلے پر اپنے معمول کے مطابق پولیس ہیڈ کوارٹرز جاتے ہوئے میں بیک وقت چاروں سمتوں میں نظر رکھے ہوئے خود کو اچھا خاصا احمق محسوس کر رہا تھا، میری آنکھوں کے گوشے مسلسل حرکت میں رہنے کی وجہ سے قابل رحم حالت کا شکار ہو گئے تھے۔۔۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا البتہ مجھے اعشاریہ تین دو کا ریوالور پہلی مرتبہ ہاتھ میں پکڑ کر سونے میں انتہائی تکلیف ہوئی کیوں کہ رات بھر بار بار آنکھ کھل جانے پر مجھے اردگرد بہت سے لوگ ریوالور تانے ہوئے محسوس ہوئے حتیٰ کہ خواب میں بھی قاتل ہی قاتل دکھائی دیتے رہے۔

اگلے شام کو دفتر آنے پر میری حالت نہایت ابتر تھی۔ بے آرامی اور بے خوابی کے باعث میرا سارا جسم بری طرح درد کر رہا تھا۔ اپنے اس نیچر کی آخری سطریں لکھ کر میں پولیس ہیڈ کوارٹرز چلا گیا۔ سارجنٹ برڈاک کے پاس بھی کوئی نئی خبر نہیں تھی البتہ بیمہ کمپنی کی جانب سے مسز جین ماربری کے نام ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم ہماری گفتگو کا موضوع رہی۔ یہ رقم ایک ہفتے تک جین کو ادا کی جانے والی تھی۔

جب میں دفتر واپس آیا تو مسز گڈ نے مجھے اطلاع دی۔ ''کیا تم جانتے ہو ایڈی! وہ حسین اور نوجوان بیوہ جین اکثر راتوں کو اپنے شوہر کی لاعلمی میں کسی اور شخص کے ساتھ رقص گاہ میں جایا کرتی تھی۔'' مسز گڈ بے حد پرجوش نظر آ رہی تھی۔ وہ سفید بالوں والی ادھیڑ عمر کی خاتون تھی اور اس کے سفید بالوں کی مناسبت سے ہم سب اسے مسز وائٹ کہا کرتے تھے۔

مگر اس کی اطلاع کا یہ انداز مجھے قطعی پسند نہیں آیا۔ ''کس خبیث نے تمہیں یہ سب کچھ بتایا ہے مسز وائٹ!'' میں نے برہمی سے کہا تو وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

''کیوں۔۔۔ کیا وہ بہت خوب صورت ہے۔'' اس نے مجھے چھیڑتے ہوئے دریافت کیا۔ ''بہرحال

یہ ایک مصدقہ اطلاع ہے۔ وہ تو قتل کی رات بھی اسی شخص کے ساتھ ایک جگہ دیکھی گئی تھی۔'' میں ابھی اس اطلاع پر ہی غور کررہا تھا کہ اس نے مزید کہنا شروع کردیا۔ ''اور ایڈی تمہارے لیے یہ خبر بھی یقیناً سنسنی خیز ثابت ہوگی کہ مقتول بل ماربری حال ہی میں اپنے محکمے کی جانب سے اس اراضی کا سروے کرکے آیا تھا جس کا ٹھیکہ رچرڈ ہاورڈ نے لے رکھا تھا اور جس پر پیدا ہونے والی عمارتی لکڑی اور بانس کی بیرون ممالک تجارت وہ اسی شخص بل ماربری کا بہنوئی نیوٹن ہاورڈ کے توسط سے کرتا تھا یہ سب کچھ کس قدر معنی خیز ہے۔۔۔'' شاید وہ کچھ اور بھی بتاتی۔۔۔ مگر اس کی میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

یہ یقیناً بشپ کلارک کا فون تھا کیوں کہ سوا سات ہوگئے تھے اور وہ دفتر سے غائب تھا۔

''بشپ کا فون ہے، تمہارے لیے۔۔۔'' مسز وائٹ نے ریسیور میری جانب بڑھادیا۔

''ہیلو ایڈی۔۔۔!'' دوسری طرف سے بشپ کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے جین کو فون کیا تھا محض اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے لیکن جانتے ہو وہ کیا کہنے لگی۔۔۔'' دوسری جانب چند لمحے پراسرار خاموشی طاری رہی۔ ''وہ تم سے ملنا چاہتی ہے ایڈی! دیکھا۔۔۔ میں نے کہا نا تھا کہ تمہارا خوب صورت چوکھٹا خواتین کو کچھ زیادہ ہی پسند آتا ہے تم فوراً اس کے گھر چلے جاؤ۔۔۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے فون بند کردیا تو میں ہچکچاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے صدر دروازے سے رچرڈ ہاورڈ نے اندر قدم رکھا تو میں نے اپنی میز پر پھیلے ہوئے اسی کے متنازعہ اراضی پر لکھے جانے والے کچھ کے تمام کاغذات سمیٹ کر دراز میں مقفل کردیے۔

''بشپ اندر ہے۔'' اس نے انگوٹھے سے ایڈیٹر کی تختی والے کمرے کی جانب اشارا کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس آنے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔'' میں عجلت میں باہر جانے لگا تو وہ پوچھ بیٹھا ''آپ کہیں جارہے ہیں کیا؟''

''ہاں۔۔۔ مجھے مسز ماربری سے ملنا ہے۔'' میں نے بتایا تو اس کی آنکھیں سکڑ گئیں لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر دفتر سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس سڑک پر کار چلاتے ہوئے میری آنکھوں میں ان حسرتوں کے ننھے ننھے دیپ جگمگا اٹھے تھے جو اس حسینہ کے بلاوے پر از خود ہی میرے دل کے نرم گوشوں میں پیدا ہوگئے تھے۔ شاید آج وہ تنہا ہی ہوگی اور میری منتظر بھی۔۔۔ میں نے سوچا۔

پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ بشپ نے اسے ایک اور وسوسے میں بھی تو مبتلا کردیا تھا کہ میں نے نیوٹن ہاورڈ کے مبینہ قاتل کو اس روز دیکھ لیا تھا اگر واقعی اس حسینہ کا کسی طور بھی قاتل سے کوئی تعلق ہے تو وہ اسے یقیناً اطلاع دے چکی ہوگی لیکن جب میں نے اپنی سیڈان احاطے کے اس حصے میں روکی جہاں نیوٹن کو قتل کرکے پھینک دیا گیا تھا پھر وہاں سے پورچ تک کا راستہ طے کرنے پر کوئی فائر نہ ہوا اور نہ ہی کوئی شخص اچانک کسی درخت سے مجھ پر کودا تو میری ہمت پھر استوار ہوگئی اور میں نے دیرینہ آرزوؤں کو دل میں بسا کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

اگلے ہی پل وہ اس دروازے کے فریم میں یوں آ کھڑی ہوئی جیسے سیاہ بادلوں بھرے آسمان پر بجلی کوند جائے تو میرے ہوش وحواس پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ سیاہ مائی لباس اس کی طلوع سحر کے اولین گلاب جیسی رنگت والے چہرے پر کھلا پڑ رہا تھا۔ سنہری بال لہراتے ہوئے اس کے حسین رخساروں کی بلائیں لے کر نیچے سیاہ لباس تک بکھر آئے تھے۔

میں مبہوت سا کھڑا چند ثانیے اسے غور سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اپنی طلبی کی وجہ دریافت کی۔

جواباً وہ دروازے کی چوکھٹ سے ہٹ گئی اور مجھے اندر آنے کا اشارا کیا۔ ہم دونوں اسی کمرۂ نشست میں آ بیٹھے جہاں گزشتہ شب نصف درجن

سپاہیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ وہ میرے بہت قریب بیٹھی تھی اتنی قریب کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خواتین عموماً جرات مند مردوں کو بے حد پسند کرتی ہیں اگر وہ مرد خوب صورت چہرے کا بھی مالک ہو پھر تو شکست کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی وہ تھوڑا سا فاصلہ بھی طے کرلیا اور اس کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

وہ اپنا دل کش چہرہ اٹھا کر چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اس نے میرے شانے سے سر ٹکا دیا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ اس کی سانسوں کی معطر اور مدہوش کن خوشبو میرے گالوں سے ٹکرا رہی تھی اور میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں۔

''میرے کچھ ملاقاتی آنے والے ہیں ایڈی۔۔۔!'' تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''اسی لیے میں نے تمہیں ان کی آمد سے قبل ہی بلوایا ہے۔ آج کا دن میرے لیے بے حد خوف ناک تھا پہلے وہ سارجنٹ بیٹھا رہا۔۔۔ پھر بیمہ کمپنی کے دو آدمی آگئے وہ سمجھتے ہیں کہ میں بل کی موت سے بے حد خوش ہوں کیوں کہ مجھے اس کی بیمہ پالیسی سے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی رقم وصول ہوگی۔'' اس جملے پر اس کی خوب صورت آنکھیں برسنے لگیں تو میں نے تڑپ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یہ سب انتہائی بے ہودہ اور احمق لوگ ہیں جین! تم ان کی بالکل پروا نہ کرو۔ ویسے بھی پولیس اور دیگر محکموں کے لوگ دراصل ایسے سوالات سے اس شخص کا چہرہ بے نقاب کرنا چاہتے ہیں جس نے درحقیقت قتل جیسا مذموم فعل کیا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے اور دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''تم نے اسے دیکھا تھا ایڈی!'' اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ سیاہ لباس اپنی تنگی داماں سے اس کے قیامت خیز شباب کو اجاگر کررہا تھا۔ وہ بار کاؤنٹر سے دو پیگ بنا لائی تھی اور ایک جام مجھے دینے کی غرض سے میرے سامنے جھکی کھڑی تھی اس کا گلابی بدن تباہ کن حد تک خوب صورت اور پرکشش تھا۔ میں اپنی نظر کو بھٹکنے سے نہ بچا سکا پھر جب اس نے دوبارہ وہی سوال کیا تو میں نے اپنی گستاخ نگاہ کو واپس بلا لیا۔

اس کی آنکھوں کی مستی شراب کے پیمانے میں گھول کر دو آتشہ بناتے ہوئے میں نے بڑا سا گھونٹ لیا یوں جیسے ساتھ ساتھ اس کے نین کنول جیسے ساغروں سے بھی پی رہا ہوں۔

''وہی شخص جو اس رات گیراج کے اپارٹمنٹ کی چھت سے کود گیا تھا۔'' وہ میری واردات قلب سے بے خبر ان حقائق میں کھوئی ہوئی تھی۔

''ہاں۔۔۔ وہ شخص جو ہاورڈ پر گولی چلا کر بھاگا تھا۔'' میں نے اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر دروغ گوئی شروع کردی۔ ''میں نے اسے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا لیکن اب اگر سامنے آگیا تو ضرور پہچان لوں گا۔''

اس نے اپنا جام ختم کرلیا تھا اور نشست کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ ''میں کس قدر تنہا رہ گئی ہوں۔'' اس نے آنکھیں بند کرکے ایک سرد آہ کے ساتھ یہ جملہ کہا اور ننھی سی آنسو کی ایک بوند پلکوں کی چلمن سے جھانکنے لگی۔ میں نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر ان سرخ اور گداز ہونٹوں کو چوم لیا جو شدت گریہ سے ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ میرے سینے پر سر ٹکانے آنسو بہانے لگی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں ہنی!'' اس کے معطر ریشمی بالوں کو مسلسل چومتے ہوئے از خود یہ جملہ میرے لبوں سے پھسل گیا۔ ''زندگی کے ہر لمحے اور ہر موڑ پر تم مجھے آواز دے سکتی ہو۔'' قریب تھا کہ اس لمحے میرا احوال دل کوئی دوسری صورت اختیار کرجاتا کیوں کہ ہم دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور ہم ایک جذب کے سے عالم میں کھڑے تھے کہ اچانک وہ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ کے ساتھ اچھلی اور میری بانہوں کی زنجیر توڑ کر دور جا کھڑی ہوئی۔

وہ ایک دبلا پتلا اور پست قامت شخص تھا اور کمرے میں آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کرلیا تھا۔ میں نے اسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مگر اس سے تفصیلی تعارف کی ضرورت یوں پیش نہیں آرہی تھی کہ اس کے چہرے کے بدصورت خدوخال، ان پر چھائی ہوئی بہیمیت اور سفاکی سب سے بڑھ کر اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا، کھلا تیز دھار چاقو جس کے تھامنے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس کے استعمال میں مہارت بھی رکھتا ہے۔

میرے لیے یہ تعارف ہی کافی تھا اچانک اس کے چاقو کی نوک میرے پیٹ کی جانب بڑھنے لگی وہ شخص آہستہ آہستہ پلکیں جھپکائے بغیر بڑھتا چلا آرہا تھا۔

میں الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ نووارد کی پیش قدمی جاری تھی۔ ایک عجیب سا خوف میرے حواس پر چھا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ان لوگوں سے بے حد دہشت محسوس ہوتی ہے جو آتشی اسلحے کے استعمال کے بجائے چھری یا چاقو قسم کی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں شاید اس لیے کہ مجھے معلوم تھا ایسے ماہر افراد کا وار بھی خالی نہیں جاتا وہ جہاں چاہیں بھرپور انداز میں ضرب لگا سکتے ہیں۔

پسینہ آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں، پیشانی اور گردن کی پشت پر بہنے لگا۔ وہ ایک لفظ بولے بغیر آگے بڑھتا رہا اور جین ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھے ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی۔ ''نہیں۔۔۔نہیں، پیٹ۔۔۔تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' کی تکرار کیے جارہی تھی، مگر اس شخص نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔

''پیٹ۔۔۔! تم نے تو کہا تھا کہ تم ایڈی سے صرف یہ پوچھو گے کہ اس نے اس رات تمہیں گیراج کی چھت پر تو نہیں دیکھا تھا اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔'' جین نے چیخ کر کہا۔

مگر وہ گونگا بہرہ بنا اسی آہستہ خرامی سے آگے بڑھتا رہا۔۔۔ یوں جیسے اس کھیل کو نمٹانے کی اسے کوئی جلدی نہ ہو۔

''ارے۔۔۔ارے یہ کیا ہورہا ہے۔ بشپ یقیناً ایڈی کے قتل کی سرخی اپنے اخبار میں لگانا پسند نہیں کرے گا۔'' یہ اسی مسز گڈ کی آواز تھی جسے ہم اس کے سفید بالوں کی مناسبت سے مسز وہائٹ کہتے تھے وہ کچن کے دروازے سے لگی کھڑی حیرت سے قاتل کو دیکھ رہی تھی۔

قاتل اس آواز پر ٹھٹک گیا اور میرے لیے اس کی اتنی سی غفلت ہی کافی تھی۔ میرے پاؤں محاورتاً اڑتے ہوئے اس کے سخی سینے سے ٹکرائے اور وہ الٹ کر دوسری جانب جا گرا۔

''خوب مارو اسے ایڈی۔۔۔!'' مسز وہائٹ یوں بولنے لگی جیسے رنگ میں ہونے والے کسی مقابلے کے دوران تماشائی اپنے پسندیدہ کھلاڑی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں لیکن وہ شخص آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اسے زیر کرتے ہوئے مجھے دانتوں پسینہ آگیا۔ بالآخر جب وہ ہاتھ پیر ڈال کر فرش پر لمبا لیٹ گیا تو میں نے ہاتھ جھاڑے اور اس کی گردن پر گھٹنا رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جین ماربری فوراً ہی میرے لیے ایک جام بنا کر لے آئی اور مسز وہائٹ نے اپنے بالوں سے بھی زیادہ سفید رومال نکال کر میرے لباس کو صاف کرنا شروع کردیا، میں کسی فاتح کی طرح پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم یہاں کیسے آپہنچیں۔'' بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے مسز وہائٹ سے دریافت کیا۔

''بشپ کے حکم کی تعمیل میں۔۔۔'' اس نے جواباً کہا۔ ''پانچ منٹ پہلے اس کا فون آیا تھا جس میں مجھے تمہاری مدد کرنے کے لیے فوراً یہاں پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ چنانچہ میں فوراً ہی پہنچ گئی۔ داخلہ کچن کے راستے سے ہوگا۔ یہ بھی اسی کا فرمان تھا اس لیے میں عقبی جانب سے ہوتی ہوئی کچن سے اندر آئی ہوں۔''

''کیا بشپ کو علم تھا کہ یہاں ایک عدد چاقو باز قاتل سے بھی ملاقات متوقع ہے۔'' میں نے مصنوعی ناراضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ علم ہوتے ہوئے بھی اس نے مجھے قربانی کا بکرا بنا کر یہاں پھینک دیا۔'' میں نے جین ماربری کی طرف دیکھا وہ خلا میں نگاہ جمائے خاموش بیٹھی تھی۔'' تو اسی شخص پیٹ نے تمہارے شوہر بل ماربری کو اپنے راستے سے ہٹایا تھا مگر اس نے بے چارے ہاورڈ کو کیوں قتل کیا تھا وہ تو غالباً اس کی راہ کا کانٹا نہیں تھا۔''

اس نے بے حد شاکی نگاہ سے مجھے دیکھا اور

ہونٹ کاٹنے لگی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔'' بے حد نحیف سی آواز اس کے منہ سے نکلی اور وہ اپنی نشست پر جھول گئی۔ میں نے لپک کر اسے سہارا دیا لیکن وہ بے ہوش ہوچکی تھی وہ بے حد زرد اور کمزور نظر آرہی تھی۔

اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنی تو ہم نے پلٹ کر دیکھا پیٹ غالباً قدرے ہوش میں آ گیا تھا وہ کہنیاں اور گھٹنے فرش پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھا اسی اثنا میں صدر دروازے کے باہر سے بشپ کی آواز سنائی دی تو مسز گڈ نے دروازہ کھول دیا وہ رچرڈ ہاورڈ کے ساتھ چھڑی کھٹکھٹاتا ہوا اندر آیا اور مجھے دیکھتے ہی چہکنے لگا۔ ''ارے ایڈی! میرا تو خیال تھا کہ تمہارا یہ حسین چوکٹھا اب تک مرمت کے قابل ہوچکا ہوگا۔۔۔ مگر تم تو ویسے ہی نظر آرہے ہو بلکہ پہلے سے بھی کہیں اچھے۔۔۔'' قریب آ کر اس نے میرے سفید کالر پر لگے لپ اسٹک کے سرخ دھبے کو دو انگلیوں سے چھو کر قہقہہ لگایا پھر وہ اپنے ساتھ آئے ہوئے رچرڈ ہاورڈ سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ آج شام اس قاتل سے یہاں ملاقات ہونے کی توقع ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے جب نیوٹن کو گولی لگی تھی تو یہ کمینہ بدمعاش اس وقت جین کے ساتھ تھا۔'' رچرڈ نے غرا کر کہا۔

''ہاں۔ یہ شخص قتل کے وقت اس خاتون کے ساتھ گیراج کی چھت پر موجود تھا۔'' بشپ کے اس جملے پر ہم بھی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔'' میں نے دریافت کیا۔

''ہم نے اسے گیراج میں داخل ہوتے نہیں دیکھا لیکن ہم نے محسوس کیا کہ جو شخص گیراج میں گیا ہے، وہی دوسری طرف سے باہر آرہا ہے۔ مگر کسی شخص کے بجائے مسز ماربری نکلیں۔'' بشپ نے ایک جام تیار کر کے جین کو دے دیا جو اب پوری طرح ہوش میں تھی اور ہماری خیال آرائیوں کو غور سے سن رہی تھی۔ ''اسے پی جاؤ۔'' بشپ نے کہا۔ ''تاکہ تمہیں سچ بولنے میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ یاد رکھو، اگر تم نے سچ نہ بولا اور معاملات سلجھ نہ سکے تو کسی طرح بھی ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی وہ خطیر رقم حاصل نہیں کرسکو گی۔''

واقعی دو گھونٹوں ہی نے کمال کا اثر ظاہر کرتے ہوئے جین کے گالوں کی سرخی لوٹا دی۔ اسی دوران میں بشپ نے میرے تعاون سے پیٹ نامی شخص کے گھٹنے اور کلائیاں مضبوطی سے باندھ کر اسے ایک جانب کونے میں ڈال دیا۔ اس سارے عرصے میں رچرڈ خاموش کھڑا تمام کارروائی دیکھتا رہا۔

''جس رات بل قتل ہوا میں گھر پر نہیں تھی۔'' جین ماربری آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ ''اس شخص کو میں نے رات کو رقص گاہ تک نگراں کی حیثیت سے ساتھ جانے اور جوئے خانوں میں داؤ لگانے کے لیے ملازم رکھا تھا۔ اس رات بھی یہ مجھے لے کر باہر گیا تھا مگر جونہی اسے بل کی موت کا علم ہوا، یہ خوف زدہ ہوکر یہاں دوڑا آیا اور مجھ سے چند منٹ گفتگو کی درخواست کی۔''

''تو یہی وجہ تھی کہ اس رات تم گیراج کی چھت پر اس کے ساتھ تھیں اور وہاں مکمل تاریکی تھی۔ شاید تم دونوں کو یہ خدشہ ہوگا کہ کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔'' بشپ نے کہا۔

جین نے اثبات میں سر ہلا کر سلسلہ کلام جاری رکھا۔۔۔ اس وقت ہاورڈ گھر میں تھا۔ ہم نے فائر کی آواز سنی تو ابتدا میں کچھ نہ سمجھ سکے۔ پھر کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔۔۔ اور عمارت کی عقبی کھڑکی کھول کر کوئی چار دیواری سے باہر کود گیا۔ پیٹ اس پراسرار نقل و حرکت سے مزید خوف زدہ ہوگیا۔ مجبوراً اسے بھی گیراج کی چھت سے باہر کود جانا پڑا۔ اس کے جاتے ہی میں اوپر کی سیڑھیوں سے نیچے آئی تو تم نے یہی سمجھا کہ شاید میں گیراج سے باہر آرہی ہوں۔ کیوں کہ بالائی زینے کا دروازہ بھی گیراج کے گیٹ کے ساتھ ہی کھلتا ہے۔''

''میں نے تمہیں یہی بتایا تھا نا مسز گڈ۔۔۔'' بشپ نے چہک کر کہا۔ ''اور اس احمق کو دیکھو یہ خوامخواہ کا قاتل بن کر سامنے آ گیا ورنہ اسے دیکھ کر تو کوئی اندھا بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ مقتول نیوٹن ہاورڈ کی موت ریوالور کی گولی سے واقع ہوئی تھی جب کہ پیٹ نامی یہ

شخص ایک ماہر چاقو باز ہے۔ یہ آتشیں اسلحے سے کوسوں دور بھاگتا ہے تو بھلا اس رات ریوالور کا استعمال کیسے کرسکتا تھا۔ یہ تو ایک ایسے شخص کا کام تھا، جس کی وسیع اراضی کی ناجائز آمدنی کا علم مقتول بل ماربری کو اس اراضی کے سروے کے دوران ہوگیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس دھاندلی کے باعث اب تک حکومت کو لاکھوں ڈالر سالانہ کا نقصان پہنچایا جاچکا ہے۔ چنانچہ اس نے ٹھیکہ حاصل کرنے والے کے خلاف رپورٹ تیار کی اور مجھے دکھانے کی غرض سے سیدھا اخبار کے دفتر چلا آیا۔ مگر بدقسمتی سے میں اسے نہ مل سکا۔ چنانچہ واپسی پر اسے ٹھکانے لگا کر اس کی گاڑی کو پل سے نیچے پھینک دیا گیا۔ قاتل کا خیال تھا کہ گاڑی دریا میں گرنے کے باعث مقتول کو جو چوٹ آئے گی اسے ہی موت کی وجہ گردانا جائے گا۔۔۔ مگر ایسا نہ ہوسکا اور پوسٹ مارٹم سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ اس وقت سے پہلے ہی سر کی چوٹ کے باعث ہلاک ہوا تھا۔''

''دوسرا مقتول نیوٹن ہاورڈ اس لیے مارڈالا گیا کہ وہ اپنے برادر نسبتی کی موت سے برافروختہ ہوکر قاتل پر چڑھ دوڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قاتل کون ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ پہلے مقتول بل ماربری کو گراں قدر رشوت پیش کرنے کے لیے ہی قاتل نے نیوٹن ہاورڈ کو برمنگھم سے یہاں طلب کیا تھا مگر بل نے رشوت لینے سے انکار کردیا۔ نتیجتاً اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا جب نیوٹن ہاورڈ بھی قاتل کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو قاتل نے نیوٹن ہاورڈ کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور میں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آج رات قاتل اس مکان میں ضرور آئے گا تاکہ اس واحد عینی گواہ کو بھی ختم کردے جس نے اسے اس رات فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔''

''نہ جانے تم کیا بکواس کررہے ہو۔'' رچرڈ دھاڑا۔

''بکواس۔۔۔!'' بشپ نے جواب میں قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ارے نہیں کمشنر۔۔۔ بلکہ سابق کمشنر۔۔۔ یہ تو حقائق ہیں اور آپ کو شاید معلوم نہیں کہ بل نے اس رپورٹ کی ایک نقل مجھے اور دوسری اپنے محکمے کو ارسال کردی تھی جو مجھے آج موصول ہوئی تو میں نے یہ تمہارے لیے جال پھیلا دیا کہ ایڈی نے قاتل کو دیکھ لیا تھا۔۔۔ اور آج رات قاتل اپنے چشم دید گواہ ایڈی کو بل کے گھر بلائے گا۔ چنانچہ تم میری توقع کے مطابق دوڑے چلے آئے تاکہ ایڈی کو بھی ختم کرسکو۔ کیا یہ غلط ہے؟''

رچرڈ نے اچانک ہی ریوالور نکال کر ہم سب پر تان لیا۔ ''خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔۔۔ اب تم سب کو ٹھکانے لگانا پڑے گا۔'' وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

''حیرت ہے۔ آخر تم اتنے پُریقین کیوں ہو کہ اس وقت ہم سب خالی ہاتھ ہوں گے۔'' بشپ نے حماقت آمیز لہجے میں کہا۔

''یہ معلوم نہ ہوتا تو میں اس وقت موجودہ صورت حال کا فاتح کیسے بن سکتا تھا۔'' رچرڈ نے قہقہہ لگایا اور بدستور الٹے قدموں دروازے کی جانب چلتا رہا۔ اس لمحے اس کے ریوالور سے چلنے والی گولی کے ہم سب گویا منتظر بیٹھے تھے کہ یکا یک غیر محسوس انداز میں بشپ کی چھڑی حرکت میں آئی اور رچرڈ کی دونوں ٹانگوں کے درمیان جا لگی اور وہ ریوالور سمیت اندھے منہ فرش پر گر گیا۔

دروازے کے دوسری جانب سے بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دیں اور سارجنٹ برڈاک نصف درجن سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔

''لیکن یہ کون ہے۔'' میں نے ماہر چاقو زن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بشپ مسکرانے لگا۔ ''مسز ماربری کا ملازم اور میرے منصوبے کا اہم کردار۔''

''سنبھالو برخوردار۔۔۔! مجرم حاضر ہے۔'' بشپ نے گرے ہوئے رچرڈ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

اپنے بازو پر گرفت محسوس کرتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو جین اپنے کانپتے ہاتھوں سے مجھے تھامے کھڑی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

زندہ تصور

سیدہ عطیہ زاہرہ

جب تک بے وقوف لوگ زندہ ہیں جب تک عقل مند بھوکا نہیں مر سکتا ایسے ہی ایک عقلمند شخص کی کہانی جو خوب صورت بھی تھا۔۔۔ ذہین بھی تھا۔۔۔ اور۔۔۔۔ دھوکے باز بھی۔ اس کا منصوبہ انتہائی چالاکی سے بنایا گیا تھا لیکن ایک چھوٹی سی غلطی اسے لے ڈوبی

جھوٹ، لالچ، دھوکے بازی اور اس کے انجام پر مبنی ایک معاشرتی کہانی

STOP

ٹھیک دس بجے شہباز شیخ نے گلیکسی آئل ایکسپوریشن کمپنی کے آراستہ دفتر میں قدم رکھا۔ ہال میں ایک باوردی چپراسی نے اس کا استقبال کیا۔ شہباز شیخ نے اسے اشتہار کا تراشا دکھایا اور کہا کہ وہ متعلقہ افسر سے ملنا چاہتا ہے۔ چپراسی نے ایک پرچی پر شہباز شیخ سے نام لکھوایا اور اندر چلا گیا۔ شہباز شیخ سینے پر ہاتھ باندھ کر ہال میں ٹہلنے لگا۔ آج وہ اپنا بہترین تھری پیس سوٹ پہن کر آیا تھا۔ ہال کی دیواروں پر آئل ریفائنری اور تیل کے کنوؤں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک تصویر تیل بردار بحری جہاز کی تھی۔ لمحہ بھر کے بعد چپراسی واپس آیا اور شہباز شیخ کو ایک اندرونی کمرے میں لے گیا وہاں ایک پروقار اور بہت ہی خوب صورت خاتون فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر شہباز شیخ کی طرف دیکھا اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شہباز شیخ کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کی آرائش سے خاتون کی حیثیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

''یس پلیز! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔'' خاتون فون بند کرتی ہوئی بولی۔

''میں اس اشتہار کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔'' شہباز شیخ نے اشتہار کا تراشا دکھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔'' خاتون گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔

''شہریار بیگ صاحب میٹنگ میں مصروف ہیں۔'' اس نے دراز سے ایک فارم نکال کر شہباز شیخ کی طرف بڑھایا اور بولی۔

''جب تک آپ یہ فارم پر کر دیں۔''

شہباز شیخ نے خاتون کے ہاتھ سے فارم لے لیا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس میں کوائف کے علاوہ چند سوالات بھی تھے۔ شہباز شیخ نے جیب سے بال پین نکال کر فارم پر کرنا شروع کر دیا۔ دفتر کے کسی دوسرے حصے سے ٹائپ کرنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ خاتون کی میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی ہر پانچ چھ منٹ بعد بج اٹھتی تھی۔ بات چیت زیادہ انگریزی میں ہوتی تھی۔ شہباز شیخ نے فارم پُر کر کے خاتون کو دے دیا جسے وہ اندرونی کمرے میں پہنچا کر واپس آ گئی۔ شہباز شیخ نے خاتون کے ساتھ بات چیت کرنے کی کوشش کی لیکن بات چند رسمی جملوں سے آگے نہیں بڑھی۔

نصف گھنٹے بعد خاتون کی میز پر رکھے ہوئے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ اس نے ایک بٹن دبا کر ''یس سر'' کہا۔

دوسری طرف سے ایک خالص کاروباری آواز ابھری۔

''مس کرن! مسٹر شہباز شیخ کو اندر بھیج دو۔''

مس کرن نے اوکے سر کہہ کر انٹرکام بند کر دیا اور اپنی سیٹ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

''آیئے مسٹر شہباز شیخ!''

اس نے ایک اندرونی دروازہ کھولا اور شہباز شیخ کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔ وہ ایک کشادہ اور روشن کمرہ تھا۔ وسط میں ایک بڑی سی میز رکھی تھی جس کے پیچھے ایک چالیس بیالیس سالہ شخص تھا۔ اس نے بسکٹی رنگ کا کاروباری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ شہباز شیخ کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

''سوری، شہباز شیخ صاحب! میں میٹنگ روم میں تھا۔'' اس نے معذرتی لہجے میں کہا۔

''آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔''

''نہیں کوئی خاص انتظار نہیں کرنا پڑا۔'' شہباز شیخ اور سرسری نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دروازہ اسے داہنی طرف نظر آیا۔ اس نے سوچا غالباً وہ دروازہ میٹنگ روم کی طرف کھلتا ہوگا۔ کمرے میں قیمتی قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر چند چارٹ اور نقشے آویزاں تھے۔ بائیں دیوار کے ساتھ ایک شاندار صوفہ سیٹ رکھا تھا، کشادہ میز پر ایک انٹرکام

اور دو فون رکھے تھے۔ وسط میں ایک پالش شدہ تختی پر شہریار بیگ مینجنگ ڈائریکٹر لکھا تھا۔ شہریار بیگ، شہباز شیخ کے فارم پر نظر دوڑاتا ہوا بولا۔

''اوہ آپ تو سرکاری ملازم ہیں۔ آپ ہماری کمپنی جوائن نہیں کر سکتے۔''

''میں دو مہینے کے بعد ریٹائر ہونے والا ہوں۔'' شہریار بیگ نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

''بہت مشکل ہے۔ میں دو ہفتے کی گارنٹی بھی نہیں دے سکتا۔ ہمیں کل سات آدمیوں کی ضرورت ہے جن میں سے صرف تین افراد کو ڈائریکٹر کے عہدے کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سات آدمی ہمیں سات روز کے اندر ہی مل جائیں۔''

اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو اندر بلایا اور اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس ہے شہباز شیخ صاحب! کہ آپ کو مایوس ہونا پڑا۔ آپ کافی پینا پسند کریں گے یا کولڈ ڈرنک۔''

''آپ تکلف نہ کریں۔''

''تکلف کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ میرا کم از کم اخلاقی فرض ہے۔ اکبر! دو کافی لے آؤ۔'' شہریار بیگ نے کہا۔

شہباز شیخ نے رات بھر جو خواب دیکھے تھے اور عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر جو نذرانہ پیش کیا تھا وہ سب کارِ عبث ثابت ہوا تھا۔ قدرے تامل کے بعد اس نے پوچھا۔

''بیگ صاحب کیا یہ مکمل طور پر فارن کمپنی ہے؟''

شہریار بیگ کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ بال پین کو انگلیوں میں پھراتا ہوا بولا۔

''یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ اگر شہریار بیگ اس کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر نہ ہوتا تو پھر یہ یقیناً ایک مکمل فارن کمپنی ہوتی۔ چند مہینے پہلے کمپنی نے جب پاکستان میں اپنا دفتر قائم کرنے کا پروگرام بنایا تو انہیں ایک پاکستانی مینجنگ ڈائریکٹر کی ضرورت محسوس

فائدہ

جج (ملزم سے): ''تم نے جوہری کی دکان سے زیورات کیوں چرائے تھے؟''

ملزم: ''جناب، دکان کے شوروم پر لکھا تھا کہ سنہری موقع سے فائدہ اٹھایئے۔''

دیوان خانہ

استاد (سراج سے): ''سراج بتاؤ، دیوان خانہ کسے کہتے ہیں؟''

سراج: ''دیوان خانہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں دیوانے رہتے ہیں۔''

میرے ابا

ملا دو پیازہ نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''تم اتنی اچھی روٹی نہیں پکاتی ہو جتنی اچھی روٹیاں میری ماں پکاتی تھی۔''

بیوی نے جواب دیا: ''تم بھی تو اتنا اچھا آٹا نہیں گوندھتے، جتنا اچھا میرے ابا گوندھتے تھے۔''

شیخ چلی

ایک مرتبہ شیخ چلی بیمار پڑ گیا اس کے پڑوسی جمع ہوگئے۔ کوئی کہتا اسے کونین دو، کوئی کہتا اسے حکیم کے پاس لے چلو، غرض جتنے منہ اتنی باتیں، ایک شخص بولا۔ ''پہلے اسے ہوش میں لاؤ اور فوراً کھانے کے لیے حلوہ دو۔''

یہ سنتے ہی شیخ چلی نے آنکھیں کھول دیں اور لوگوں سے کہنے لگا۔ ''بھائیو! اس کی بھی بات سن لو۔'' اور پھر دوبارہ بے ہوش گیا۔

نوکر

خاتون: ''تمہیں کس گدھے نے نوکر رکھا تھا؟''

نوکر: ''بیگم صاحبہ..... آپ کے شوہر نے نوکر رکھا تھا۔''

ہوئی۔ کمپنی کے چیئرمین خود یہاں آئے، اخباروں میں اشتہار دیے اور موذوں امیدواروں کا انٹرویو کیا۔ خوش قسمتی سے میں تمام امیدواروں میں موذوں ترین امیدوار ثابت ہوا اور مجھے پروانہ تقرری مل گیا۔ اس کرسی پر بیٹھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس پراجیکٹ میں ہمارے ملک کا سرمایہ بھی شامل ہونا چاہیے۔ میں نے پرنسپل آفس کو اس سلسلے میں خط لکھا، لیکن انہوں نے میری تجویز کو مذاق میں ٹال دیا، مگر میں پیچھے نہیں ہٹا اور کوشش جاری رکھی بالآخر میری کوشش کامیاب ہوگئی۔ اب کمپنی نے مجھے یہ اختیار دے دیا ہے کہ میں پاکستانی سرمایہ کاروں کو دو سے چار ارب روپے کے حصص فروخت کرسکتا ہوں اور بیس کروڑ یا اس سے زیادہ سرمایہ لگانے والوں کو ڈائریکٹر کے عہدے پر اپوائنٹ کرسکتا ہوں۔"

یہ سن کر شہباز شیخ کو مزید مایوسی ہوئی، کیونکہ اس کے پاس پانچ کروڑ سے زیادہ رقم موجود نہیں تھی۔ اس نے پچیس سالہ ملازمت کے دوران دو مکان بنائے تھے اور خوب عیاشی کی تھی۔ ایک مکان گلشن میں تھا جو دو سو چالیس گز پر بنا ہوا تھا۔ دوسرا ڈیفنس میں تھا جس کا رقبہ دو ہزار گز تھا۔ اس کا ذاتی خیال یہ تھا کہ وہ ڈیفنس والے بنگلے کو کرائے پر چڑھا دے گا اور خود گلشن والے مکان میں رہے گا۔ لیکن اس کے بیوی بچے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ آدھی زندگی کبوتر خانے میں گزاری ہے اب وہ بقیہ آدھی زندگی مرغی خانے میں نہیں گزاریں گے۔ انہیں دو ہزار گز کا بنگلہ چاہیے شہباز شیخ کو ان کی مرضی کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

چپراسی کافی کے دو کپ رکھ کر چلا گیا۔ شہباز شیخ نے کافی کا گھونٹ بھرا اور بولا۔

"شہریار بیگ صاحب! آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔"

"جی ہاں، شرطیں واقعی سخت ہیں لیکن سہولتیں بھی بہت ہیں۔ مثلاً جو لوگ بیس کروڑ روپے تک کا سرمایہ لگائیں گے انہیں ہم دو قسم کے منافع کی پیش کش کریں گے۔ اول چھتیس فیصد فلکسڈ منافع اور دوم خالص منافع میں سے تناسب کی بنیاد پر حصہ۔ مثلاً اگر کمپنی کو سو فیصد خالص منافع ہوتا ہے تو ہر حصے دار کو سو فیصد منافع ملے گا جو تین ڈائریکٹر اپوائنٹ کیے جائیں گے انہیں سات لاکھ روپے تنخواہ پینتیس فیصد کرایہ مکان، دس فیصد کار الاؤنس، سال میں ایک دفعہ مع فیملی یورپ کا مفت ٹور اور ٹیلی فون کی سہولت دی جائے گی اور منافع اپنی جگہ پر ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کا بڑے سے بڑا ادارہ بھی اتنی بڑی سہولتیں نہیں دے سکتا۔ اگر آپ بیس کروڑ روپے کے چار فلیٹ بنا کر انہیں کرائے پر چڑھا دیتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو تین لاکھ روپے ماہوار کرایہ بھی نہیں ملے گا۔ دردسری الگ ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پوزیشن کوئی نہیں ہوگی، لیکن ہماری کمپنی کا ڈائریکٹر گورنمنٹ کی وی آئی پی لسٹ پر ہوگا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک چوبیس پچیس سالہ لڑکی فائل ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوئی۔ اس کی نظریں فائل پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے شہباز شیخ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ فائل کے کاغذات پلٹتی ہوئی آگے بڑھی اور بولی۔

"شہریار صاحب، یہ کمپیوٹر کمپنی کا ایک بل۔"

تب ہی اس کی نظر شہباز شیخ پر پڑی۔ وہ جلدی سے رک گئی۔

"اوہ۔۔۔ سوری سر! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ مصروف ہیں۔"

"اٹس آل رائٹ مس زینب۔۔۔! کیا پرابلم ہے۔" شہریار بیگ نے کہا۔

مس زینب کے بال کٹے ہوئے تھے اور شانوں تک لمبے تھے۔ اس نے عنابی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور گلے میں لٹکنے والا دوپٹا خاصا غیر ضروری لگ رہا تھا۔ شہباز شیخ نے کسٹم افسروں والی نظر سے مس زینب کی طرف دیکھا اور تخمینہ لگایا کہ مس زینب نے جس خوب صورتی کے ساتھ "شہریار صاحب" کو "سر" میں تبدیل کیا تھا وہ کسی خوب صورت کہانی کا

پہلا جملہ معلوم ہوتا تھا۔

مس زینب، شہریار بیگ کی کرسی کے داہنی طرف مڑ گئی اور فائل اس کے سامنے کرتی ہوئی بولی۔

''پچھلے مہینے ہم نے کچھ کمپیوٹرز خریدے تھے یہ ان کا بل ہے۔ کمپنی کا سیلز مین چیک کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔''

''اس سیلز مین کو میرے پاس بھیج دو۔ آئی وڈ لائک ٹو سی ہز فیس۔'' شہریار بیگ گہری سانس لیتا ہوا بولا۔ مس زینب اوکے سر کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

لمحہ بھر کے بعد ایک بکھرے بالوں والا نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا سوٹ شدت سے ڈرائی کلیننگ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اس نے سلام کیا اور کہا۔

''سر میں کمپیوٹر کمپنی سے آیا ہوں۔''

شہریار بیگ نے نہ تو اس کے سلام کا جواب دیا اور نہ ہی اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ قدرے سخت لہجے میں بولا۔

''کیا کمپیوٹر کمپنی دیوالیہ ہوگئی ہے۔''

''نو سر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' سیلز مین دانت نکالتا ہوا بولا۔

''یو نو واٹ۔۔۔ افتخار احمد از مائے پرسنل فرینڈ آف مائن اور میں نے محض اسے اوبلائج کرنے کے لیے کمپیوٹرز خریدے ہیں۔ اولمپیاں والوں نے مجھے چھ مہینے کے کریڈٹ پر کمپیوٹرز آفر کیے تھے، لیکن میں نے صرف دوست کی خاطر ان کی آفر ٹرن ڈاؤن کردی۔''

سیلز مین گندے سے رومال کے ساتھ پسینہ پونچھتا ہوا بولا۔

''کوئی بات نہیں سر، میں تو یونہی سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔''

''افتخار احمد سے کہہ دینا کہ اف ہی از ان اے ہری۔ بے شک اپنے کمپیوٹرز اٹھالے۔ ابھی سب کے سب پیک پڑے ہیں۔''

سیلز مین معذرت کرتا ہوا کمرے سے رخصت ہوگیا۔

''بلڈی ایڈیٹ۔ صرف دو لاکھ روپے۔ اوہ مائی گاڈ، اتنی چھوٹی سی رقم کے لیے یہ لوگ ہمارے قالین گندے کرنے آجاتے ہیں۔'' شہریار بیگ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

شہباز شیخ سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی صورت نکل آئی تو وہ اس کمپنی میں ڈائریکٹر بننے کے لیے اپنا ایک بنگلہ تو ضرور فروخت کرڈالے گا۔

اتنے میں مس کرن کمرے میں داخل ہوئی اور دو فارم شہریار بیگ کے سامنے رکھتی ہوئی بولی۔

''سر، ہمارے اشتہار کے سلسلے میں دو صاحب اور آئے ہیں۔ یہ ان کے فارم ہیں۔''

''انہیں بٹھاؤ۔'' شہباز شیخ کافی کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔

''بیگ صاحب! میں تو بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے۔۔۔''

''میں آپ کا فارم رکھ لیتا ہوں۔ اگر کوئی صورت پیدا ہوئی تو آپ کو انفارم کردوں گا۔ کیا آپ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے ہیں۔۔۔'' شہریار بیگ نے کہا تو شہباز شیخ نے کہا۔

''میں کام پیسے ابھی نہیں دے سکتا۔ لیکن بیس پچیس روز کے اندر انتظام کرلوں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اتنا پیسہ نقدی کی صورت میں رکھنا مناسب نہیں ہوتا۔''

''یقیناً یقیناً روپے کی قیمت کم ہوتی رہتی ہے جبکہ جائیداد کی قیمت بڑھتی رہتی ہے۔ پیسے کو کبھی گھر میں نہیں رکھنا چاہیے۔'' شہریار بیگ نے کہا۔

شہباز شیخ جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ شہریار بیگ اس کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔

''میں آپ کو زیادہ امید تو نہیں دلاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ آپ کا چانس نکل ہی آئے۔ سرمایہ لگانے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن ہمیں ایسا آدمی چاہیے جو ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھا ہوا ڈائریکٹر

ہی لگے۔ ہم آیسے آدمی کو یہ پوزیشن نہیں دے سکتے جو کرسی پر پاؤں رکھ کر بیٹھنے کا عادی ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔''

''جی ہاں، اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' شہباز شیخ نے کہا۔

اس شام شہباز شیخ جب اپنے جی ٹائپ کوارٹر میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ فہمیدہ بیگم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی اس باورچی خانے کا سائز ان کے بنگلے کے اٹیچڈ باتھ روم سے تقریباً نصف تھا اور اس کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔

فہمیدہ اپنے میلے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی اندر آئی اور اپنے شوہر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئی بولی۔

''خدا خیر کرے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز دکھائی دیتی ہے۔'' شہباز شیخ نے دائیں بائیں دیکھا اور کہا۔

''کون سے دشمنوں کی۔''

''کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ میں آپ کی بات کر رہی ہوں۔'' فہمیدہ بیگم نے کہا۔ شہباز شیخ غصے سے بولا۔

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے اس قسم کے محاورے بالکل پسند نہیں کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں جب بیمار ہوتا ہوں تو تمہارا دشمن بن جاتا ہوں۔''

''آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ کہیں دفتر میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی۔ آج آپ نے گلیکسی کمپنی کے دفتر بھی جانا تھا نا۔''

''فضول باتیں نہیں کرو۔ جاؤ میرے لیے چائے بنا کر لاؤ۔'' شہباز شیخ نے چیخ کر کہا۔

فہمیدہ بیگم فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اس کی ایک عادت بڑی اچھی تھی۔ معاملے کی حقیقت سمجھے بغیر اپنے شوہر سے نہیں الجھتی تھی۔ اگر شہباز شیخ کسی دفتری یا بیرونی مسئلے کی وجہ سے پریشان ہوتا تھا تو وہ اس کا چڑچڑا پن برداشت کرلیتی، چپ رہتی اور حکمت کے ساتھ معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی۔ تاہم اگر شہباز شیخ کا چڑچڑا پن گھریلو معاملات کی وجہ سے ہوتا تو پھر وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتی اور خوب چیخ چیخ کر جی ٹائپ کوارٹر والوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتی۔

پندرہ منٹ بعد جب وہ چائے بنا کر لائی تو شہباز شیخ بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس نے چائے میز پر رکھ دی اور بیس سال پرانی آرام کرسی پر بیٹھ کر فرش کو گھورنے لگی۔ لمحہ بھر کے بعد شہباز شیخ نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر مقابلے کے آثار نہ پا کر دوبارہ چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''کیا تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے۔''

فہمیدہ بیگم بدستور فرش کو گھورتی ہوئی بولی۔

''کام ہی کر رہی ہوں۔''

''کیا کام کر رہی ہو۔'' شہباز شیخ چھت سے نظر ہٹائے بغیر بولا۔

''فرش کا سروے کر رہی ہوں۔''

''دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تمہارا۔ احمقوں کی طرح فرش کو گھورے جا رہی ہو۔'' شہباز شیخ نے کہا۔

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر یہ چھت تمہاری نظروں کی تاب نہ لاکر گر گئی تو اس فرش کی کیا اوقات رہ جائے گی۔''

شہباز شیخ اچھل کر سیدھا ہوگیا، بولا۔

''اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ چھت گر گئی تو فرش والوں کی کیا اوقات رہ جائے گی۔ کیا وہ پس نہ جائیں گے۔ خیر چھوڑو اس فضول فلسفے کو، لاؤ چائے بناؤ۔ گلیکسی کمپنی میں کام نہیں بنا۔ کہتے ہیں کہ سرکاری ملازمین کے لیے ان کے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ ڈائریکٹر کی پہلی کوالیفکیشن یہ ہے کہ وہ دس کروڑ روپے انویسٹ کرسکتا ہو۔''

''تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تمہاری ملازمت دو مہینے بعد ختم ہو رہی ہے۔''

''سب کچھ بتایا تھا۔ وہاں شہریار بیگ نام کا

ایک افسر بیٹھا تھا۔ مینجنگ ڈائریکٹر کی تختی لگی ہوئی تھی اس کی میز پر۔ وہ دو ہفتے کی گارنٹی دینے پر بھی تیار نہیں تھا۔ انہیں صرف سات حصے داروں کی ضرورت ہے جن میں سے صرف تین کو بطور ڈائریکٹر اپائنٹ کیا جائے گا اور ڈائریکٹر کو جو مراعات دی جائیں گی انہیں دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کے لیے تین کیا تین سو آدمی مل جائیں گے۔ میرے سامنے ہی دو آدمی اور پہنچ گئے تھے۔''

''ڈائریکٹر کی تنخواہ وغیرہ کیا ہوگی۔''

''پاگل ہو جاؤ گی تنخواہ وغیرہ سن کر۔'' شہباز شیخ نے کہا۔ اور پھر شہریار بیگ کی بتائی ہوئی ساری مراعات کے بارے میں کہہ سنایا۔ پھر بولا۔

''چھوڑو، کیا فائدہ ذکر کرنے کا۔ دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ لاؤ چائے دو۔''

فہمیدہ بیگم نے کپکپاتے ہاتھوں سے شوہر کو چائے کی پیالی پکڑائی۔ بولی۔

''اوہ۔ یہ تو واقعی بہت شاندار موقع ہے۔ اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ کیا نام بتایا مینجنگ ڈائریکٹر کا۔۔

''صاحب کا نام شہریار بیگ۔''

فہمیدہ بیگم کچھ سوچتے ہوئے شوہر سے بولی۔

''ایسا کرو کہ شہریار بیگ کو ہفتے کی رات دعوت پر بلالو۔ باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ویسے۔ تمہارے صاحب کی عمر کتنی ہوگی؟''

''عمر کی کیا ضرورت پڑ گئی۔''

''میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ شہریار بیگ کو متاثر کرنے کے لیے کون سا فارمولا مناسب رہے گا۔''

''عمر چالیس سال کے آس پاس ہے اور خاصا اسمارٹ شخص ہے۔'' شہباز شیخ نے کہا۔

فہمیدہ بیگم تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ ہلاتی ہوئی بولی۔

''بس بس ٹھیک ہے، تم اسے دعوت کا پیغام دے دو۔''

شہباز شیخ کو امید نہیں تھی کہ شہریار بیگ اس کی دعوت قبول کرلے گا۔ لیکن اس نے سوچا کہ یہ طریقہ بھی استعمال کر کے دیکھ لینا چاہیے۔ اگلے روز نے بے دلی کے ساتھ شہریار بیگ کو فون کیا اور اپنی بیوی کے حوالے سے دعوت کا ذکر کیا۔ شہریار بیگ نے قدرے پس وپیش کے بعد اس کی دعوت قبول کرلی۔

ہفتے کی شام دو ہزار گز کے بنگلے میں دعوت کے انتظام مکمل ہو چکے تھے۔ اور فہمیدہ بیگم انتظامات کا جائزہ لے رہی تھی۔ گلابی رنگ کی بیش قیمت ساڑھی اور بھوری وگ میں وہ کم عمر لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ستائیس اٹھائیس سال کی ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھی، جسے اس نے خاص طور پر اس دعوت کے لیے مدعو کیا تھا۔

خاتون کا نام عائشہ صدیقی تھا۔ اور وہ بھڑکیلی ساڑھی اور چمکدار بلاؤز کی وجہ سے فہمیدہ بیگم کے بھی کان کاٹ رہی تھی۔ اس نے اس دعوت کے لیے خاص طور پر ایک اعلا قسم کے بیوٹی پارلر سے بال بنوائے تھے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی صاحب حیثیت ماڈرن فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک غریب گھرانے کی فرد تھی۔ اور ایک فرم میں بحیثیت اسٹینو گرافر کام کرتی تھی۔ تاہم وہ ہر لڑکی کی طرح کسی اونچے موقعے کی تلاش میں تھی۔ جب فہمیدہ بیگم نے بتایا کہ ایک فارن کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ان کے ہاں مدعو ہے تو وہ بھی اس دعوت میں شامل ہونے کے لیے بے چین ہوگئی۔ اس نے سوچا شاید ہی وہ موقع ہو جو اس کی زندگی میں آسائشوں کے دروازے کھول دے۔ فہمیدہ بیگم نے اس کی خواہش پر اسے بھی دعوت میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔

انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد دونوں خواتین نشست گاہ میں بیٹھ گئیں۔ فہمیدہ بیگم اپنی طلائی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولیں۔

''آنے ہی والے ہوں گے۔''

''کیا پہلی دفعہ آرہے ہیں۔'' عائشہ نے

پوچھا۔

''گھر میں تو پہلی مرتبہ آرہے ہیں۔لیکن شہباز سے اکثر ملتے رہتے ہیں۔''

''اللہ پھر تو اپنے میاں سے کہہ کر میرا کام کروادو، ویسے ان کے ہاں اسٹینوگرافر کو تنخواہ کتنی ملتی ہوگی؟''

''پچیس تیس ہزار تو ضرور ہوگی۔ شہباز کو لاکھوں روپے کی آفر کی ہے کار، بنگلہ اور ٹیلی فون اس کے علاوہ ہوگا۔ سال میں ایک دفعہ پوری فیملی کو یورپ کا دوطرفہ ٹکٹ بھی ملے گا۔لیکن شہباز تیار نہیں ہورہے۔ کہتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمت کرنے کو دل نہیں چاہتا۔یوں بھی ہمیں کس چیز کی کمی نہیں ہے۔''

''اللہ۔۔۔شہباز بھائی سے کہو کہ وہ انکار نہ کریں۔زندگی میں ایسا اچھا چانس بہت کم ملتا ہے۔ اگر انہوں نے آفر قبول کرلی تو میرا چانس یقینی ہوجائے گا۔''

''ہاں میں نے کہا تو ہے، دیکھیں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔'' فہمیدہ بیگم بے پروائی سے بولیں۔

اتنے میں باہر کار رکنے کی آواز سنائی دی اور علیزہ تیز چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''ممی۔ممی۔وہ آگئے ہیں۔ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی ہیں۔'' اس نے کہا۔ فہمیدہ بیگم اور عائشہ صدیقہ مہمان خصوصی کے استقبال کے لیے دروازے کی طرف بڑھیں۔علیزہ بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔اس نے کارلر والی رنگین شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔اس لمحے کاشان بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔ باہر سے کاروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔عائشہ، فہمیدہ بیگم کے کان میں سرگوشی کرتی ہوئی بولی۔

''میرا تعارف کیسے کراؤ گی؟''

''کزن اور کیا۔'' فہمیدہ بیگم نے کہا اور دونوں اسکول کی لڑکیوں کی طرح کبھی کبھی بال ٹھیک کرنے لگیں۔

لمحہ بھر کے بعد شہریار بیگ، شہباز شیخ کی معیت میں کسی سربراہ مملکت کی طرح نشست گاہ میں داخل ہوا۔اس کی چال میں رعب اور وقار پایا جاتا تھا۔اس کی داہنی طرف ایک اسمارٹ نوجوان تھا جس کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ تھی۔

''یہ میری مسز ہیں۔اس دعوت کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔'' شہباز شیخ نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' شہریار بیگ صاحب نے فہمیدہ بیگم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔پھر اس نے مسکرا کر اضافہ کیا۔

''شہباز صاحب، سہرا ہمیشہ مردوں کے سر پر باندھا جاتا ہے۔''

''حالانکہ اصل حق عورتوں کا ہوتا ہے۔'' عائشہ صدیقی نے جلدی سے گرہ لگائی۔

''یہ دور بھی آنے ہی والا ہے۔لڑکی سہرا باندھ کر بارات لے کر جائے گی اور لڑکا گھونگھٹ نکال کر آنسوؤں کے ساتھ رخصت ہوگا۔'' شہباز شیخ نے کہا۔

سب نے قہقہہ لگایا۔شہریار بیگ دلچسپ نظروں سے عائشہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں! کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔''

فہمیدہ بیگم عائشہ کا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

''یہ میری کزن مس عائشہ صدیقی۔'' شہریار بیگ عائشہ کے ساتھ ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''یہ میری بیٹی علیزہ ہے۔''

''ویری کیوٹ۔'' شہریار بیگ علیزہ کا گال تھپتھپاتا ہوا بولا۔

''اور یہ کاشان ہے۔''

''ہیلو ینگ مین۔'' شہریار بیگ نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔پھر اسے اچانک اپنے ساتھ آنے والے نوجوان کا خیال آیا۔

آذر نے متوقع نظروں سے خواتین کی طرف دیکھا۔ لیکن کاشان نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور زور زور سے ہلانے لگا۔

''بے چارہ سیکریٹری! پتا نہیں کب چھٹی کرتا ہوگا۔'' عائشہ نے فہمیدہ کے کان میں کہا۔ دونوں ہی کھی کھی کرنے لگیں۔

کھانے کے دوران دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ شہریار بیگ نے بنگلے کی آرائش کی تعریف کی اور کھانے کے بعد فہمیدہ بیگم، شہریار بیگ کو پورا بنگلا دکھانے کے لیے لے گئی۔ دراصل وہ اپنے شوہر کے لیے بات کرنا چاہتی تھی۔

نصف گھنٹے کے بعد جب وہ بنگلے کا چکر لگا کر واپس آئے تو فہمیدہ بیگم بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ شہباز شیخ نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ ویسے عائشہ بھی کم خوش نہیں تھی۔ ڈنر کے بعد موسیقی کے شور میں وہ بھی شہریار بیگ کے کافی قریب ہوگئی تھی اور اس سے ملاقات کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔

رات کے گیارہ بجے شہریار بیگ اپنے سیکریٹری کے ہمراہ رخصت ہوگیا تو کاشان، عائشہ کو اس کے گھر چھوڑنے چلا گیا۔ تنہائی ہوتے ہی شہباز شیخ نے فہمیدہ بیگم سے پوچھا کہ شہریار بیگ سے کیا بات ہوئی تھی۔۔

''میں نے کہا تھا نا کہ کام ہوجائے گا۔ تمہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ میرے بغیر تم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔'' فہمیدہ بیگم نے کہا۔

''کیا واقعی۔۔ کیا شہریار بیگ مجھے ڈائریکٹر بنانے پر راضی ہوگیا ہے۔ کیا بات ہوئی تھی۔۔'' شہباز شیخ اچھل ہی پڑا تھا۔

''شہباز شیخ تم وی آئی پی بن چکے ہو۔ مبارک ہو۔''

''مبارک۔ مبارک، تمہیں بھی مبارک ہو۔ ذرا تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔''

''تفصیل رہنے دو، شہریار بیگ نے تمہیں پرسوں بلایا ہے۔''

علیزہ جو باورچی خانے میں برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھی، ممی ڈیڈی کی پرجوش آوازیں سن کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

''آپ لوگ کس بات پر اتنے خوش ہو رہے ہیں۔ کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''خزانہ ہی سمجھو۔ میری زندگی بھر کی تمنا پوری ہوگئی ہے۔ میں۔۔۔ میں گلیکسی آئل کمپنی کا ڈائریکٹر بن گیا ہوں، وی آئی پی بن گیا ہوں۔ اب ہم لوگ بڑی بڑی پارٹیوں میں جایا کریں گے۔'' فہمیدہ بیگم بات آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

''اور پتا ہے کیا۔ اب ہم لوگ ہر سال یورپ کے ٹور پر جایا کریں گے۔''

''کیا۔۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔۔'' علیزہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

فہمیدہ بیگم بیٹی کو تفصیل بتانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کاشان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے نئے سرے سے تفصیل بتانا پڑی۔ کاشان نے کہا۔

''ڈیڈی، آپ تو چھپے رستم نکلے۔ مجھے تو وہم بھی نہیں تھا کہ آپ کے اتنی لفڈ موجود ہیں۔''

شہباز شیخ سنجیدہ ہوگیا۔ اور بولا۔

''ہم کامیابی کی خوشی میں ایک بات تو بھول ہی گئے۔ روپوں کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔''

''کیا مطلب۔ کیا آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔۔'' فہمیدہ بیگم نے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ تین چار روپے ہوں گے۔ باقی کا کہیں سے انتظام کرنا پڑے گا یا پھر جائیداد بیچنی پڑے گی۔''

''جائیداد! کون سی جائیداد؟''

''بھئی یہ دو مکان ہی تو ہیں ہمارے پاس اور کون سی جائیداد ہے۔''

''اوہ نو۔ اس بنگلے کو تو آپ بھول ہی جائیں۔ کوئی اور جائیداد ہو تو اسے بے شک فروخت کردیں۔'' علیزہ جلدی سے بولی۔

''اگر آپ نے یہ بنگلا فروخت کر دیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ گلشن والا مکان تو کرائے پر چڑھا ہوا ہے۔'' کاشان نے کہا۔ اس پر علیزہ برا سا منہ بناتی ہوئی بولی۔

''جائیں گے کہاں اسی جی ٹائپ جنجال میں پڑے لڑتے رہیں گے۔ ہم تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے ہیں اور آپ اسے بیچنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔''

''ابھی تو ہم چوروں کی طرح یہاں آتے ہیں اور چوروں کی طرح چلے جاتے ہیں۔ رہنے کا صحیح لطف تو اس وقت آئے گا جب ہم ڈنکے کی چوٹ پر یہاں رہیں گے، دوستوں کو بلائیں گے، پارٹیاں کرائیں گے اور دشمنوں کو اپنا کروفر دکھا کر خوب جلائیں گے۔''

''اور پتا ہے کیا۔ آپ کی ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنی پوری کلاس کی پارٹی کروں گی اس بنگلے میں۔ وہ ارم اور نازش اور بینش وغیرہ تو جل کر سیخ کباب بن جائیں گی۔ ارم کا تو ہارٹ ہی فیل ہو جائے گا۔ ہر وقت اپنی چار سو گز کے بنگلے کی تعریفیں کرتی رہتی ہے۔'' علیزہ نے کہا۔

''اور کیا۔ میرے دوست بھی ہمارے جی ٹائپ کوارٹر کے ذکر پر ناک چڑھاتے ہیں۔ وہ کاشف پتا ہے کیا کہہ رہا تھا۔'' کاشان نے علیزہ کی تائید کرتے ہوئے بتایا۔

''کیا کہہ رہا تھا۔'' علیزہ نے پوچھا۔

''کہنے لگا میرے ابا جان نے بنگلہ بک کرایا ہے۔ ایک تو مجھے یہ ابا جان مارکہ اولاد بڑی بیک ورڈ۔ آئی مین قدامت پسند معلوم ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہڑپا کی تہذیب کا کوئی خاندان زندہ ہو گیا ہو۔ ہونہہ ابا جان نے بنگلہ بک کرایا ہے میں نے پوچھا کتنا بڑا بنگلہ۔ بولا۔ ایک سو بیس گز کا۔'' کاشان نے کہا اور قہقہہ لگایا۔ علیزہ نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور ہنستے رہ گئی۔

''ایک سو بیس گز کا بنگلا۔'' اس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''واٹ اے جوک! بنگلا اور وہ بھی ایک سو بیس گز کا۔ بائی گاڈ، پاگل ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک سو بیس گز میں تو سرونٹ کوارٹر بھی نہیں بنتا۔ کاشان، اپنے کاشف یار سے کہنا کہ کچھ کم کرے۔''

''شکر کرو اس نے پیلس نہیں کہہ دیا۔ ورنہ تم اس کا کیا کر لیتیں۔''

''بنگ۔۔۔ لا۔'' علیزہ نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔

''ایک سو بیس گز کا۔ ڈیڈی آپ وہ ایک بونگا سا گانا سنایا کرتے ہیں نا، ایک بنگلا بنے نیارا، جس میں بسے دے کنبہ سارا۔''

''یہ فضول باتیں پھر کبھی کر لینا۔ اس وقت میرے بلکہ ہم سب کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ اگر پیسوں کا انتظام نہ ہو سکا تو مجھے ملازمت کبھی نہیں ملے گی۔ پھر نہ یورپ کے ٹور ہوں گے اور نہ عیش و آرام۔ بنگلے میں رہنا اور دال روٹی پر گزارا کرنا۔'' شہباز شیخ نے کہا۔

فہمیدہ بیگم نے سگریٹ سلگایا اور کش لینے کے بعد بولی۔

''آپ کہیں اور سے رقم کا انتظام کر لیں نا۔ بچے ٹھیک ہی کہتے ہیں اگر بنگلہ نہ ہوا تو رہیں گے کہاں۔''

''یہ کوئی اتنی معمولی رقم نہیں ہے فہمیدہ بیگم۔ بنگلا کرائے پر بھی لیا جا سکتا ہے لیکن ایسی نوکری دوبارہ نہیں ملے گی۔''

''ڈیڈی آپ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ اپنے مستقبل کی فکر کرنا چھوڑ دیں کیونکہ آپ اپنے مستقبل میں جی رہے ہیں۔ اصل مسئلہ ہمارے مستقبل کا ہے۔'' کاشان نے کہا۔

''تمہارا مستقبل میرے مستقبل سے وابستہ ہے۔ اگر میری تنخواہ اور پوزیشن اچھی ہوگی تو تم لوگوں کی بھی عزت ہوگی۔ تم فخر سے اپنے دوستوں کو کہہ سکو گے کہ ہمارے ڈیڈی کلیکسی آئل ایکسپلوریشن

کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ کے ڈائریکٹر ہیں اور یہ بھی کہ پچھلے سال ہم فرانس کے ٹور پر گئے تھے۔ اس سال سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔ یہ نوکری نہیں سونے کی چڑیا ہے۔ سونے کی چڑیا۔ میں کتنے ہی ریٹائرڈ افسروں کو جانتا ہوں جو پرائیویٹ فرموں میں معمولی تنخواہ پر دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تم لوگوں کو اس نوکری کی ضرورت ہے۔ میرا کیا ہے۔ میں تو دال روٹی پر بھی گزارا کرلوں گا۔''

یہ تقریر کام کر گئی۔ علیزہ اور کاشان کا احتجاج کمزور پڑ گیا۔ کئی گھنٹے کی بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ بنگلہ فروخت کرنے سے پہلے کرائے کے بنگلے کا انتظام کر کے سارا فرنیچر اس میں منتقل کر دیا جائے اور شہباز زیادہ سے زیادہ دو سال کے اندر دوسرا بنگلہ خرید لے گا۔

سوموار کے روز شہباز شیخ دوبارہ شہریار بیگ سے ملا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اصلی موضوع کی طرف آتا ہوا بولا۔

''میری مسز نے بتایا ہے کہ آپ نے میرے لیے کوئی راستہ نکالنے کا وعدہ کیا ہے۔'' شہریار بیگ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم ملاتا ہوا بولا۔

''کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ ایک ہفتے کے دوران پورے میں افراد میرے پاس آئے ہیں۔ جن سے بارہ افراد صرف سرمایہ لگانا چاہتے ہیں۔ البتہ گیارہ آدمی ایسے ہیں جو ڈائریکٹر بننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں سے سات آدمی ڈائریکٹر کی پوزیشن کے لیے کوالیفائی کرتے ہیں اور ہر شخص مصر ہے کہ اسے موقع دیا جائے اور کچھ تو مجھے نذرانہ پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ بٹ یونو، آئی ایم اے مین آف پرنسپل۔''

''جی جی وہ تو مجھے پہلے ہی روز اندازہ ہو گیا تھا۔ آپ جیسے بااصول اور صاحب فہم لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔'' شہباز شیخ نے لفظوں کا نذرانہ پیش کیا۔ شہریار بیگ چند لمحے غور کرنے کے بعد بولا۔

غائب دماغ پروفیسر

ایک غائب دماغ پروفیسر کوئی کتاب پڑھنے میں محو تھے، قریب بیٹھی ہوئی بیگم نے اخبار پڑھتے ہوئے اچانک کہا۔

''ہائے..... ہائے، اس اخبار میں تو تمہاری موت کی خبر چھپی ہے۔''

پروفیسر کتاب سے نظر ہٹائے بغیر بولے۔ ''ذرا قل خوانی کی تاریخ اور وقت پڑھ لینا، ہمیں ان کے ہاں جانا پڑے گا۔''

بہرا

ایک بہرا دیہاتی بینگن لیے جا رہا تھا، راستے میں اس کا دوست مل گیا۔

دوست: ''کیوں بھائی، خیریت تو ہے؟''

دیہاتی: ''بینگن لے کر جا رہا ہوں۔''

دوست: ''بچے تو ٹھیک ہیں؟''

دیہاتی: ''ہاں، گھر جا کر سب کا بھرتہ بناؤں گا۔''

پسینہ

استاد (شاگرد سے): ''کم بخت تمہیں سائنس آتی ہے نا جغرافیہ، آخر تمہیں آتا کیا ہے؟''

شاگرد: ''جناب! ان مضمون کا سن کر پسینہ آتا ہے۔''

آخری خواہش

جج (پھانسی کے مجرم سے): ''تمہاری اگر کوئی آخری خواہش ہے تو بیان کرو پوری کر دی جائے گی۔''

مجرم (خوش ہو کر): ''اس وقت میں امریکہ کا صدر بننا چاہوں گا۔''

''آپ ایسا کریں کہ رقم تو جمع کرا ہی دیں۔ آپ چونکہ سب سے پہلے میرے پاس آئے تھے اس لیے آپ کا حق بھی زیادہ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ امکانی طور پر قوائد میں کچھ لچک پیدا کرنی پڑے گی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ پوری رقم جمع کرادوں۔'' شہباز شیخ نے میز کے نیچے دونوں ہاتھ ملے۔

''ہاں اس کے بغیر میں آپ کا کیس فارورڈ نہیں کرسکتا۔''

''جیسا کہ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا کہ فی الحال میں تین کروڑ روپے جمع کرا دیتا ہوں۔ باقی سات کروڑ کے لیے آپ کو مجھے چند روز کی مہلت دینی پڑے گی۔''

شہریار بیگ نے اپنے خوب صورت ڈیسک کیلنڈر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو زیادہ سے زیادہ پندرہ دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔''

''اوکے سر۔'' شہباز شیخ نے کہا۔ اس نے خود کو کمپنی کا ڈائریکٹر سمجھنا شروع کردیا تھا۔

''میں کل یا پرسوں روپے جمع کرا دیتا ہوں۔ باقی رقم ان شاء اللہ دس بارہ روز کے اندر جمع کرادوں گا۔''

شہریار بیگ نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور کہا۔

''مس کرن ایک منٹ کے لیے میرے کمرے میں آیئے۔''

لمحہ بھر کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی پروقار سی خاتون کمرے میں داخل ہوئی شہریار بیگ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''شہباز صاحب یہ میری پرسنل اسسٹنٹ مس کرن ہیں اور یہ شہباز شیخ صاحب ہیں۔''

شہباز شیخ نے کھڑے ہوکر کرن سے ہاتھ ملایا اور رسمی کلمات کہے۔ شہریار بیگ نے دراز سے ایک فارم نکال کر کرن کی طرف بڑھایا۔

''مس کرن یہ شہباز شیخ صاحب کا فارم ہے۔ ان کا بانڈ اور کنٹریکٹ تیار کرلو، یہ کل تین کروڑ روپے جمع کرادیں گے۔ اوکے شہباز صاحب، آپ کل آجائیں۔ شاید میں نہ ملوں، کیونکہ میرا منسٹر آف آئل اینڈ گیس کے ساتھ اپائنٹ منٹ ہے، مس کرن آپ کی خدمت کے لیے یہاں موجود ہوں گی۔ کل آپ کنٹریکٹ اور بانڈ پیپر بھی دستخط کردیں۔'' شہباز شیخ نے سلام کیا اور اٹھ کر رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد کرن نے دروازہ مقفل کیا اور دھم سے صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ پھر بولی۔

''شہریار تم واقعی جینئس ہو۔ تمہیں لوگوں کی جیبوں سے پیسہ نکالنا خوب آتا ہے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ پھر بولی۔

''بائی دا وے، یہ منسٹر آف آئل اینڈ گیس کا نام کیا ہے؟''

''چھوڑو بھئی نام میں کیا رکھا ہے۔'' شہریار بیگ نے کہا۔

''اگر یہ شہباز شیخ تم سے نام پوچھ لیتا تو پھر۔''

''گلیکسی آئل ایکسپلوریشن کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر سے کوئی شخص اس قسم کا سوال کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ سناؤ صورت حال کیسی ہے۔'' شہریار نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔

''صورت حال خوش کن ہے۔ اگر یہ شخص کل تین کروڑ روپے لے آیا تو بیلنس اسی کروڑ ہوجائے گا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ جب ہم فلائی کر جائیں گے تو ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔''

''ان لوگوں نے حرام کا مال اکٹھا کر رکھا ہے۔ ان کا جو بھی حشر ہو وہ کم ہے۔ شہباز شیخ کے پاس رشوت کا پیسہ ہے۔ ذوالفقار بھٹی کے پاس چور بازاری کا پیسہ ہے، ہمایوں جہانزیب نے چرس بیچ کر پیسہ کمایا ہے اور اپنا عمیر لغاری پکا اسمگلر ہے۔ ان لوگوں کا پیسہ ہمارے لیے جائز ہے۔''

''جائز ناجائز کے چکر میں مت پڑو شہریار بیگ۔ انہوں نے جو کچھ کیا، وہ بھی حرام تھا اور جو کچھ

ہم کررہے ہیں حلال وہ بھی نہیں ہے۔'' کرن نے کہا۔

''تمہارا یہ فلسفہ مجھے بہت بور کرتا ہے۔ ایک بات یاد رکھو جو کچھ کرو، وہ پورے یقین کے ساتھ کرو۔ یا پھر بالکل مت کرو۔''

''تمہارے یقین میں تو واقعی کوئی شک نہیں ہے۔ اس روز وہ کمپیوٹر کمپنی کا کارندہ نہایت بوکھلایا ہوا تمہارے کمرے سے نکلا تھا۔ اس کے بعد بے چارے کی شکل دکھائی نہیں دی۔'' کرن نے کہا۔

''ٹکٹوں کی کیا پوزیشن ہے۔۔۔'' شہریار بیگ نے پوچھا۔

''ٹکٹ تقریباً دو ہفتے کے اندر مل جائیں گے۔''

اسی لمحے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ شہریار اٹھ کر میز کے قریب گیا اور انٹرکام کا بٹن دبا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے مس زینب کی آواز ابھری۔

''سر! یہ عنایت صاحب کارپٹ کے بل کے سلسلے میں آئے ہیں۔''

''مس زینب! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس وقت میٹنگ میں ہوں۔''

''سوری سر! یہ عنایت صاحب اسرار کررہے ہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ! ذرا عنایت صاحب کو ریسیور دینا۔''

لمحہ بھر کے بعد دوسری طرف سے ایک درویشانہ قسم کی آواز سنائی دی۔

''میں نے کہا شہریار بیگ صاحب، کیا حال چال ہیں۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شہریار نے کسی مصروف افسر کی طرح کہا۔

''معاف کرنا عنایت صاحب میں اس وقت ایک نہایت اہم میٹنگ میں مصروف ہوں۔ آپ کے بل کی رقم کتنی ہے۔''

''بل کی کوئی بات نہیں جی۔ میں تو یونہی سلام کرنے حاضر ہوا تھا۔ صرف پچھتر ہزار روپے کا بل ہے۔ میں۔ میں پھر حاضر ہوجاؤں گا۔''

''پلیز۔ برا نہیں منانا۔''

انٹرکام بند کرنے کے بعد وہ پرخیال نظروں سے کرن کی طرف دیکھنے لگا۔

شہریار بیگ سے بات کرنے کے بعد شہباز شیخ نے پہلا کام یہ کیا کہ تین اخباروں میں بنگلے کی فروخت کا اشتہار دے دیا۔ اگلے روز اس نے اپنا لاکر چیک کیا۔ اس میں نقد رقم، پرائز بانڈ اور سیونگ سرٹیفکیٹ وغیرہ ملا کر پورے تین کروڑ روپے بن گئے اگلے روز وہ گلیکسی آئل کمپنی کے دفتر پہنچا تو کرن کی میز پر نوٹوں کی گڈیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ کرن نے نوٹوں کی گڈیوں کو شمار کرکے دراز میں رکھ لیا اور انٹرکام کے ذریعے زینب کو اپنے دفتر میں بلایا۔ اس نے کہا۔

''مس زینب ان سے ملو یہ شہباز شیخ صاحب ہیں۔ ہماری کمپنی کے ہونے والے سیلز ڈائریکٹر اور یہ زینب ہیں ہماری کمپنی کی چیف اکاؤنٹنٹ۔''

شہباز شیخ نے زینب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور رسمی کلمات کہے۔

''مس زینب ان کی دی گئی رقم کی سلپ انہیں دے دیجئے۔'' شہباز شیخ نے مس زینب کے پیش کردہ چند کاغذات پر دستخط کیے اور رخصت ہوگیا۔

اگلے چند روز تک وہ بنگلے کی فروخت کے سلسلے میں الجھا رہا۔ کئی خریدار آئے اور بنگلہ دیکھ کر چلے گئے۔ کسی نے بہت اچھی آفر نہیں دی۔ تیرھویں روز ایک پارٹی نے فرنیچر سمیت اچھی آفر دی۔ شہباز شیخ نے اپنے بیوی بچوں کو بتائے بغیر یہ آفر قبول کرلی اور رقم وصول کرنے کے بعد گلیکسی آئل کمپنی کے دفتر میں جمع کرادی۔

دولت اور اقتدار کے پیچھے بھاگنے والے اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ کتنے لوگ ان کے پیروں کے نیچے کچلے جارہے ہیں اور کتنے خاندان تباہ ہورہے ہیں۔ شہریار بیگ کی لپیٹ میں جو لوگ آئے تھے ان میں زینب عثمان بھی تھی۔ وہ ایک غریب

خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس کا باپ عثمان معمولی پڑھا لکھا آدمی تھا اور ویلڈنگ کا کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جب اس کی بینائی متاثر ہونے لگی تو ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ویلڈنگ کا کام چھوڑ دے لیکن غریب آدمی جو اپنے کنبے کا واحد کفیل ہو، کام نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اسی وقت کام چھوڑتا ہے جب کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ عثمان بھی آخر وقت تک کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ اس نے ایک آپریشن کرایا جو ناکام رہا۔ دوسرا آپریشن کرایا کچھ فائدہ ہوا لیکن ڈاکٹروں نے تیسرے آپریشن مشورہ دیا جو آخری ثابت ہوا۔ عثمان کی رہی سہی بینائی بھی جاتی رہی۔ اس کی دنیا تاریک ہوگئی۔ کارخانے کے مالک نے اس کی پندرہ سالہ خدمات کے عوض چند ہزار روپے دے کر گھر بھیج دیا۔

زینب نے جب یہ دیکھا تو فوراً باپ کا سہارا بن گئی۔ وہ ایم۔ بی۔ اے کر چکی تھی اور خاصی ذہین لڑکی تھی۔ اس نے جگہ جگہ درخواستیں بھجوانا شروع کردیں۔ بالآخر اسے بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس دوران میں اس نے اکاؤنٹسی کے چند مزید کورس کرلیے اور بینک میں پروموشن کی درخواست دے دی۔ چونکہ اس کے کام کی رپورٹ بہت اچھی تھی اس لیے اسے توقع تھی کہ پروموشن ہوجائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے اس دوران اس کی ملاقات شہریار بیگ سے ہوگئی۔ یہ ملاقات بینک میں ہی ہوئی تھی۔ زینب شہریار کی پرکشش اور اسمارٹ شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ شہریار نے اس کی کیفیت کو بھانپ اور ایک سے ایک بہترین ہوٹل میں ڈنر کی دعوت دی۔ زینب نے قدرے تامل کے بعد اس دعوت کو قبول کرلیا۔ ان دنوں شہریار گلیکسی آئل کمپنی والے منصوبے پر کام کررہا تھا۔ اور یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اگر خوب صورت سی سیکریٹری ساتھ ہو تو لوگ آسانی کے ساتھ قابو میں آجاتے ہیں۔

جہاں تک زینب کا تعلق تھا، وہ فوراً شہریار کی پرفریب باتوں میں آگئی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ ملازمت کے علاوہ اسے مستقبل کی فکر بھی تھی۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ اس کی شادی کا انتظام نہیں کرسکیں گے۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی تھا کہ اس کے ماں باپ اس کی شادی کے بارے میں چشم پوشی برت رہے تھے۔ کیونکہ اس کی تنخواہ پر سارا گھر چل رہا تھا۔ لہٰذا اس کی شادی کا مطلب لگی بندھی سے محرومی تھا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس جہیز نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کیونکہ تنخواہ پوری کی پوری گھر میں استعمال ہوجاتی تھی۔

اس صورتحال میں شہریار نے اسے ملازمت اور محبت پیش کی تو وہ انکار نہ کرسکی۔ اس نے گھر والوں اور ہمدردوں کے منع کرنے کے باوجود بینک کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور شہریار کی گلیکسی آئل کمپنی میں چیف اکاؤنٹنٹ بن گئی۔ شہریار اسے شادی کے پرفریب وعدے پر ٹالتا رہا لیکن جب اس نے کرن مرتضیٰ کو ساتھ ملایا تو زینب کو نظر انداز کرنا شروع کردیا۔ کرن مرتضیٰ ایک ہوشیار عورت تھی۔ اس لیے وہ چند دنوں کے اندر شہریار کا کھیل سمجھ گئی۔ شہریار نے اسے رشوت دینے یا الگ کرنے کے بجائے اپنا رازدار بنالیا کیونکہ کرن مرتضیٰ بھی اس کی لائن سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ فراڈ کے ایک کیس میں سزا پاچکی تھی اور شہریار کے لیے زبردست مسئلہ بن سکتی تھی۔ اسے رازدار بنانے کے باوجود شہریار کی نیت صاف نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اس سے بعد میں نمٹ لے گا۔

کرن مرتضیٰ کی آمد سے پہلے شہریار ہر دوسرے تیسرے روز زینب کو سیر کرانے یا کھانے کھلانے کے لیے ساتھ لے جاتا تھا۔ لیکن کرن کی آمد کے بعد یہ سلسلہ تقریباً بند ہوگیا تھا۔ زینب نے ایک دو مرتبہ شکایت کی تو شہریار نے اپنی بے التفاتی کو مصروفیت کے پردے میں چھپالیا۔

ہفتے کے روز زینب نے کرن کو دفتر سے باہر

جاتے دیکھا تو ایک فائل اٹھا کر شہریار کے کمرے میں پہنچ گئی۔ شہریار میز پر پیر رکھے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اور وہ کرن کے ہمراہ عنقریب لندن جانے والا تھا۔

''کیا میں بیٹھ سکتی ہوں۔۔'' زینب نے کہا۔

''کیوں نہیں آؤ بیٹھو۔ کیا کوئی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔'' شہریار نے پیر نیچے کرلیے اور مسکرا کر بولا۔

زینب کرسی پر بیٹھ گئی اور چند لمحوں تک اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''شہریار صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔''

''کوئی مالی مسئلہ پیش آ گیا ہے؟''

''شہریار صاحب! آپ انجان بننے کی کوشش کررہے ہیں۔ حالانکہ آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ آپ نے میرے ساتھ کچھ وعدے کررکھے ہیں۔ لیکن اب میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی نظریں بدلتی جارہی ہیں۔''

''معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے واقعی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ میں دن بھر ڈراؤنے خواب دیکھتی ہوں۔ شہریار صاحب! آپ نے مجھے بہت دور پہنچادیا ہے۔ ایسی جگہ پہنچادیا ہے جہاں سے واپسی کی کوئی امید نہیں ہے۔ ہمارے رشتہ داروں اور عزیزوں کو ساری باتوں کا علم ہوچکا ہے۔ وہ طرح طرح کی باتیں بنارہے ہیں۔''

''احمق مت بنو! لوگوں کی باتوں سے ڈروگی تو جینا دوبھر ہوجائے گا۔'' شہریار پروائی سے بولا۔

''شہریار صاحب! میں کسی اونچی فصیلوں والے محل میں نہیں رہتی۔ ہمارے گھر کی دیواریں بہت چھوٹی اور کمزور ہیں۔ گلی میں کوئی چھینک ماردیتا ہے تو ہمارے دروازے ہلنے لگتے ہیں۔ ہم اونچی آواز میں سانس بھی لیتے ہیں تو پڑوسیوں کے کانوں میں ہماری آواز پہنچ جاتی ہے۔''

''مس زینب ان ساری باتوں کا مقصد کیا ہے؟''

''شہریار صاحب! آپ سے ملنے سے پہلے میں نے اپنے گرد ایک حصار باندھ رکھا تھا اور اپنے حالات پر قانع تھی۔ مگر آپ نے وہ حصار توڑ دیا ہے اور اب آپ کی بے رخی کے باعث میں خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرنے لگی ہوں۔''

''اوہ کم آن زینب! تمہیں وہم ہوا ہے۔ میں نے تم سے کوئی بے رخی نہیں برتی۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں پہلے سے زیادہ مصروف رہنے لگا ہوں۔''

''کرن کے آنے کے بعد آپ کچھ زیادہ ہی مصروف رہنے لگے ہیں۔''

''بھئی تم لڑکیاں بہت جذباتی ہوتی ہو۔'' شہریار نے چالاکی سے کہا۔

''کرن تمہارے پیروں کی خاک بھی نہیں ہے۔ بس اتنا ہے کہ وہ اپنے کام میں ماہر ہے، اس وجہ سے ذرا خیال رکھنا پڑتا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔''

زینب کو اس جھوٹ پر پھر یقین آ گیا۔ شہریار اسے مزید بے وقوف بناتے ہوئے بولا۔ ''اور پتا ہے کیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگلے مہینے کچھ ہوجائے۔''

''جی! کیا۔''

''ارے کوئی دھوم دھڑکا، کوئی بینڈ باجا وغیرہ۔''

''کیا آپ سنجیدہ ہیں۔۔'' زینب کی اداسی خوشی میں تبدیل ہوگئی۔

شہریار بیگ نے دراز سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور زینب کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''یہ رکھ لو۔ کل اپنے لیے کچھ کپڑے خرید لینا۔ چند روز کے بعد تفصیلی پروگرام طے کریں گے۔''

زینب نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ رکھ لیے۔ اس نے ایک بار پھر خود کو محفوظ محسوس کرنا شروع کردیا تھا۔

زینب اب شہریار کو خطرہ بنتی نظر آرہی تھی۔ لہٰذا اسے مطمئن کرنے کے لیے اس نے ایک نیا جال بچھایا۔ اور ایک روز نہایت خاموشی سے ایک قاضی کا تعاون حاصل کر کے اس سے شادی کرلی۔ اس

تقریب خاص کا علم شہریار کے چند دوستوں کے سوا کسی کو نہ ہوا اور ان خاص دوستوں کے بارے میں بھی زینب بہرحال نہیں جانتی تھی کہ کون تھے۔ وہ بے وقوف لڑکی اس تمام کارروائی کو بھی بہت سمجھ کر پھولی نہیں سمارہی تھی۔ اس شادی کے دو روز کے بعد وہ اپنی ماں کے ہمراہ بازار میں خریداری کررہی تھی کہ اس نے شہریار اور کرن کو ایک ٹریول ایجنسی کے دفتر سے نکلتے دیکھا۔ کرن نے ہاتھ میں کچھ کاغذات پکڑے ہوئے تھے جنہیں وہ عجلت میں پرس کے اندر رکھ رہی تھی۔ ان کاغذات کی شکل ہوائی جہاز کے ٹکٹوں سے ملتی جلتی تھی۔ دونوں سامنے کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ کر رخصت ہوگئے۔

زینب کے دل میں شک سا پیدا ہوگیا۔ کیا شہریار ملک سے باہر جارہا ہے۔ اس نے اس بات کو چھپایا کیوں تھا۔ زینب اچانک پریشان ہوگئی۔ اس نے اپنی ماں کو وہیں رکنے کے لیے کہا اور ٹریول ایجنسی کے دفتر میں پہنچ گئی۔

''جی فرمایئے۔۔'' ایک مستعد کلرک نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا

''میں گلیکسی آئل کمپنی کے دفتر سے آئی ہوں۔ ہماری کمپنی کے ایم ڈی مسٹر شہریار بیگ یہاں آنے والے تھے۔ مم۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ لیٹ ہوگئی ہوں انہوں نے مجھے پانچ بجے یہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا۔'' وہ اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ تب ہی کلرک نے کہا۔

''آپ واقعی لیٹ ہوگئی ہیں۔ وہ ابھی ابھی یہاں سے نکل کر گئے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔ تشریف رکھیں۔ کوئی چائے یا ٹھنڈا وغیرہ پئیں گی۔۔'' کلرک نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔

''شکریہ۔ شہریار صاحب کا کام تو ہوگیا ہے نا۔۔'' زینب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہم ہوں اور کام نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' کلرک نے فخریہ لہجے میں کہا۔ زینب کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ بولی۔

''میرا خیال ہے کہ انہوں نے ٹکٹ کسی دوسری کمپنی سے بنوایا تھا۔''

''ٹکٹ بھی ہم نے ہی بنوا کر دیا تھا۔ بس سیٹ کنفرم ہونے میں دیر ہوگئی۔ پرسوں ان کی سیٹیں چانس پر تھیں اور تقریباً تقریباً کام ہوگیا تھا لیکن دو وی آئی پی کہیں سے ٹپک پڑے۔''

زینب پریشان ہوگئی۔ شہریار نے چند روز پہلے نہایت رازداری کے ساتھ اس سے شادی کی تھی اور آج وہ چوروں کی طرح ملک سے باہر جارہا تھا آخر کیوں۔ کیا اس نے کرن کو بھی اپنی شریک حیات منتخب کرلیا تھا۔''

''کیا بات ہے مس۔ آپ کچھ پریشان دکھائی دیتی ہیں۔۔'' کلرک نے کہا۔

''اوہ۔ کچھ نہیں، دراصل میں۔ میں شہریار صاحب کے ہاتھ کچھ سامان بھجوانا چاہتی تھی۔

''تو آپ ان کے گھر جاکر سامان دے آئیں۔ ان کی فلائٹ رات سوا دو بجے روانہ ہوگی۔ وہ رات کے بارہ بجے تک گھر میں ہی ہوں گے۔'' کلرک نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے۔ شکریہ۔'' زینب نے کہا اور جاتے جاتے رک گئی۔ بولی۔

''مس کرن مرتضیٰ کی سیٹ بھی کنفرم ہوگئی ہے نا۔''

''ظاہر ہے دونوں ایک ساتھ جارہے ہیں۔ دونوں کی سیٹیں ایک ساتھ ہی کنفرم ہوئی ہیں۔''

پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا منیجر اچانک کلرک کی طرف متوجہ ہوا اور اٹھ کر تیزی سے اس کے قریب آیا۔ اس نے پوچھا۔

''تم کس کے بارے میں بتارہے ہو؟''

''یہ خاتون شہریار بیگ صاحب کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔''

''اور تم انہیں کیا بتارہے ہو۔۔'' منیجر کے

چہرے پر سخت برہمی دکھائی دینے لگی۔

''میں نے صرف یہی بتایا ہے کہ شہریار بیگ صاحب کی سیٹ رات کی فلائٹ سے کنفرم ہوگئی ہے۔ دراصل یہ خاتون ان کے ہاتھ کچھ سامان بھجوانا چاہتی ہیں۔ مس میں نے غلط تو نہیں کہا۔'' اس نے زینب سے تصدیق چاہی۔

''احمق، نامعقول، گدھے تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ شہریار بیگ صاحب نے سختی سے منع کیا تھا، ان کے ٹکٹ وغیرہ کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔''

''لل۔۔۔ لیکن یہ خاتون تو۔۔۔''

زینب فوراً دفتر سے باہر نکل گئی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں اسے یقین ہوگیا کہ شہریار نے کرن سے شادی کرلی ہے اور ہنی مون منانے پورپ جارہا ہے۔ فراڈ کے بارے میں اسے وہم بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی لی، اپنی ماں کو گھر چھوڑا اور ضروری کام کے بہانے اسی ٹیکسی میں واپس ہوئی۔ نصف گھنٹے میں وہ شہریار کے اپارٹمنٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ بے چینی کے ساتھ دروازے کے سامنے ٹہلنے لگی۔ شہریار اگر اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ برباد ہوجائے گی یا اسے خودکشی کرنا پڑے گی۔ اس کے پاس شہریار سے اپنے نکاح کا کوئی دستاویزی ثبوت بھی نہیں تھا۔ جن کاغذات پر ایجاب وقبول کے بعد اس سے دستخط لیے گئے تھے وہ بھی شہریار کے پاس ہی تھے۔

اچانک اس کے کانوں میں ٹیکسی کے ہارن کی آواز آئی۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں اور اس طرح اپنے آپ کو دیکھا، جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رہی ہو۔ پھر وہ دو دو سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے پہنچی اور ٹیکسی والے کو تھانے چلنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور ٹیکسی اسٹارٹ کرتا ہوا بولا۔

''کیا بات ہے بی بی! کیا کچھ چوری ہوگیا ہے۔''

''ہاں! سب کچھ چوری ہوگیا ہے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ میں۔۔۔ میں برباد ہوگئی۔ ہوں۔'' زینب نے کہا۔ اس کے لہجے میں دیوانگی پائی جاتی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور ایک باریش و معمر شخص تھا۔ اسے زینب سے کچھ ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس نے نرمی سے کہا۔

''بیٹی! تم اکیلی پولیس کے پاس مت جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی اور مصیبت میں گرفتار ہوجاؤ۔ کسی مرد کو ساتھ لے لو۔ میں پولیس والوں کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کیا تمہارا کوئی بھائی وغیرہ نہیں ہے۔''

زینب اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولی۔

''میرا کوئی نہیں ہے۔ بھائی چھوٹا ہے، باپ اندھا ہے، ماں ضعیف ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے تنہا پولیس کے پاس نہیں جانا چاہیے تو پھر آپ میرے ساتھ چلیے۔''

بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور کا جوش ہمدردی ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ بولا۔

''مجھے ساتھ جانے میں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن۔۔۔ کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ پولیس سب سے پہلے یہ پوچھے گی کہ میرا تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے اور پھر مجھے یہ بھی پتا نہیں ہے کہ کیا چوری ہوا ہے۔ کہاں سے چوری ہوا ہے۔ اور کس نے چوری کیا ہے؟''

''آج کل کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ دوسروں کا بوجھ کوئی نہیں اٹھاتا۔ انسان تو کیا وقت بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ ہر آدمی اپنی مصیبتیں اٹھائے پھر رہا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حالات کی چکی میں پس رہا ہے۔'' زینب خود کلامی کرتی ہوئی بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی۔ آج کل یہی کچھ ہورہا ہے۔ اگر سڑک پر کوئی آدمی تڑپ رہا ہو تو لوگ آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ راستہ بدل لیتے ہیں۔ ہم تم سب ایسے ہی ہیں۔ ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ سڑک پر پڑا ہوا زخمی شخص ہمارا کوئی پیارا بھی ہوسکتا ہے۔ کبھی ہماری باری بھی آسکتی ہے۔۔۔ خدا ہمارے گناہ معاف کرے۔ بہرحال میں پھر بھی یہی مشورہ دوں گا کہ اکیلی پولیس کے پاس نہ جاؤ۔ اگر نقصان معمولی ہے

تو اسے بھول جاؤ۔ خدا اور دے دے گا۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

''نقصان معمولی نہیں ہے۔ میں بھول نہیں سکتی۔ صبر نہیں کر سکتی۔'' زینب نے جوش میں کہا۔

معمر ٹیکسی ڈرائیور چونک گیا۔ اس کی آنکھوں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ اس نے عقب نما آئینے میں زینب کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ تھانے کے سامنے پہنچ کر اس نے ٹیکسی روکی اور سخت لہجے میں بولا۔

''اترو۔ تھانہ وہ سامنے ہے۔''

زینب دروازہ کھول کر باہر آئی اور پرس میں سے کرایہ نکالنے لگی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کے ہاتھ سے پیسے لیتا ہوا بولا۔

''تمہارا باپ ہی نہیں، ماں بھی اندھی ہے۔''

یہ سن کر زینب کے دل پر چوٹ لگی۔ غصے سے بولی۔

''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا! لوگ سڑک پر تڑپنے والے کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ یاد رکھو! میری جگہ پر تمہاری بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔''

ڈرائیور نے گیئر لگایا اور ٹیکسی کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

زینب تیز قدم اٹھاتی ہوئی تھانے میں داخل ہوئی اور باہر کھڑے ہوئے سپاہیوں سے پوچھتی ہوئی ڈیوٹی آفیسر کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ایک قوی الجثہ اے ایس آئی تھا۔ زینب رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتی ہوئی بولی۔

''مم۔۔۔ میں ایک۔۔۔ ایک ارجنٹ رپورٹ درج کروانا چاہتی ہوں۔ آپ کو فوراً کچھ کرنا پڑے گا ورنہ۔۔۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔''

''تشریف رکھیں اور اطمینان سے ساری بات بتائیں۔ پہلے تو اپنا نام اور پتا لکھائیں۔'' اے ایس آئی زینب کا جائزہ لیتا ہوا بولا اور ایک رجسٹر کھول لیا۔

زینب نے اپنا نام اور پتا لکھوا دیا۔ پھر بولی۔

''آپ کتنی دیر میں کارروائی شروع کر سکتے ہیں۔''

''بی بی! بات تو پتا چلے کہ کیا ہے۔ کیا کسی پڑوسی سے تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے۔ تمہارے شوہر نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکیں گے۔ لیکن مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔''

''یہ بات تم پہلے بھی کہہ چکی ہو۔ میں اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔''

''وہ۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ شہریار۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ میرا شوہر مجھے چھوڑ کر ایک دوسری عورت کے ساتھ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ ان کی فلائٹ آج رات سوا دو بجے یہاں سے روانہ ہو گی۔ پلیز کچھ کریں۔۔۔ اسے روک لیں۔''

اے ایس آئی نے نفی میں سر ہلایا۔ اور بولا۔

''ہم کسی کو بلاوجہ باہر جانے سے نہیں روک سکتے، خواہ اس کے ساتھ غیر عورت ہو یا اپنی عورت۔ یہ کام امیگریشن والوں کا ہے۔ ایئر اوسی وغیرہ وہی دیتے ہیں۔ تمہارے شوہر کا پورا نام کیا ہے۔ اور وہ کیا کام کیا کرتا ہے۔؟''

''شہریار بیگ اس کا نام ہے۔ ایک فارن کمپنی میں مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔''

''کمپنی کا نام۔'' اے ایس آئی نوٹ کرتا ہوا بولا۔

''گلیکسی آئل کمپنی۔۔۔ گلیکسی آئل ایکسپلوریشن کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ۔''

''ہم اتنے بڑے آدمی پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ کیا تمہارا اس کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا؟''

''جھگڑا نہیں جی۔ اس نے میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ ابھی چند روز پہلے اس نے مجھ سے شادی کی تھی، لیکن اب وہ اپنی پی اے کے ساتھ چوری چھپے باہر جا رہا ہے۔ اگر میں اسے ایک۔۔۔ ایک ٹرول ایجنسی کے دفتر سے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لیتی تو مجھے بالکل پتا نہ چلتا۔''

''کیا تمہارے پاس نکاح نامہ موجود ہے۔''

اے ایس آئی سنبھل کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

''جی ہاں! کاغذی کارروائی بھی ہوئی تھی، مگر تمام کاغذات میرے شوہر کے پاس ہیں۔''

اے ایس آئی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ زینب کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ہوں۔۔۔ تو وہ آپ کے شوہر کے پاس ہے۔ خوب خوب۔۔۔ اب مزید کاغذی کارروائی تو ہم کریں گے۔ ذرا اس شخص کا پتا تو بتانا اور اس عورت کا بھی جو اس کے ساتھ جا رہی ہے۔''

زینب نے کرن مرتضیٰ کا نام اور شہریار بیگ کا پتا نوٹ کرایا۔

''کرن مرتضیٰ کا پتا میں نہیں جانتی۔ اس وقت یہ شہریار کے ساتھ ہی ہوگی۔''

''اس بنچ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور انتظار کرو۔'' اے ایس آئی اپنی نشست سے اٹھتا ہوا بولا۔ اس نے برآمدے میں ڈیوٹی دینے والے سپاہی کو آواز دے کر کہا۔

''شمس الدین! بی بی جی کا خیال رکھنا۔ چائے پانی کی ضرورت ہو تو منگوا دینا۔'' پھر وہ اس کے قریب جا کر ہولے سے بولا۔

''یہ زیر حراست ہے کہیں جانے نہ پائے۔''

شمس الدین مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا زینب کو گھورنے لگا۔ اے ایس آئی، تھانیدار کے کمرے میں چلا گیا۔

شہریار بیگ نے شیشے میں اپنا جائزہ لیا اور ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے بولا۔

''کل اس وقت ہم لندن کی فضاؤں میں سانس لے رہے ہوں گے۔''

''تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے، کسی کو ذرہ برابر شک نہیں ہوا۔ اتنی کامیاب اداکاری تم کس طرح کر لیتے ہو۔'' کرن سوٹ کیس میں کپڑے رکھتی ہوئی بولی

اس وقت دونوں اپارٹمنٹ میں سفر کی تیاری

دوست

ہمارے ٹیچر مشتاق نامی لڑکے سے بہت بیزار تھے۔ مشتاق کا کمال یہ تھا کہ اسے جو بھی مضمون لکھنے کو کہتے۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے ''میرا بہترین دوست'' ضرور فٹ کر دیتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ واحد مضمون تھا جو اس کو فر فر یاد تھا مثلاً اگر کہا جاتا کہ ریلوے اسٹیشن پر مضمون لکھو تو وہ کچھ یوں لکھتا کہ میں اور میرے ماں باپ چچیوں کی ملیاں جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن گئے۔ وہاں گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی میں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔''

اگر اسے ''میرا استاد'' مضمون لکھنے کو کہتے تو وہ لکھتا کہ ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گیا۔ وہاں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔

ظاہر ہے جب کرکٹ میچ یا پکنک کی باری آتی تو وہاں بھی زاہد حسین موجود ہوتا۔ تنگ آ کر ماسٹر صاحب نے کہا کہ دیکھو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہر جگہ تمہارا دوست زاہد حسین موجود ہو۔ آج تم ہوائی جہاز پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ ہوائی جہاز میں زاہد حسین موجود نہیں ہے۔

دوسرے دن مشتاق نے جو مضمون لکھا وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ ''میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئرپورٹ گیا۔ وہاں جہاز کھڑا تھا۔ جہاز کے دو پر تھے اس میں ہم بیٹھ گئے۔ جہاز میں زاہد حسین نہیں تھا پھر جہاز اڑنے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو زمین پر میرا بہترین دوست زاہد حسین جا رہا تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔''

ماسٹر صاحب نے مضمون پڑھ کر مولا بخش اٹھا لیا اور مشتاق غریب کا جلوس نکال دیا۔

(کتاب ''گزارہ نہیں ہوتا'' سے اقتباس)

کررہے تھے۔''

''یقین کے ساتھ۔۔۔یقین! یہ ایک لفظ تمام کامیابیوں کی کلید ہے۔انسان جو کچھ کرے پورے یقین کے ساتھ کرے۔ایک لمحے کے لیے بھی اپنی کسی بات پر شک نہ کرے۔میں جب گلیکسی آئل کمپنی کے ایم ڈی کی حیثیت میں کسی سے بات کرتا ہوں تو میرے ذہن میں کوئی تذبذب نہیں ہوتا۔میرے تصور میں واقعی ایک بہت بڑی آئل کمپنی ہوتی ہے۔جس کا کثیر المنزلہ دفتر ہالینڈ کے دارالحکومت میں موجود ہے۔کبھی کبھی میں اپنے یقین میں اتنا آگے نکل جاتا ہوں کہ خود اپنے جھوٹ کو سمجھنے میں بھی دقت محسوس کرنے لگتا ہوں۔میں کامیاب فنکار کی طرح اپنے کردار میں فنا ہوجاتا ہوں اور اپنی اصل حیثیت کو بالکل فراموش کردیتا ہوں۔'' شہریار نے کہا۔

''تم فلمی لائن میں بہت کامیاب رہتے۔''

''میں۔۔۔ہونہہ، میں ان فلمی مسخروں کو بھانڈ سمجھتا ہوں۔چند بے ہودہ حرکتوں کو فن کا نام دیتے ہیں اور بغلیں بجاتے پھرتے ہیں۔'' کرن نے قہقہہ لگایا اور بولی۔

''معلوم ہوتا ہے کسی فلمی مسخرے نے تمہیں خوب چوٹ دی ہے۔خیر چھوڑو اس بات کو، تم نے دفتر کے بارے میں کیا سوچا ہے۔''دفتر میں ایک بھی چیز اپنی نہیں ہے۔لندن جاکر سپلائروں کو ایک ایک خط لکھ دیں گے کہ دفتر سے اپنا اپنا سامان اٹھوالیں۔کمپنی دیوالیہ ہوگئی ہے۔تیل کے کنوؤں سے پانی نکل آیا ہے۔''

''اور یہ اپارٹمنٹ۔''

''اس کا تین مہینے کا کرایہ نہیں دیا بلکہ لینڈ لارڈ سے اپارٹمنٹ کی مرمت وغیرہ کے چکر میں پچیس تیس ہزار روپے وصول ہی کیے ہیں۔''

''شہریار ایک بات تو بتاؤ! اگر تم پکڑے جاتے تو کیا کرتے؟''

شہریار نے الماری کی دراز سے ایک ریوالور نکالا اس کی نال کنپٹی سے لگاتا ہوا بولا۔

''یہ کرتا۔۔۔خودکشی کرلیتا۔ختم ہوجاتا۔''

''تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ریوالور رکھ دو۔کہیں گولی نہ چل جائے۔'' کرن خوف سے آنکھیں پھیلاتی ہوئی بولی۔

شہریار نے ریوالور دراز میں رکھ دیا اور بولا۔

''جلدی سے تیار ہوجاؤ۔رات کا کھانا کھا کر ہمیں تھوڑا سا آرام بھی کرنا ہے۔ٹھیک سوا بارہ بجے گھر سے روانہ ہوجائیں گے۔''

''ابھی تو سوا چھ ہوئے ہیں۔'' کرن دستی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔

''آٹھ بجے تک واپس آجائیں گے اور دو تین گھنٹے آرام کرلیں گے۔''

اسی لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی۔کرن کا دل اچھل کر حلق میں پہنچ گیا۔گھبرا کر بولی۔

''اس وقت کون ہوسکتا ہے؟''

''ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔'' شہریار دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

اس نے دروازہ کھولا تو اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی آگئی۔باہر تین پولیس والے کھڑے تھے۔اس نے سوچا۔''کیا آخری وقت پر کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟''

''مسٹر شہریار بیگ۔'' ایک پولیس والے نے پوچھا۔وہ اے ایس آئی کی وردی میں تھا۔

شہریار بیگ ایک دم گلیکسی آئل ایکسپوریشن کا مینجنگ ڈائریکٹر بن گیا۔

''یس۔کیا بات ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں اے ایس آئی بشیر احمد ہوں۔آپ کو چند منٹ کے لیے تھانے چلنا پڑے گا۔''

''فار واٹ۔آر یو ٹیلنگ می ریٹ آئی ایم انڈر ارریسٹ۔'' شہریار نے سخت لہجے میں کہا۔

اے ایس آئی بشیر احمد اس کے پر اعتماد لہجے سے مرعوب ہوگیا۔بولا۔

''نہیں سر، ایسی کوئی بات نہیں۔ایک چھوٹے

سے معاملے میں آپ کی گواہی کی ضرورت ہے۔
انچارج صاحب نے آپ کو چند منٹ کے لیے بلایا ہے۔ میرے پاس جیپ حاضر ہے۔ میں آپ کو جیپ میں واپس چھوڑ جاؤں گا۔''

''سوری۔ میں کسی مقدمے میں گواہ نہیں بننا چاہتا۔ میں ایک اہم کاروباری اجلاس میں شرکت کے لیے لندن جارہا ہوں۔ معاملہ کیا ہے۔'' شہریار نے کہا۔

بشیر احمد، شہریار کو ایک طرف لے گیا اور راز دارانہ لہجے میں بولا۔

''سر ایک پاگل سی لڑکی تھانے میں بیٹھی ہے اور کہتی ہے کہ وہ آپ کی بیوی ہے۔'' شہریار نے بھویں سکیڑ کر سوچا پھر بولا۔

''کیا نام بتایا ہے اس نے؟''

''غالباً زینب عثمان بتایا ہے۔''

شہریار بیگ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

''اوہ مس زینب! بے چاری مینٹل کیس ہے۔ ہمارے دفتر میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ زبردستی میرے گلے پڑنے کی کوشش کررہی ہے۔ تم ایسا کرو اسے اس کے گھر چھوڑ آؤ۔'' اس نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور اے ایس آئی کی مٹھی میں دیتا ہوا بولا۔ اے ایس آئی ہاتھ پیچھے کرتا ہوا بولا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہے سر، آپ ہی کا دیا کھاتے ہیں۔ اگر آپ میرے ساتھ نہ گئے تو انچارج صاحب کو شک ہوجائے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تھانے میں آکر آپ کی روانگی رکوادیں۔''

شہریار نے سوچا کہ اے ایس آئی نے غلط مشورہ نہیں دیا۔ اگر وہ نہ گیا تو بات بڑھ سکتی ہے۔ تھانے کے اندر جاکر کرن سے مشورہ کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ تھانے میں جاکر بات ختم کردینا ہی بہتر ہے۔ کرن بھی اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن اس نے منع کردیا اور پولیس کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ کرن کے جانے کے دو منٹ بعد ایک سپاہی کرن کے پاس آیا اور کہا کہ شہریار صاحب نے اسے بھی بلایا ہے۔ کرن نے سوچا، شاید نیچے جاکر شہریار کا خیال بدل گیا ہو۔ لہٰذا اس نے اپارٹمنٹ کو تالا لگایا اور سپاہی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ نیچے گلی میں جیپ کے بجائے ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ سپاہی نے کرن کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

شہریار نے تھانے میں قدم رکھا ہی تھا کہ کرن بھی وہاں پہنچ گئی۔ شہریار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اوہ۔۔۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔''

''اسے میں نے بلایا ہے۔۔۔ اس کی گواہی کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

اس کا لہجہ پہلے جیسا عاجزانہ نہیں تھا۔ وہ دونوں کو سیدھا انچارج کے کمرے میں لے گیا۔ زینب پہلے سے وہاں موجود تھی۔ اس کے بال پریشان اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تھانے کے انچارج کا نام مبشر نیازی تھا۔

رسمی کلمات کے بعد شہریار نے کہا۔

''مبشر صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں مس زینب کے ساتھ علیحدگی میں چند باتیں کرلوں۔ دراصل ہمارے درمیان کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔''

''غلط فہمیاں دور کرنا ہمارا کام ہے مسٹر شہریار۔ پہلے تو یہ پتا چلے کہ غلط فہمیوں کی نوعیت کیا ہے۔'' انچارج نے کہا۔ پھر وہ زینب کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''مس زینب! کیا تم اس شخص کو پہچانتی ہو اور اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔''

''ایک منٹ پلیز! آپ کا انداز گفتگو ہتک آمیز ہے۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ میں ایک فارن کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں اور وزیروں کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ آپ کس اتھارٹی کی بنیاد پر یہ انکوائری کررہے ہیں۔'' شہریار نے کہا۔

انچارج نے اپنی میز سے ایک کاغذ اٹھا کر شہریار کو دکھایا۔ اور بولا

''ہمارے پاس اس خاتون کا ایک تحریری بیان

موجود ہے۔ اس نے تم پر جو الزامات عائد کیے ہیں وہ سنگین نوعیت کے ہیں۔ مس زینب! میرے سوال کا جواب دو۔''

''میں ان صاحب کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ ان کا نام شہریار بیگ ہے۔ میں ان کی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ انہوں نے چند روز پہلے ہی مجھ سے شادی کی اور اب یہ اس عورت کے ساتھ چوری چھپے ملک سے باہر جارہے ہیں۔'' زینب نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ یہ لڑکی ہمارے دفتر میں ضرور کام کرتی ہے لیکن میں نے اس کے ساتھ شادی ہرگز نہیں کی۔ میں اس معمولی لڑکی کے ساتھ کیسے شادی کرسکتا ہوں ہونہہ! کیا میرے حصے میں ایک اندھے ویلڈر کی لڑکی رہ گئی تھی۔'' شہریار نے کہا۔

زینب چیخنے لگی۔ انچارج نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ کرن کو برآمدے میں انتظار کرنے کے لیے کہا اور شہریار کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

''بات یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ آج رات میں ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کے لیے لندن جارہا ہوں۔ میں اس معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا۔ غالباً یہ لڑکی مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کے ذریعے اسے کچھ رقم دے سکتا ہوں۔''

''مسٹر شہریار! یہ ایک اہم کیس بن چکا ہے۔ فی الحال تم اور یہ لڑکی زیرِ حراست ہو۔ اس میں باہمی سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' انچارج آنکھیں نکالتا ہوا بولا۔

''اگر زینب سے سمجھوتا نہیں ہوسکتا تو آپ کے ساتھ تو ہوسکتا ہے۔'' شہریار نے پہلی بار کچھ گھبراہٹ محسوس کی۔

''آپ کی کمپنی کیا کام کرتی ہے۔'' تھانیدار اس کی بات کو نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

''ہمارا بنیادی کام تیل کی تلاش ہے۔'' شہریار تامل کرتا ہوا بولا۔

''کیا یہ پبلک لمیٹڈ کمپنی ہے یا پرائیویٹ لمیٹڈ۔''

''درحقیقت یہ فارن کمپنی ہے لیکن آپ اسے پرائیویٹ کمپنی کہہ سکتے ہیں۔''

''پاکستانی پارٹیوں نے اس میں کتنا سرمایہ لگایا ہے؟''

شہریار کے تیز ذہن نے فوراً یہ اندازہ لگالیا کہ زینب نے کمپنی کے بارے میں کچھ باتیں ان لوگوں کو بتائی ہیں۔ لہٰذا کسی بات کو چھپانے میں مصلحت نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

''چند لوگوں نے کچھ رقم لگائی ہے۔ لیکن ہمیں ابھی اپنے پرنسپلز کی منظوری کا انتظار ہے۔''

''کیا تم نے اس کمپنی کو رجسٹرار جوائنٹ اسٹاک کمپنیز کے پاس رجسٹر کرایا ہے۔'' تھانیدار آگے جھکتا ہوا بولا۔

یہ ایک ایسا سوال تھا جو کوئی باخبر انسان ہی کرسکتا تھا۔ شہریار اس سوال سے بچنے کے لیے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اس معاملے کا کمپنی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔ کمپنی کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے چند افراد سے کروڑوں روپے کا فنڈ اکٹھا کیا ہے۔ حالانکہ کوئی کمپنی رجسٹرار جوائنٹ اسٹاک کمپنیز کے پاس رجسٹر ہوئے بغیر تو نہ اپنے نام کے ساتھ لمیٹڈ لگاسکتی ہے اور نہ ہی کاروبار کے لیے فنڈ اکٹھا کرسکتی ہے۔'' انچارج نے کہا۔

''انچارج صاحب! یہ تو محض ایک رسمی کارروائی ہے جسے ہم کسی وقت بھی مکمل کرسکتے ہیں۔ میں دراصل انتظامی معاملات میں الجھے رہنے کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکا۔''

''کیا تم نے اپنے پرنسپلز کی اجازت سے یہ فنڈ اکٹھا کیا ہے۔'' انسپکٹر مبشر نیازی سر ہلاتا ہوا بولا۔

شہریار کا یقین متزلزل ہوتا جارہا تھا۔ وہ بولا۔

''مالک کی اجازت کے بغیر کوئی شخص ایک قدم بھی نہیں اٹھاسکتا۔''

''تم نے جن لوگوں سے فنڈ اکٹھا کیا ہے، ان کے نام اور پتے کیا ہیں؟''

شہریار نے جیب سے رومال نکالا اور پیشانی صاف کرتا ہوا بولا۔

''ان چیزوں کا سارا ریکارڈ تو دفتر میں ہوگا لیکن دیکھیں آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ میں آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔''

''ابھی خدمت کا وقت نہیں آیا۔'' انسپکٹر نے کہا اور گھنٹی بجا کر اے ایس آئی کو اندر بلایا۔

''بشیر احمد! جیپ تیار کرو۔ میں شہریار کا دفتر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مبشر نیازی صاحب! آپ میری بات تو سنیں۔'' شہریار انسپکٹر کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

''میں تمہارے پرنسپلز کا وہ لیٹر دیکھنا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے تمہیں فنڈ اکٹھا کرنے کی اجازت دی ہے۔'' انچارج نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

شہریار بیگ کی ساری خود اعتمادی جاتی رہی۔ اسے ہر طرف تباہی ہی تباہی دکھائی دینے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ زینب کا گلا گھونٹ دے۔ اس دو ٹکے کی چھوکری کی وجہ سے اس کا بہترین منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ جب وہ انچارج کے ہمراہ باہر نکلا تو زینب سپاہی کے ساتھ جھگڑا کرتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ اس نے کہا۔

''انچارج صاحب! آپ کے آدمی مجھ سے بلاوجہ کی پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ مم۔۔۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ لوگ مجھے اجازت نہیں دے رہے یہ۔۔ یہ کیسا اندھیر ہے یہاں رپورٹ آپ نے لکھ لی ہے۔ اب مجھے کیوں روک رہے ہیں۔''

''مس زینب! تم زیر حراست ہو۔ تم نے جو الزام شہریار پر لگایا ہے، اب وہ یک طرفہ نہیں رہا۔'' انچارج نے کہا۔

''مم۔۔۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''مطلب اب کوئی وکیل ہی سمجھائے گا۔ اب تم آرام سے بیٹھو۔ صبح تم دونوں کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد مزید تفتیش ہوگی۔'' انچارج نے کہا اور اس کے بعد شہریار اور کرن کو ساتھ لیا اور جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

ادھر زینب کو نے سوچا۔ کاش! وہ ٹیکسی ڈرائیور کی بات مان لیتی اور پولیس اسٹیشن کا رخ نہ کرتی۔ صبح ملک کے اخباروں میں اس کیس کا چرچا ہوگا۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے۔

''مجھ پر ایک مہربانی کرو۔ مجھے نیند کی گولیوں کی ایک شیشی منگوا دو۔'' وہ پرس سے پیسے نکالنے لگی۔

''معافی، معافی۔۔۔ مجھے تین سو میں بند ہونے کا شوق نہیں ہے۔ ایک تھانے میں ایسا کیس ہو چکا ہے۔ سپاہی نے مہربانی کرتے ہوئے گولیوں کی شیشی منگوا دی اور حوالاتی ساری گولیاں حلق سے نیچے اتار کر جہنم میں چلا گیا۔ بی بی! جو کچھ کیا ہے اسے بھگتنا تو پڑے گا۔''

''میرے اندر ہمت نہیں ہے۔۔۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں اس ظلم کو برداشت نہیں سکوں گی۔'' زینب نے التجا کی۔

''اب تو جی، اللہ ہی رحم کرے گا۔ آپ کو یہ سب پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا۔'' سپاہی نے کہا۔

زینب بینچ پر بیٹھ کر کپکپانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد سادہ لباس ملبوس ایک شخص اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔

''مصیبت میں پھنس گئی ہو۔'' زینب نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''میرا ایک کام کردو۔ مجھے نیند کی گولیوں کی ایک شیشی لا دو، لیکن کسی کو پتا نہ چلے۔''

''جان بچانے کے لیے کتنے پیسے خرچ کر سکتی ہو۔'' سادہ لباس میں ملبوس شخص نے بظاہر بے پروائی سے پوچھا۔

''تم بتاؤ۔'' زینب نے پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''دو لاکھ۔''

''میرے پاس تو دو ہزار بھی نہیں ہوں گے۔''

''تو پھر چند روز ٹھہر جاؤ۔ ضمانت ہونے کے بعد نیند کی گولیاں خرید لینا۔''

زینب کو اچانک یاد آیا کہ کرن نے اس کے پاس لوگوں کے دیے گئے کچھ بانڈز اور سیونگ سرٹیفکیٹ رکھوائے تھے وہ ابھی تک اس کے پاس ہی رکھے تھے۔ وہ بھی بھول گئی تھی اور غالباً کرن بھی بھول گئی تھی۔''

''سنو! میں ایک لاکھ روپے کا انتظام کرلوں گی۔'' اس نے سادہ لباس شخص سے کہا۔ تو وہ بولا۔

''کب تک؟''

''کل ایک بجے تک۔''

''پکی بات ہے؟''

''ہاں بالکل پکی بات ہے۔''

''تو آؤ، میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔''

زینب نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں اور اٹھ کر سادہ لباس شخص کے ساتھ چل پڑی۔ کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ سادہ لباس شخص نے اسے ٹیکسی میں اس کے گھر پہنچا دیا اور یہ تاکید کردی کہ وہ کل رقم تیار رکھے اور کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی زینب کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردے لیکن اس نے اپنے جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دیا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے بستر پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

رات کے دس بجے شہباز شیخ اور فہمیدہ بیگم اپنے جی ٹائپ کوارٹر میں بیٹھے خواب دیکھ رہے تھے۔ فہمیدہ بیگم کہہ رہی تھی۔

''پہلے سال ہم سوئٹزرلینڈ اور مصر کی سیر کریں گے۔ میں نے سنا ہے کہ مصر پراسرار اور سوئٹزرلینڈ خوب صورت ملک ہے۔''

''کبھی کبھی تم بونگی بات کرجاتی ہو۔ سوئٹزرلینڈ یورپ میں ہے اور مصر افریقہ میں ہے۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں۔ مصر میں ایک ہی معقول شہر ہے اور وہ ہے قاہرہ اور قاہرہ اور لاہور میں صرف شکلوں اور زبان کا فرق ہے۔ اگر لاہور کے باشندوں کو قاہرہ میں اور قاہرہ کے باشندوں کو لاہور میں چھوڑ دیا جائے تو لاہور قاہرہ اور قاہرہ لاہور بن جائے۔''

''تم ایسی بات کررہے ہو جیسے کوئی چوہے چھوڑنے کی بات کرتا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، میں نے سوئٹزرلینڈ تو ضرور ہی دیکھنا ہے۔'' فہمیدہ بیگم نے کہا۔

اسی لمحے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے بھئی۔'' شہباز شیخ نے آواز لگائی۔

''ارے وہ ہوگی کاشف کی ماں۔ پتی یا چینی لینے آئی ہوگی۔'' فہمیدہ بیگم نے کہا۔

شہباز شیخ نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پولیس انسپکٹر کو کھڑے دیکھا پیچھے پولیس کی ایک جیپ بھی کھڑی تھی۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس کے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر سرایت کرگئی۔ اس کے ذہن میں ان گنت وسوسے جنم لینے لگے۔ کسی نے اس کی رپورٹ کردی تھی۔ یا کوئی ایسا کیس پکڑا گیا تھا جسے اس نے رشوت لے کر چھوڑ دیا تھا۔

''میں شہباز شیخ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا اور اپنا تعارف کرایا۔

''میں ہی شہباز شیخ ہوں۔''

''مسٹر شہباز شیخ تمہیں چند منٹ کے لیے پولیس اسٹیشن تک چلنا پڑے گا۔ ہم نے فراڈ کا ایک کیس پکڑا ہے جس میں تمہاری گواہی کی ضرورت ہے۔'' انسپکٹر نے رعب دار آواز میں کہا۔

''مم۔۔۔ میری گواہی!'' شہباز شیخ کی زبان لڑکھڑائی۔

اندر اس کی بیوی اور بیٹی علیزہ دروازے کے ساتھ لگ کر باتیں سننے لگیں۔ کاشان باہر آگیا۔

''ہم نے ایک بہت بڑے جعلساز کو گرفتار کیا ہے۔ شہریار بیگ اس کا نام ہے اس نے ایک جعلی آئل کمپنی کے نام پر مختلف لوگوں سے بڑی بڑی

رقمیں بٹوری ہیں۔ ان لوگوں میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ یہ شخص آج رات ملک سے فرار ہونے والا تھا، لیکن ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے پکڑا گیا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

اس خبر سے فہمیدہ بیگم سکتے میں آ گئی اور گر کر بے ہوش ہو گئی۔

پولیس شہباز شیخ کو جیپ میں بٹھا کر تھانے لے گئی اور سرسری بیان لینے کے بعد اسے حوالات میں بند کر دیا اس نے شہریار کی طرف ایک جھلک دیکھی۔ وہ ایک دہشت زدہ اور مایوس انسان دکھائی دیتا تھا۔

شہباز شیخ ساری رات حوالات میں شہریار کی دردناک چیخوں کی آواز سنتا رہا اور حوالات کی میلی چکٹ دری پر بیٹھا کانپتا رہا۔ صبح پولیس نے اسے شہریار اور کرن کے ہمراہ عدالت میں پیش کیا اور سات دن کا ریمانڈ لے لیا۔ جعلسازی کی خبر چھپنے کے ساتھ ہی تھانے میں شہریار کے خلاف رپورٹ درج کرانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

ادھر زینب علی الصبح دفتر پہنچی۔ گھبرائے ہوئے چپراسی کو دفتر کھولنے کے لیے کہا۔ تجوری سے پرائز بانڈ اور سیونگ سرٹیفکیٹ نکال کر تھیلے میں ڈالے اور چپراسی کو الٹی سیدھی ہدایات دینے کے بعد رخصت ہو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے کے اندر اس نے مختلف بینکوں سے ڈھائی لاکھ روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹ کیش کرائے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئی۔ ٹھیک ایک بجے رات والا سادہ لباس شخص اس کے گھر پہنچا اور رقم کا مطالبہ کیا۔ زینب نے رومال میں لپٹے ہوئے دو لاکھ روپے لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اس نے تحریف گڈیوں کو گنا اور انہیں دوبارہ رومال میں لپیٹ کر جانے سے پہلے اس نے زینب کے ذہن سے ہر احساس جرم کو ہلکا کر دیا جو پرائز بانڈ وغیرہ چرانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس نے سوچا چوروں کا مال چوری کرنا کوئی جرم نہیں۔

فہمیدہ بیگم تین روز اسپتال میں گزارنے کے بعد گھر آئی تو برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اور وہ اپنی عمر سے دس سال بڑی لگنے لگی تھی۔ علیزہ اور کاشان بھی اجڑے اجڑے سے دکھائی دیتے تھے۔ بنگلا گیا، دولت گئی اور دولت کمانے والا گیا۔ ان کے چہروں کی سرخی یوں اڑ گئی تھی جیسے دھوپ میں کاغذ کے پھولوں کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ وہ ویران نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور بولنے سے پہلے ہی چپ ہو جاتے۔ ان کا باپ شہباز شیخ ایک دن بھی پولیس کے دباؤ کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس بات کا اقرار کر لیا کہ شہریار بیگ کی جعلی کمپنی میں اس نے جو رقم لگائی تھی، وہ سب رشوت کی کمائی تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی اس کا محکمہ بھی حرکت میں آ گیا۔ انہوں نے اسے معطل کر دیا۔ اس کے واجبات روک لیے اور اس کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی شروع کر دی۔

پولیس اپنی پوری کوشش کے باوجود شہریار سے یہ معلوم کرنے میں ناکام رہی تھی کہ اس نے دولت کہاں چھپائی تھی۔ کرن کے ذریعے انہیں معلوم ہوا کہ شہریار نے مختلف لوگوں سے کروڑوں روپے بٹورے تھے۔ اس میں سے آدھے اس نے ناجائز ذریعے سے ملک سے باہر بھجوا دیئے تھے اور باقی کہیں ملک کے اندر ہی تھے۔ پولیس کو اور معاملات سے زیادہ ان آدھے پیسوں کی فکر تھی۔ جب وہ شہریار پر تمام حربے آزما چکے تو انہوں نے کرن کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

تھانے کے انچارج مبشر نیازی نے کرن کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔

''اگر تم پسند کرو تو ہم تمہیں وعدہ معافی گواہ بنا سکتے ہیں لیکن تمہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔''

''میں ہر طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔'' کرن نے فوراً ہامی بھر لی۔

''جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ شہریار نے ابھی

تک ان آدھے پیسوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ ہم نے ہر ممکن طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ تم اگر یہ بات معلوم کرلو ہم تمہیں وعدہ معاف گواہ بنالیں گے اور فوراً ضمانت پر رہا کردیں گے۔'' انچارج نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔ آپ مجھے موقع دیں۔'' کرن نے کہا۔

''ایک بات یاد رکھو! تمہیں نہایت ہوشیاری سے کام کرنا پڑے گا۔ شہریار بہت ذہین آدمی ہے۔ اسے شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم پولیس کے ساتھ مل گئی ہو۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ مجھے بھی اداکاری کرنا آتی ہے۔''

اس شام پولیس نے کرن اور شہریار کو ایک ساتھ بند کردیا۔ اس سے پہلے دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ اجازت کرن کے وکیل کی درخواست پر عدالت کے حکم پر دی گئی ہے۔

شہریار بیگ کی شیو بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، جسم پر تشدد کے نشانات اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کرن مرتضیٰ کا حلیہ بھی کم خراب نہیں تھا۔

''شہریار! تم نے مجھے بھی اپنے ساتھ برباد کردیا ہے۔ اتنے ذہین ہونے کے باوجود تم دو ٹکے کی چھوکری کے ہاتھوں بے وقوف بنتے رہے۔'' اس نے سخت شکایتی لہجے میں کہا۔

''ساری بات قسمت کی ہے۔ بربادی کے لیے معمولی بہانہ کافی ہوتا ہے۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم چھوٹ جاؤ گی۔ میں تمہیں بچنے کا طریقہ بتادوں گا۔'' شہریار تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''اور تم۔۔۔؟''

''میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ ناکامی میری موت ہے۔''

''ضمانت کب ہوگی ہماری؟''

''شاید اگلے ہفتے تمہاری ضمانت ہوجائے لیکن میری ضمانت مشکل ہے۔ میں اسٹریچر پر ہی باہر جاؤں گا۔''

''کیا مطلب۔۔۔'' کرن گھبرا کر بولی۔

شہریار کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر بولا۔

''خودکشی۔۔۔''

کرن اسے کچھ دیر تک سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر ہولے سے بولی۔

''شہریار! کیا تم مجھے اس رقم کے بارے میں نہیں بتاؤ گے جو تم نے ابھی تک باہر نہیں بھیجی۔''

''رقم کا تمہیں کیوں خیال آیا۔۔۔'' شہریار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ کرن اپنی آواز مزید دھیمی کرتی ہوئے بولی۔

''دیکھو شہریار! میں ایک حقیقت پسند عورت ہوں۔ جب میں تمہارے ساتھ شامل ہوئی تھی تو میں نے ہر اچھے برے حالات کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر میں سزا سے بچ گئی تو مجھے زندہ رہنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر یہ رقم تمہارے کام نہیں آسکتی تو کم از کم میرے کام آنی چاہیے۔''

''فی الحال، انتظار کرو۔'' شہریار نے جواب دیا۔

تین روز بعد ایک اے ایس آئی نے کرن کو اطلاع دی کہ اس کی ضمانت ہوگئی ہے۔ اسے تھوڑی دیر بعد رہا کردیا جائے گا۔ اس وقت وہ اور شہریار ایک ہی حوالات میں بند تھے۔

''کیا تم اب بھی رقم کے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔۔۔'' کرن نے شہریار سے کہا۔

''ایک شرط پر، تم کسی طرح وہ ریوالور مجھے لاکر دے دو جو میرے اپارٹمنٹ کے اندر الماری

میں رکھا ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ رقم کس لاکر میں ہے اور اس کی چابی کہاں ہے۔ ریوالور بہت ہوشیاری سے لانا، کسی بسکٹ کے ڈبے یا کھانے میں چھپا کر۔'' شہریار نے ہولے سے کہا۔

کرن نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

کچھ دیر بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ اس نے انچارج کو ریوالور وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ اتنا کہا کہ شہریار نے اسے چند روز انتظار کے لیے کہا ہے۔ درحقیقت اس کی نیت خراب ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ شہریار نے خودکشی کر لی تو رقم کی بات گول کر جائے گی۔ پولیس سے یہی کہے گی کہ شہریار نے اسے رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

دو روز بعد وہ شہریار کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور سگریٹ وغیرہ لے کر گئی۔ ان چیزوں میں بسکٹوں کا ایک ڈبہ بھی تھا۔ جسے اس نے صفائی کے ساتھ کھول کر اور اندر ریوالور رکھنے کے بعد دوبارہ پیک کر دیا تھا۔ پولیس چونکہ اسے اپنا آلہ کار سمجھ رہی تھی، اس لیے انہوں نے ان چیزوں کو سرسری معائنے کے بعد واپس کر دیا۔ بلکہ اس دوران میں حوالات کے سامنے پہرہ دینے والا سپاہی بھی انچارج کی ہدایت پر ایک طرف چلا گیا۔ کرن حوالات کے سامنے بیٹھ گئی اور جملہ اشیا سلاخوں سے شہریار کو تھما دیں۔

''تمہاری چیز بسکٹوں کے ڈبے میں ہے۔ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔'' کرن نے ہولے سے کہا۔

شہریار نے بسکٹوں کا ڈبہ اپنے گھٹنے کے نیچے رکھا اور ارد گرد دیکھتے ہوئے ریوالور نکال لیا۔ اگلے چند سیکنڈ میں جو کچھ ہوا کرن کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

شہریار نے نہایت تیزی سے ریوالور بلند کیا، کرن کے دل کا نشانہ لیا اور یہ کہتے ہوئے فائر کر دیا۔

''ذلیل عورت! تم پولیس کے ساتھ ملی ہوئی

غلطی

ایک دکان دار اپنی دکان کے لئے بورڈ لکھوانے کے لئے ایک پینٹر کے پاس گیا اور اس نے بورڈ پر یہ لکھنے کو کہا۔

''یہاں بھینس کا خالص کا دودھ ملتا ہے اور سائیکل کی مرمت ہوتی ہے۔''

پینٹر کا دھیان کسی اور طرف تھا اس نے یہ لکھ دیا۔

''یہاں سائیکل کا خالص دودھ ملتا ہے اور بھینس کی مرمت ہوتی ہے۔''

شادی

میاں بیوی میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ بیوی نے شوہر پر بگڑتے ہوئے کہا۔ ''تم سے بہتر تھا میں کسی گدھے سے شادی کر لیتی۔''

''یہ ممکن تھا۔'' شوہر نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''رشتے داروں میں شادی کرنا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔''

دیوانہ

ایک صاحب نے نیا ملازم رکھا لیکن وہ ملازم اسے بہت پریشان کرتا تھا، ایک دن اس نے ملازم کو کوئی حکم دیا، لیکن ملازم نے کوئی پروانہ کی۔ صاحب آگ بگولہ ہو کر بولے۔

''یا تو تم بے وقوف ہو، دیوانے ہو..... یا پھر میں ہوں۔''

ملازم (اطمینان سے): ''میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر میں بے وقوف یا دیوانہ ہوتا تو پھر آپ مجھے ملازم نہ رکھتے۔''

شور

استاد (احمر سے): ''جماعت میں کون شور کر رہا ہے؟''

احمر: ''معلوم نہیں جناب، میں تو اپنی باتوں میں لگا ہوں۔''

ہو۔''

گولی کرن کے دل پر لگی اور چند لمحوں کے اندر اس نے دم توڑ دیا۔

تھانے میں بھگدڑ مچ گئی، مسلح محافظ نے کندھے سے رائفل اتار لی اور شہریار کو ریوالور پھینکنے کا حکم دیا۔ لیکن جو شخص اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہو اسے رائفل یا توپ سے کیا خطرہ۔ شہریار نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی کے ساتھ لگائی اور لبلبی دبادی۔

اس سانحے کے بعد تھانے کے عملے کے خلاف جو کارروائی ہوئی وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن جو نیا عملہ تھانے میں متعین کیا گیا، اس نے تفتیش کا سارا رخ شہباز شیخ کی طرف موڑ دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہباز شیخ درحقیقت شہریار کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اور فراڈ کے منصوبے میں شامل تھا۔

اس پر تین سال تک کیس چلا۔ گو استغاثہ جرم ثابت نہ کرسکا۔ لیکن یہ تین سال شہباز شیخ اور اس کے اہل خانہ پر بہت بھاری گزرے ان کا گلشن والا مکان فروخت ہوا۔ سارا زیور فروخت ہوا، گھر کا قیمتی سامان فروخت ہوا، سارا جمع جتھا خرچ ہوگیا اور نوبت فاقوں تک آ پہنچی۔

عدالت نے اسے باعزت بری کردیا۔ اس فیصلے کے بعد اس کے محکمے نے بھی اس پر کرم کی نظر کی اور اس کا فنڈ اور واجبات ادا کردیئے لیکن اسٹیٹ آفس اس پر کوئی نرمی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ انہوں نے اسے دو مہینے کے اندر کوارٹر خالی کرنے کا حکم دے دیا۔

شہباز شیخ کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ سر چھپانے کا تھا۔ لہٰذا فنڈ کی رقم ہاتھ آتے ہی اس نے ایک نواحی علاقے میں ایک سو بیس گز کا ایک پلاٹ خریدا اور اس پر سستے سے دو کمرے تعمیر کروالیے۔

چند روز بعد انہوں نے کوارٹر خالی کردیا اور مختصر سے سامان کے ساتھ اپنے ایک سو بیس گز کے مکان میں منتقل ہوگئے۔ مکان کا معائنہ کرنے کے دوران وہ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ بالآخر کا شان کو سکوت توڑنا پڑا۔

''اس مکان میں ایک خوبی ہے۔ یہاں نہ تو آلودگی ہے اور نہ ہی ٹریفک کا شور۔'' اس نے کہا۔

''اور خاصا روشن بھی ہے۔'' علیزہ اس تبصرے سے حوصلہ پا کر بولی۔

''ہوا تو یہاں فرفر آتی ہے۔ پنکھا چلانے کی بھی ضرورت نہیں۔'' فہمیدہ بیگم بولی۔ شہباز شیخ نے جیل کے دنوں میں داڑھی رکھ لی تھی اور پھر منڈائی نہیں تھی۔ وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

''سب سے اچھی بات اس مکان میں یہ ہے کہ یہاں ہمیں کوئی زائد خرچہ نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہاں ہم پنشن میں بھی گزارا کرسکتے ہیں۔''

فہمیدہ بیگم فرش پر دری بچھا کر بیٹھ گئی اور بولی۔

''اللہ کتنا سکون ہے یہاں پر۔ سب قریب قریب معلوم ہوتے ہیں۔ بنگلے تو بالکل بکواس ہوتے ہیں۔ بھاں بھاں کرتے ہوئے کمرے، پتا نہیں چلتا کہ کون کہاں ہے، کس کونے میں چھپا ہوا ہے۔''

''اور صفائی کرتے کرتے دم نکل جاتا ہے۔'' علیزہ ماں کی تائید کرتی ہوئی بولی۔

شہباز شیخ نے دوسرے کمرے سے آواز لگائی۔

''علیزہ کی ماں! ذرا جائے نماز تو نکال دینا۔ میں نماز پڑھ لوں۔''

''نماز تو میں نے بھی پڑھنی ہے۔'' علیزہ کی ماں اٹھتی ہوئی بولی۔